MAUR201CCT

دکنی ادب

ایم۔اے۔اردو

(دوسرا سمسٹر)

پانچواں پرچہ

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔500032، تلنگانہ، بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course : Daccani Adab

ISBN: 978-93-95203-44-9

First Edition: December, 2022

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	June, 2023
Copies	:	7000
Price	:	230/- (The price of the book is included in admission fee of distance mode students.)
Copy Editing	:	Dr. Md. Nehal Afroz, DDE, MANUU, Hyderabad
Title Page	:	Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Karshak Art Printers, Hyderabad

Daccani Adab

Paper V

For M. A. Urdu 2nd semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), Bharat

Director: dir.dde@manuu.edu.in **Publication:** ddepublication@manuu.edu.in

Phone: 040-23008314 **Website:** manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission from the publisher (registrar@manuu.edu.in)

مدیر و پروگرام کوآرڈی نیٹر

پروفیسر نکہت جہاں

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مجلسِ اِدارت

پروفیسر نکہت جہاں
(پروفیسر اردو)
نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس
سابق صدر، شعبۂ اردو
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر ارشاد احمد
اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)
نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

ڈاکٹر محمد نہال افروز
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد اکمل خان
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد جعفر
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

کورس کوآرڈی نیٹر

پروفیسر نکہت جہاں، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر احمد، پی۔ جی۔ ٹی، مانو ماڈل اسکول، فلک نما، حیدرآباد	اکائی 1
پروفیسر یوسف سرمست، (سبکدوش)، شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد	اکائی 2, 4
ڈاکٹر نشاط احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 3
پروفیسر محمد علی اثر (سبکدوش)، شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد	اکائی 5, 7
پروفیسر محمد نسیم الدین فریس، سابق صدر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 6, 15
ڈاکٹر حکیم رئیس فاطمہ، حیدرآباد	اکائی 8
ڈاکٹر بدر سلطانہ (گیسٹ فیکلٹی) شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 9
پروفیسر محمد علی اثر (سبکدوش)، شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد /	
پروفیسر نکہت جہاں، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 10, 11
پروفیسر فاطمہ پروین (سبکدوش)، شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد /	
پروفیسر نکہت جہاں، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 12
ڈاکٹر محمد اکمل خان، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 13
پروفیسر فضل اللہ مکرم، صدر شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 14
ڈاکٹر محمد نہال افروز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 16

فہرست

پیغام		وائس چانسلر	07
پیغام		ڈائرکٹر	08
کورس کا تعارف		کورس کوآرڈی نیٹر	09
بلاک I		**دکنی زبان**	
اکائی	1۔	دکنی زبان کا آغاز وارتقا (تاریخی پس منظر صوفیائے کرام کی خدمات)	11
اکائی	2۔	دکنی زبان کی لسانی خصوصیات (صوتی، صرفی، نحوی)	25
اکائی	3۔	دکنی شاعری کی خصوصیات	42
اکائی	4۔	بہمنی سلطنت کا قیام (دکنی شاعری کا آغاز)	68
بلاک II		**دکنی ادب کا ارتقا**	
اکائی	5۔	قطب شاہی دور میں دکنی شعر وادب کا ارتقا	84
اکائی	6۔	عادل شاہی دور میں دکنی شعر وادب کا ارتقا	98
اکائی	7۔	مغل دور میں دکنی ادب۔ ولی اور معاصرین ولی	117
اکائی	8۔	مابعد دکنی ادب	135
بلاک III		**دکنی شاعری کا مطالعہ**	
اکائی	9۔	مثنوی گلشن عشق (نصرتی کا تعارف اور مثنوی نگاری کی خصوصیات)	156
		اول دور میں یک بلند تخت تھا تا کہ جس کام کو نیں سمجھا سو نانو	
		جسے ملک شاہی کرا تخت تھا دکھایا وہ دیسے کی صورت کا ٹھانو	
اکائی	10۔	سلطان محمد قلی قطب شاہ کی غزل گوئی (شاعر کا تعارف)	179
		دو منتخبہ غزلیں ☆ دلا منگ خدا کن کہ خدا کا کام دوے گا	
		☆ خبر لیا ہے ہد ہد میرے تیئں اس یار جانی کی	

اکائی	11۔	غواصی کی غزل گوئی (شاعر کا تعارف)	193
		دو منتخبہ غزلیں ☆ پلا مُد مست اے ساقی کہ منج عادت ہے پینے کا	
		☆ ہمن عاشق دیوانیاں کوں، چھبیلے کسوتاں کیا کام	
اکائی	12۔	ولی کی غزل گوئی (شاعر کا تعارف)	207
		دو منتخبہ غزلیں ☆ تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا	
		☆ دو صنم جب سوں بسا دیدہ، حیران میں آ	
اکائی	13۔	سراج اورنگ آبادی کی غزل گوئی (شاعر کا تعارف)	224
		دو منتخبہ غزلیں ☆ جان و دل سیں میں گرفتار ہوں کن کا، ان کا	
		☆ خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی	
اکائی	14۔	قصیدہ باغ محمد شاہی (دکن میں قصیدے کی روایت۔ محمد قلی قطب شاہ کی قصیدہ گوئی)	243
بلاک VI		**دکنی نثر کا مطالعہ**	
اکائی	15۔	دکنی نثر کی روایت (اہم نثر نگار: برہان الدین جانم، وجہی، امین الدین اعلیٰ، میراں جی خدا نما)	260
اکائی	16۔	دکنی نثر کا مطالعہ (کلمتہ الحقائق، تعارف: ابتدائی بیس (20) صفحات کا متن مع تشریح	289
		نمونہ امتحانی پرچہ	306

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج و ترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کردیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔یہی کیفیت اکثر رسائل واخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں،عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کردی ہے۔یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرینِ علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی پچیسویں سالگرہ منا رہی ہے مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامت فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامت فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔گرچہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورت حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیمِ قلب کے ساتھ مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن
وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈِویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈِویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کما حقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 144 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centers) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centers) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لِنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس (SMS) کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان
ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

زبان انسانی خیالات وجذبات کے اظہار کا موثر وسیلہ اور معاشرتی عمل ہے۔اس کے ذریعے انسان اپنا مافی الضمیر واضح کرتا ہے اور یہی انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔زندگی کی دلکشی اور رنگینی زبان کی بدولت ہے۔ ہندوستانی زبانوں کی فہرست میں اردو کا نمایاں اور تاریخی مقام ہے۔اگر چہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی تاہم اس کی وسعت اور بین الاقوامی حیثیت کا اندازہ اس بات سے ہوجاتا ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں اسے بولا اور سمجھا جارہا ہے اور کئی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ اسے پڑھایا جارہا ہے۔ عالمی سطح پر اردو گیارہویں نمبر پر بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔اردو کا پیرایہ اظہار خوش گوار نزاکت کا آئینہ دار ہے۔اردو کا لہجہ دل آویز اور شیرینی کا شاہ کار ہے۔یہ زبان ان چند زبانوں میں سے ایک ہے ،جو اپنے اندر تمام انسانی آوازوں کی بہ خوبی ادائیگی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی بھی زبان کو روزمرہ کے کام تک ہی محدود رکھنا کافی نہیں ہوتا۔بول چال کے علاوہ اس کا لکھنا، پڑھنا اور اس میں موجود ادب سے واقف ہونا بھی از حد ضروری ہے۔تخلیقی اعتبار سے ادب کی مختلف نوعیتیں ہیں، جہاں ادب شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے کا فریضہ انجام دیتا ہے وہیں اپنے قاری کو مسرت سے بصیرت تک پہنچانے کا سامان بھی مہیا کرتا ہے اور سب سے اہم درس وتدریس کی دنیا میں طلبا کی تربیت اور معلومات کی ترسیل کا بھی اہم وسیلہ ہے۔اسی مقصد کے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کی تعلیمی ضرورت کو پورا نے کے لیے نصابی کتابوں کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) کی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبا کا تعلیمی معیار یکساں ہو بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں طلبہ کے لیے دوران تعلیم ایک نظام تعلیم سے دوسرے نظامِ تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

یو جی سی کے ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم ،مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے تمام مضامین میں نصابی کتابوں کی تخلیق واشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ان کتابوں کی تیاری میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یہ اکتسابی مواد نہ صرف معیاری اور ہمہ گیر ہو بلکہ مضمون کے تمام اہم موضوعات کی نمائندگی بھی کرتا ہو اور مسابقتی امتحانات کی تیاری کے لیے معاون ومددگار بھی ہوسکے۔

ایم۔اے اردو کا یہ کورس چار سمسٹرز پر محیط ہے۔ ہر سمسٹر میں چار، چار پرچے ہیں۔سب ہی پرچوں میں چار بلاک ہیں، جنھیں سولہ اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے تحت موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات آپ تک پہنچانے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔ ہر سمسٹر میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے طلبا کو چاروں پرچوں کے امتحانات دینے کے علاوہ تفویضات کی تکمیل بھی لازمی طور پر کرنا ہے، تبھی وہ اس کورس میں کامیاب قرار دیے جائیں گے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم ایم۔اے اردو کے پانچویں پرچے کی یہ کتاب پیش کررہے ہیں، جس کا عنوان ''دکنی ادب'' ہے۔طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ فراہم کردہ نصابی کتابوں کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوسکے تجویز کردہ کتابوں اور مشاورتی جماعتوں سے بھی بھرپور استفادہ کریں گے۔

پروفیسر نکہت جہاں
کورس کوآرڈی نیٹر

دکنی ادب

بلاک ا: دکنی زبان

اکائی 1: دکنی زبان کا آغاز وارتقا

(تاریخی پس منظر، صوفیائے کرام کی خدمات)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 اردو زبان کا معنیٰ و مفہوم

1.3 دکنی زبان کا ارتقائی پس منظر

1.4 دکنی زبان کی تشکیل میں صوفیائے کرام کا کردار

1.5 جنوبی ہند میں دکنی اردو کی ترویج

1.6 اردو کے فروغ میں صوفیائے دکن کی خدمات

1.7 جنوبی ہند میں دکنی اردو کے بنیادگزار صوفیا اور ان کی خدمات

1.7.1 حضرت خواجہ گیسودراز

1.7.2 شاہ برہان الدین جانم

1.7.3 شیخ شہباز حسین قادری بیجاپوری

1.7.4 شیخ غلام محمد داول

1.7.5 شیخ محمود الحق خوش دہاں

1.7.6 شاہ امین الدین اعلیٰ

1.8 قطب شاہی عہد کے صوفیاء اور ان کی خدمات

1.8.1 میراں جی حسن خدانما

1.8.2 میراں یعقوب

1.9 اکتسابی نتائج

1.10 کلیدی الفاظ

1.11 نمونہ امتحانی سوالات
1.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
1.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
1.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
1.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اقوامِ عالم کی کوئی بھی زبان یکلخت وجود میں نہیں آئی۔ یہ بات دکنی زبان وادب پر بھی صادق آتی ہے۔ جو اپنے علاقائی پس منظر کی بنیاد پر پہلے دکنی کہلائی۔ دکنی تہذیب وتمدن کے فروغ میں بہمنی سلاطین کا انتہائی اہم اور گراں قدر حصہ رہا ہے۔ انہوں نے جنوبی ہند میں اقتدار قائم کرنے کے ساتھ مختلف لسانی اکائیوں کو باہم متحد کرنے کا کام بھی کیا۔ ان سلاطین کی کاوشوں سے اس خطۂ ارض میں ایک ایسی زبان کو فروغ حاصل ہوا جو دکنی کے نام سے مشہور ہوئی، شمالی ہندوستان میں اسے ہندوی، ریختہ، اردو اور اردوئے معلیٰ جیسے ناموں سے تعبیر کیا گیا۔ آج یہ ہندوستان کی سب سے مقبول اور پسندیدہ زبان ہے جسے عرفِ عام میں اردو کہا جاتا ہے۔

اردو برصغیر میں عام بول چال کی وہ زبان ہے جس کا قدیم ہند آریائی زبان سے بڑا گہرا رشتہ رہا ہے۔ ہندوستان میں رابطے اور بول چال کی زبان کے طور پر اس کی ترویج واشاعت مسلمانوں کی آمد سے بھی پہلے کا واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس دور میں ارباب اقتدار اور اہل علم ودانش نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ہندوستان کے طول وعرض میں اس زبان کے ابتدائی نمونے متعدد علاقوں میں مختلف شکلوں میں شہہ پاروں کی صورت بکھرے نظر آتے ہیں۔ اردو زبان کی ایک اہم خاصیت رہی ہے کہ وہ جس علاقے میں گئی وہاں کے علاقائی اثرات کو قبول کرکے ایک نئی راویت کی بنیاد گزار بنی۔

اردو زبان کی اس کشادہ قلبی کا اثر یہ ہوا کہ ہر علاقے میں اس کا رنگ وآہنگ ایک دوسرے سے قدرے مختلف اور جداگانہ رہا۔ اس میں جذب وادغام کا ایک لطیف رشتہ ہمیشہ موجود رہا جس نے قومی وحدت اور مذہبی ہم آہنگی کا راستہ ہموار کیا۔ اپنے مختلف رنگ واسلوب اور لب ولہجے کی وجہ سے مختلف علاقوں میں اس کا نام بھی مختلف رہا۔ مثلاً جب یہ گجرات پہنچی تو بولی ہند کی حیثیت سے جانی گئی لیکن جلد ہی بولی گجرات اور گجری کے نام سے پکاری جانے لگی۔ دکن میں دکنی کہلائی۔ یہی حال سندھ اور پنجاب کے علاقوں میں بھی ہوا۔ بعض قدیم کتابوں میں اسے لاہوری اور دہلوی بھی لکھا گیا ہے۔ زبان کے نام میں اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ علاقائی اثرات کو قبول کرنے کی وجہ سے اردو کا رنگ وروپ متعدد علاقوں میں جداگانہ رہا۔ اردو زبان کو اس کے تاریخی پس منظر کی بنا پر مختلف ناموں مثلاً ریختہ، ہندوی، ہندوستانی، اردو اور اردوئے معلیٰ جیسے ناموں سے تعبیر کیا گیا۔ ہندوستان کے جنوبی علاقوں میں اسے دکنی کہا گیا۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ اردو زبان کے معانی اور مفاہیم کی وضاحت کرسکیں۔

☆ اردو زبان کے آغاز وارتقاء کا جائزہ لے سکیں۔

☆ اردو زبان کے فروغ میں صوفیاء دکن کی خدمات کو بیان کرسکیں۔

☆ جنوبی ہند میں اردو کے بنیاد گزار صوفیاء کے کارناموں پر گفتگو کرسکیں۔

☆ جنوبی ہند میں اردو زبان کو فروغ دینے والے صوفیاء کی خدمات کی وضاحت کرسکیں۔

☆ حضرت خواجہ گیسودراز کی اردو خدمات پر بحث کرسکیں۔

☆ اردو زبان کے فروغ میں قطب شاہی عہد کے صوفیاء کے کارنامے بیان کرسکیں۔

☆ اردو زبان کے فروغ میں میراں جی حسن خدانما کی خدمات سے واقف ہوسکیں۔

1.2 اردو زبان کا معنیٰ و مفہوم

''اردو'' اصلاً ترکی زبان کا لفظ ہے۔ شہر، قلعہ، قصر، لشکر وغیرہ اس کے معنی ہیں۔ یہ لفظ ہندوستان میں پہلی بار بابر کے ساتھ آیا، بابر مغل تھا۔ مغلوں اور ترکوں میں ایک طرح کی نسبت ضرور تھی لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ بابر سے بہت پہلے ترک ہندوستان آئے لیکن اس لفظ کا کچھ نشان نہیں ملتا۔ جاننے کی اصل بات یہ ہے کہ اردو زبان کو زمانہ قدیم میں ہندوی کہا جاتا تھا جسے آج ہم قدیم اردو کا نام دیتے ہیں۔ اس قدیم اردو کے بھی بہ اعتبار زمانہ مختلف نام ہیں جنھیں تدریج زمانی کے اعتبار سے درج کیا جارہا ہے؛ ہندوی، ہندی، دہلوی، گجری، دکنی، ریختہ۔ اردو زبان کا وہ روپ جو دکن میں بولا اور لکھا جاتا تھا اسے سترہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک ''دکنی'' کہتے تھے۔ شمالی ہند میں ایک زمانے تک اس زبان کو ''ریختہ'' اور ''ہندی'' کہا جاتا تھا۔ ریختہ کے بعد اسی زبان کو زبان اردوئے معلیٰ اور پھر اردو کہا جانے لگا۔

یہ بات پہلے آچکی ہے کہ اردو کے معنی شہر اور قلعہ کے بھی ہوتے ہیں۔ اس بات کی وافر شہادتیں ملتی ہیں کہ شمالی ہند میں ایک طویل عرصے تک شاہجہاں آباد (وہ فصیل بند شہر جسے آج ہم پرانی دلی کہتے ہیں) کو ''اردو'' کہا جاتا تھا۔ مصحفی کا شعر ملاحظہ کیجیے ؎

البتہ مصحفی کو ہے ریختے میں دعویٰ
یعنی کہ ہے زباں داں اردو کی وہ زباں کا

درج بالا شعر سے بالکل واضح ہے ریختہ اور اردو ایک ہی زبان کے نام نہیں ہیں بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ریختہ 'اردو' کی زبان ہے۔ اغلب ہے کہ اس شعر میں ''اردو'' شاہجہاں آباد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مصحفی ہی کے ایک شعر میں ''اردو'' کا لفظ صاف طور پر زبان کے معنی میں آیا ہے۔ جیسے:

ہر جائے گوش چشم بنا ناک کان کو
اپنی زبان سمجھے ہیں اردو زبان کو

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوی زبان کے نام کے طور پر ''اردو'' کا استعمال اٹھارویں صدی کے ربع آخر سے ملتا ہے۔ خان آرزو کی فارسی تصنیف ''مثمر'' سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے فارسی زبان کو زبان اردوئے معلائے شاہجہاں آباد کہا جاتا تھا۔ جب ہندوی یا ریختہ نے لال قلعے میں فارسی کی جگہ لے لی تو ''زبان اردوئے معلائے شاہجہاں آباد'' کہلائی۔ گویا یہ زبان کا ایک منصب تھا جو بعد میں ہندوی کو ملا۔ بہر حال یہی ''زبان اردوئے معلائے شاہجہاں آباد'' گھٹتے گھٹتے زبانوں پر بطور اسم زبان ''اردو'' رہ گیا۔

1.3 دکنی زبان کا ارتقائی پس منظر

تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ جس دور میں مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی اثرات ہندوستانی تہذیب وثقافت سے ہم آہنگ ہو رہے تھے اسی دور میں اردو زبان مقامی محاوروں اور کہاوتوں میں استعمال کی جارہی تھی۔ اردو زبان کی تاریخ کا مطالعہ اس بات کا شاہد ہے کہ ابتدا میں اشرافیہ کے بڑے طبقے نے اسے ناقابلِ اعتنا سمجھا کیونکہ ان کے درمیان فارسی جیسی متمول زبان رائج تھی۔ عرب تاجر اور مبلغ کی حیثیت سے اور ترک فاتح کی حیثیت سے جنوبی ہند میں وارد ہوئے۔ ان فاتحین کی اکثریت کا تعلق اس اشرافیہ طبقہ سے تھا جن کی زبان عربی اور فارسی تھی۔ تیسرا گروہ ان انسان دوست صوفیا کا تھا جن کی آمد نے انسانیت اور اردو زبان کو بہت کچھ عطا کیا۔ صوفیا نے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی اور اردو نے ذہنوں میں۔ تقریباً تمام صوفیا نے اردو کو بڑے پیمانے پر اپنایا اور عوام میں اپنی تعلیمات کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ وہ اردو کو اپنے خیالات کی تبلیغ واشاعت کا ایک بہترین ذریعہ اور وسیلہ سمجھتے تھے۔ اس کی ظاہر وجہ یہ ہے کہ یہ زبان عوام میں بولی اور سمجھی جاتی رہی ہوگی۔ لہٰذا اس کے توسط سے عوام سے مکالمہ کرنا آسان تھا۔ تبلیغ وارشاد کے بامعنی اور مفید مقصد کے حصول کی خاطر کسی نئی یا اجنبی زبان کو اپنانا کارلا حاصل تھا۔ اس بات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان کی بنیاد بہت قدیم ہے اور اس کے تشکیلی دور میں صوفیا کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ یہ اور بات ہے کہ صوفیا کے کلام اور ان کے ملفوظات سے ادبی تخلیقیت اور لفظوں کے خلاقانہ استعمال کی کوئی زندہ اور توانا روایت نہیں ملتی لیکن ایک زبان کی حیثیت سے اردو کی ترویج و اشاعت میں ان کا کردار مثالی ہے۔ صوفیا کی ابتدائی کوششیں نہ ہوتیں تو شاید اردو زبان وادب اور اسلوب وآہنگ کی زندہ اور توانا روایتیں بھی نہ ہوتیں۔

1.4 دکنی زبان کی تشکیل میں صوفیائے کرام کا کردار

اردو زبان کے تشکیلی دور میں صوفیا کی تحریری سرگرمیوں، ملفوظات اور تواریخ میں محفوظ ان کے اقوال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ زبان کی تعمیر وترقی اور ترویج واشاعت صوفیا کا مطمحِ نظر نہیں تھا بلکہ عوامی زبان کی طرف ان کا میلان تبلیغی اور اصلاحی مقاصد کے پیش نظر تھا۔ صوفیا کے ارادت مندوں میں عوام اور خواص دونوں ہی ہوتے ہیں۔ یہ صوفیا سے تعلق کا نتیجہ ہی تھا کہ اردو زبان کے بعض محاورے اور روزمرہ کی کہاوتیں ان مصنفین کی کتابوں میں بھی جگہ پاجاتی ہیں جو اپنی نگارشات فارسی میں رقم کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ابوالفرج، خواجہ مسعود سعد سلمان، منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، شمس سراج عفیف اور امیر خسرو وغیرہ کی فارسی تصانیف میں بہت سے اردو یا ہندوی الفاظ کا بے تکلف استعمال ہوا ہے۔

اردو زبان کی تشکیل کے تعلق سے سب سے پہلا نام مسعود سعد سلمان لاہوری (1211-1046) کا لیا جاتا ہے۔ انھیں ہندوی کا پہلا شاعر مانا جاتا ہے۔ امیر خسرو کے مطابق ان کا ایک ہندوی دیوان بھی تھا جو آج مفقود ہے۔ امیر خسرو (1325-1252) کا شمار امرائے سلطنت میں بھی ہوتا ہے اور حضرت نظام الدین اولیا سے بیعت ہونے کی وجہ سے صوفی بھی مانے جاتے ہیں۔ امیر خسرو فارسی کے شاعر تھے لیکن ''دیباچۂ غرۃ الکمال'' سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تفریحِ طبع کے طور پر ہندوی زبان میں بھی کچھ شاعری ضرور کی ہے۔ امیر خسرو سے بہت سی معروف پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں منسوب ہیں جن میں سے اکثر کی استنادی حیثیت مشکوک ہے۔ امیر خسرو کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیا کے ایک اور مرید امیر حسن کی ایک غزل اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر، شیخ حمید الدین ناگوری، خواجہ نظام الدین اولیا، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری وغیرہ کے ارشادات وملفوظات اور بیاضوں میں بھی اس زبان کے ابتدائی نقوش اور تشکیلی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔ شمالی ہند کے صوفیا کی طرح دکن کے صوفیائے کرام کے ملفوظات میں بھی اردو کے جملے اور فقرے ملتے ہیں، جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ

اپنے تشکیلی دور میں اردو زبان کی ساخت اور کینڈا کیا تھا۔ ذیل میں بزرگان دین کے وہ فقرے درج کیے گئے ہیں جو مختلف تاریخوں اور تذکروں میں آج بھی محفوظ ہیں۔

''حضرت شاہ برہان الدین غریب (م۔ 738ھ/ 1337ع) اپنے مرشد نظام الدین اولیاؒ (م۔726ھ/ 1325ع) کے حکم سے دکن آئے تو پیرو مرشد نے تاکید فرمائی کہ ان کی پیرزادی بی بی عائشہ (بنت بابا فرید گنج شکر) کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے رہنا۔ ایک دن شاہ غریب بعد نماز جمعہ بی بی عائشہ کے گھر گئے تو ان کی لڑکی کو دیکھ کر مسکرائے۔ بی بی عائشہ نے کہا: ''اے برہان الدین! ساڈھی دھیہ کُہہ کیا ہنسدا اے۔'' (اے برہان الدین! ہماری لڑکی کو دیکھ کر کیوں ہنستا ہے۔) ایک دوسری تاریخ میں یہ جملہ اس طرح ملتا ہے کہ ''اسادھی کے بن جی ضرورت کیڑھی آہے۔'' (میری لڑکی کو دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔'')

زین الدین خلد آبادی (م۔771ھ/ 1369ع) بستر مرگ پر تھے۔ حاضرین میں سے کسی نے خیریت پوچھی۔ انہوں نے جواب دیا: ''منجہ مت بلاوو'' ایسے لمحوں میں انسان وہی زبان بولتا ہے جسے وہ ساری زندگی ہر وقت استعمال کرتا ہے۔

شاہ کوچک ولی (805ھ/ 1402ع) کے، جو شاہ برہان الدین غریب کے خلیفہ ہیں اور بیڑ میں ان کا مزار آج بھی موجود ہے، یہ دو فقرے بھی تاریخوں میں محفوظ ہیں:

(الف) نہورے آئے نہورے جائے، لالے کوں تیرے بارے۔

(ب) سید محمد اُوس نہ پتیائے۔

(بحوالہ: جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول (نیا ایڈیشن)، ای پی ایچ، 2013، ص120)

1.5 جنوبی ہند میں دکنی اردو کی ترویج

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیت ہے کہ جنوبی ہندوستان ایک طویل مدت تک شمالی ہند سے الگ تھلگ رہا ہے۔ جنوبی ہند میں عرب تاجر اور مبلغ کی حیثیت سے اور ترک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ جو اپنی زبان اور روایات بھی ساتھ لائے۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی روابط کا آغاز جنوبی ہند میں علاء الدین خلجی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور کے حملوں سے شروع ہوا جو محمد بن تغلق اور اورنگ زیب کے عہد تک جاری رہا۔ ان کے حملوں اور فتوحات کے سبب بڑے پیمانے پر آمد و رفت کے علاوہ تہذیبی، ثقافتی اور لسانی اختلاط اور لین دین کی راہیں استوار ہوئیں۔ محمد تغلق کی وفات کے بعد جب تغلق سلطنت کمزور ہوگئی تو دکن میں بہمنی سلاطین کو عروج حاصل ہوا شمالی ہند پر تیمور کے حملے کے بعد جنوبی علاقے اس سے آزاد ہونے لگے۔ گجرات بھی آزاد ہوگیا اور نتیجتاً مظفر شاہ نے وہاں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ دکن کی ان دونوں ریاستوں کی تاریخ کے تحقیقی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن کے سلاطین کے عہد میں دکنی زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوا تھا۔

1.6 اردو کے فروغ میں صوفیائے دکن کی خدمات

دکن کے ابتدائی عہد کی ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں میں جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے ان میں فخر دین نظامی بیدری کے علاوہ سبھی صوفی ہیں اور ان

صوفیا کی تحریری کاوشیں مذہبی نوعیت کی ہیں۔جن میں شیخ بہاء الدین باجن (1388-1506) کی تصنیف ''خزائن رحمت اللہ'' فارسی نثر میں ہے۔ اس کتاب کے ''خزینۂ ہفتم'' میں شیخ باجن کا صوفیانہ کلام بھی شامل ہے۔قاضی محمود دریائی (1469-1534) کا کلام بھی صوفیانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔شاہ علی محمد جیوگام دھنی (م1565) شاہ ابراہیم کے بیٹے تھے۔جیوگام دھنی کے مجموعے کا نام ''جواہر اسرار اللہ'' ہے۔شیخ خوب محمد چشتی (م1614) اسی زمانے کے نامور صوفی شاعر اور گجرات کے صوفیائے کبار میں سے ہیں۔فارسی زبان اور انشا پر انھیں مہارت حاصل تھی۔ان کی اردو مثنوی ''خوب ترنگ (1578)'' بڑی شہرت کی حامل ہے۔شیخ خوب محمد چشتی کی تصنیف ''امواج خوبی'' جو کہ فارسی نثر میں ہے دراصل اسی مثنوی کی شرح ہے۔خوب محمد چشتی کا ایک منظوم رسالہ ''چھند چھنداں'' بھی خاصا مشہور ہے۔اس رسالے میں فارسی عروض کو ہندوی عروض کے توسط سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔شاہ باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی جیوگام دھنی اور خوب محمد چشتی نویں اور دسویں صدی ہجری کے صوفی شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔دسویں صدی ہجری کے اواخر اور گیارھویں، بارھویں صدی ہجری میں شیخ احمد گجراتی، سید محمد مہدی، میاں مصطفیٰ، عالم گجراتی، محمد فتح بلخی وغیرہ قابل ذکر شعرا ہیں۔یہ تمام شعرا گجرات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی ادبی روایت ''گجری روایت'' کہلاتی ہے۔

1.7 جنوبی ہند میں دکنی اردو کے بنیاد گزار صوفیا اور ان کی خدمات

1.7.1 حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نواز:

حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نواز کی دکن تشریف آوری سے دکن میں دکنی اردو میں تحریری روایت کی تخم ریزی ہوئی۔آپ کے خلیفہ میراں جی شمس العشاق (م1496) کو اردو لکھنے والوں میں اولیت حاصل ہے۔ان کا تعلق خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے سلسلے سے تھا۔آپ شاہ کمال الدین بیابانی کے خلیفہ تھے۔خوش نامہ، خوش نغز، شہادت التحقیق اور مغز مرغوب ان کی نظمیں ہیں۔''شہادت التحقیق'' میراں جی کی ایک طویل نظم ہے۔جس میں انھوں نے عام لوگوں کی تفہیم کے لیے معرفت اور شریعت وطریقت کے مسائل قرآن وحدیث کی روشنی میں آسان اور سادہ زبان میں بیان کیے ہیں۔

سید اشرف بیابانی (1459-1528) کی تین تصانیف دستیاب ہیں: ''لازم المبتدی''، ''واحد باری'' اور ''نوسرہار'' میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

1.7.2 شاہ برہان الدین جانم:

شاہ برہان الدین جانم، میراں جی شمس العشاق کے فرزند ارجمند اور خلیفہ تھے۔ان کا مفصل حال نامعلوم ہے۔ایک اندازے کے مطابق ان کا انتقال 1582 کے بعد ہوا۔شاہ برہان الدین جانم اپنے وقت کے بڑے عارف باللہ اور برگزیدہ بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔''کلمۃ الحقائق'' اور ''رسالۂ وجودیہ'' ان کی نثری کتابیں ہیں۔ان کا منظوم کلام ''وصیت الہادی''، ''بشارت الذکر''، ''فرمان از دیوان''، ''حجۃ البقا''، ''ارشاد نامہ''، ''منفعت الایمان''، ''نکتۂ واحد'' اور ''سکھ سہیلا'' کی شکل میں ملتا ہے۔ان کی نظم وصیت الہادی ایک مربوط و مسلسل نظم ہے جس کے اوزان ہندوی ہیں لیکن عربی فارسی کے الفاظ کی تعداد دور ماقبل کی بہ نسبت زیادہ نظر آتی ہے جو کہ عربی فارسی کی وہ اصطلاحات ہیں جو تصوف میں رائج ہیں۔

جانم کی نثری تصنیف ''کلمۃ الحقائق'' میں شریعت وطریقت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔اس کتاب میں ہندوی اور فارسی طرز احساس میں جو کشمکش چل رہی تھی وہ بہت نمایاں ہے۔ان کی نثر کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''توں بندہ خدا تھے تو فعل تیرے وہ بھی خدا تھے جسے تیری طاقت میں آوتا وکار کمال قدرت غالب آتی

خداست و نہ بنی کہ در کار دنیا نفسانی جہد کوشش تدبیر قوی دیکھلا تا و در کار خدائی یعنی کاہلی می کند انصاف نہ شوی درخور۔‘‘

ان کی شاعری کا موضوع بھی والد کی طرح تصوف اور سلوک پر مبنی ہے۔ اپنے وقت کے بڑے عارف اور برگزیدہ بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بیجاپور کے ادبی اسلوب کے نمائندہ شاعر ہیں۔ یہ وہی اسلوب ہے جو گجری اور بہمنی دور سے ہوتا ہوا اپنے والد میراں جی شمس العشاق کے توسط سے ان تک پہنچا۔ میراں جی کے بالمقابل ان کا کلام زیادہ صاف اور شاعرانہ ذوق زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ ’’کلمۃ الحقائق‘‘ اور ’’رسالۂ وجودیہ‘‘ ان کی نثری کتابیں ہیں۔ ان کا منظوم کلام ’’وصیت الہادی‘‘، ’’بشارت الذکر‘‘، ’’فرمان از دیوان‘‘، ’’حجۃ البقا‘‘، ’’ارشاد نامہ‘‘، ’’منفعت الایمان‘‘، ’’نکتۂ واحد‘‘ اور ’’سکھ سہیلا‘‘ کی شکل میں ملتا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ شاہ برہان الدین جانم نے خیال اور دوہے بھی کہے ہیں۔ ان کے کلام میں شاعرانہ لطافت بھی بدرجۂ اتم ہے:

بن عشق بدھ کو سوج نہیں
اور بن بدھ عشق کی گوج نہیں
جے آپ کو کھوجیں پیو کو پائیں
پیو کو کھوجیں آپ گنوائیں

شاہ برہان الدین جانم ہندوی زبان کو ذریعۂ اظہار بنانے کے بارے میں اپنے والد میراں جی شمس العشاق کی طرح عذر خواہی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اعتماد و اطمینان کے ساتھ ہندوی زبان کو علم کے ہیرے کی شمع قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

عیب نراکھیں ہندی بول
معنی تو چک دیکھ دھنڈول
جوں کے موتی سمدر سات
ڈابر میں جے لاگیں ہات
کیوں نہ لیوے اس بھی کوئے
سہانا چتر جو کوئی ہوئے
ہیں سمند کے موتی یو
گیان رتن کے جوتی یو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برہان الدین جانم کے تخلیقی عمل میں گجری اور بہمنی روایت سرایت کیے ہوئے ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گجری اور بہمنی دور کے برخلاف اب صوفی شعرا کو اردو زبان کے سلسلے میں کوئی معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اب اردو زبان کی ادبی و تخلیقی روایت کسی قدر پختہ ہو چکی ہے۔

نظم ’’وصیت الہادی‘‘ میں ذکر قلبی اور راہ حقیقت کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ برہان الدین جانم کہتے ہیں کہ طریقت کے لیے شریعت پر

قائم رہنا لازمی ہے اور شرک شیطانی کام ہے۔اس میں راہ سلوک پر چلنے کے رہنما اصول اور عرفان کی منزلیں حاصل کرنے کے طریقے پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ یہ نظم سات حصوں میں منقسم ہے اور ہر حصے میں سلوک کا ایک مسئلہ بیان کیا گیا ہے اس طرح کل سات مسائل سلوک کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔اس مربوط و مسلسل نظم کے اوزان ہندوی ہیں لیکن عربی فارسی کے الفاظ کی تعداد بھی پہلے کے ادوار کی بہ نسبت زیادہ نظر آتی ہے۔ دراصل عربی فارسی کے الفاظ متصوفانہ اصطلاحات ہیں۔

''بشارت الذکر'' میں ساٹھ اشعار اور پانچ ابواب ہیں۔ ہر باب میں ذکر جلی، ذکر قلبی، ذکر روحی، ذکر سری اور ذکر خفی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔اس نظم کی بحر فارسی ہے۔''سکھ سہیلا'' ایک گیت ہے جس میں جانم نے اپنے عارفانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ظاہر ہے اردو کے تشکیلی دور کا گیت ہے اس لیے ہندوی بحر میں لکھا گیا ہے۔اس کی ہیئت یہ ہے کہ ہر تین مصرعوں کے بعد چوتھا مصرعہ ہر بند میں دہرایا گیا ہے۔ ''منفعت الایمان'' میں حمد و نعت کے بعد ''اعتقاد ملحداں'' بیان کیے گئے ہیں اور اس کے بعد ملحدوں یا ان کے عقائد سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔اس نظم کی بحر بھی ہندوی ہے۔''فرمان از دیوان'' نامی نظم میں انتیس اشعار ہیں اور دوہروں کی بحر استعمال کی گئی ہے۔اس نظم میں حروف تہجی کے ذریعے تصوف کے رموز کی تشریح کی گئی ہے۔''حجت البقا'' ایک طویل نظم ہے جس میں تقریباً سولہ سو اشعار ہیں۔اس نظم کا موضوع مرشد و طالب ہے۔ اشعار کے لحاظ سے نظم کے چار حصے ہیں پہلے حصے کے اشعار ''درحق طالب''، دوسرے حصے کے ''درحق مرشد''، تیسرے حصے کے اشعار ''سوال طالب'' اور چوتھے حصے کے اشعار ''جواب مرشد پر مشتمل ہیں۔ یہ نظم برہان الدین جانم کی بہترین نظم ہے۔''ارشاد نامہ'' بھی ہندوی بحر میں ایک طویل نظم ہے جو ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ جانم کی نثری تصنیف ''کلمۃ الحقائق'' میں شریعت و طریقت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔اس کتاب میں ہندوی اور فارسی طرز احساس میں جو کشمکش چل رہی تھی وہ بہت نمایاں ہے۔ان کی نثر کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''توں بندہ خدا تھے تو فعل تیرے وہ بھی خدا تھے جسے تیری طاقت میں آوتا و کار کمال قدرت غالب آتی خداست و نہ بینی کہ در کار دنیا نفسانی جہد کوشش تدبیر قوی دیکھلا تا و در کار خدائی یعنی کاہلی می کند انصاف نہ شوی درخور۔''

اس نثر میں وہ شگوفہ دیکھا جاسکتا ہے جو آگے چل کر وجہی کی سب رس میں شگفتہ ہوتا ہے۔

1.7.3 شیخ شہباز حسینی قادری بیجاپوری:

شہباز حسینی قادری بیجاپوری (م 1606) ہدایت اللہ حسینی کے پوتے اور خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی اولاد سے تھے۔ان کا کلام بہت کمیاب ہے جس کی وجہ سے ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل امر ہے۔البتہ دستیاب کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا موضوع بھی تصوف ہے اور کلام میں عربی اور فارسی الفاظ کا تناسب بھی بڑھ گیا ہے۔ان کی غزل کا درج ذیل شعر ملاحظہ کیجیے۔

خوگر شریعت نعل بند زیں ہے طریقت زیر بند
حق ہے حقیقت پیش بند کر معرفت اختیار توں

1.7.4 شیخ غلام محمد داول:

شیخ غلام محمد داول (م 1657) نے اپنے متصوفانہ خیالات کے اظہار کے لیے اردو زبان کو وسیلہ بنایا۔ان کا پیشہ کتابت تھا۔ان کی چار

نظمیں چہار شہادت، کشف الانوار، کشف الوجود اور ناری نامہ ہیں۔ ان کے اوزان ہندوی ہیں البتہ عربی و فارسی الفاظ کی کثرت بھی نظر آتی ہے۔ شیخ داول نے ''خیال'' میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور ان کے کئی ''خیال'' دستیاب ہوئے ہیں۔ شیخ داول نے خود کو انھی موضوعات تک محدود رکھا ہے جن پر ان کے مرشد برہان الدین جانم پہلے ہی اظہار خیال کر چکے ہیں۔ انھوں نے برہان الدین جانم کے خیالات کی تشریح سے سروکار رکھا ہے۔ ان کا اظہار بیان کسی حد تک جدید اسلوب سے قریب ہے۔ ان کی مثنوی ''شاہ برہان الدین جانم'' کے اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

ایک تھا دانا عاقل مرد
اس کے دل میں آیا درد
مرشد کوں او پوچھیا بات
دکھلا دیو مج حق ذات
بہوت ہوا میں سرگرداں
مج کوں اس کا کہو نشاں
تم ہو مرشد کامل ذات
خلاصی میری تمارے ہات

شیخ غلام محمد داول کے ''خیال'' کی ہیئت وہی ہے جو غزل کی ہیئت ہے۔ اس میں بھی انھوں نے صوفیانہ خیالات، اخلاقی موضوعات، اور عشق حقیقی کا اظہار کیا ہے۔ ذیل میں ''خیال'' کے چند اشعار درج کیے جا رہے ہیں ۔

سب چھوڑ اس دنیا کوں ہیں دیکھ جان ہارے
ہشیار ہو موئے پر افسوس کھان ہارے
کیا فہم ہے بندیاں کوں نسدن لگے دھندیاں کوں
نئیں جانتے دندیاں کوں بھی آگ لان ہارے

''ناری نامہ'' میں 1230 اشعار ہیں اور اس کی ہیئت مربع ترجیع بند کی ہے۔ اس میں مربع کا چوتھا مصرع ٹیپ کے مصرعے کے طور پر بار بار استعمال ہوا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے عورتوں کی زبان میں ان عورتوں کو تلقین و ہدایت کی ہے جنھوں نے اپنے شوہروں کا دل دکھایا ہے۔

1.7.5 شیخ محمود الحق خوش دہاں:

شیخ محمود الحق خوش دہاں، شاہ ابوالحسن قادری کے بھانجے اور شاہ بدرالدین حبیب اللہ کے نواسے تھے۔ بیجاپور میں پیدا ہوئے اور بیدر میں نانا کے یہاں پرورش و پرداخت ہوئی۔ بیجاپور آ کے برہان الدین جانم کے مرید ہو گئے اور ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے امین الدین اعلی کے اتالیق بھی ہوئے۔ ان کا ایک اردو رسالہ دستیاب ہوا ہے جس کے مرتب حمید الدین شاہد ہیں اور انھوں نے اس رسالے کو ''رسالۂ محمود خوش دہاں بیجاپوری'' کا نام دیا ہے۔ ان کی اردو نثر خاصی نکھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے چند جملے بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

''اول ذکر جلی اللہ کا ناؤں ظاہر کے اعضا سوں، ذکر قلبی باطن کی زبان سوں ہمیشہ، بعد ازاں ذکر روحی

مشاہدہ اس طریق سوں۔اول مرشد کی صورت دل میں مقابلہ پکڑنا، اس صورت کوں دیکھنا۔سوروح کا نظر ہے۔اس دل میں یوں بولنا کہ صورت کوں دیکھتا سوکون۔کیا نظر پاک ہے۔عجیب لطیف بعد ازاں اس صورت پر تے نظر ثابت کرنا۔علاحدہ نظر معلق رکھنا۔''

1.7.6 شاہ امین الدین اعلیٰ:

شاہ امین الدین اعلیٰ (1675-1582)، برہان الدین جانم کے بیٹے اور شیخ خوش دہاں کے شاگرد تھے۔اعلیٰ کی پیدائش اپنے والد شیخ برہان الدین جانم کی وفات کے چند ماہ بعد ہوئی۔تعلیم و تربیت کی ذمہ داری والد کے مرید شیخ محمود الحق خوش دہاں نے نبھائی۔شاہ امین الدین اعلیٰ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں ''محبّ نامہ''، ''رموز السالکین''، ''کلام اعلیٰ'' نظم میں اور ''گفتار حضرت امین''، ''وجودیہ'' اور ''کلمۃ الاسرار'' نثری تصانیف ہیں۔امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں شاہ امین الدین اعلیٰ کا کلام ان تغیرات کا مظہر ہے۔ان کی زبان ہمارے لیے قدرے مانوس ہے۔یہی انداز اور اسلوب ان کے گیتوں اور دوہروں میں بھی ہے۔

امین الدین اعلیٰ کی تصنیف ''وجودیہ'' میں نثر کی ترتیب، تنظیم، ربط، جملوں کی ساخت اور بیان کا تسلسل خوش دہاں کی نثر سے زیادہ نمایاں ہے۔ان کی نثر میں فاعل، مفعول اور فعل کی نشست ماضی کی نثر کے بالمقابل زیادہ باقاعدہ ہے۔مثال کے طور پر ''وجودیہ'' کا درج ذیل اقتباس دیکھیے:

''علوی کے مرتبے چار ہیں۔سفلی کے مرتبے چار ہیں۔اول مرتبہ علوی۔مرتبۂ اول مقام شہود۔مرتبۂ دوم مقام محبت۔مرتبۂ سیوم مقام حال۔مرتبۂ چہارم سفلی۔مرتبۂ اول تنگی لذت۔دویم شہوت۔سیوم خطرات نیک بتعلق دل۔چہارم ممتنع دیگر عروج و نزول آدمیاں کا۔''

''گفتار شاہ امین الدین اعلیٰ'' اور ''کلمۃ الاسرار'' بھی ان کی نثری تصانیف ہیں۔''کلمۃ الاسرار'' بہ طریق سوال و جواب لکھی گئی ہے۔

''توحید باری'' کے موضوع پر ''گفتار امین اعلیٰ'' ان کی ایک طویل نظم ہے۔اس نظم کی بحر ہندوی ہے۔اس نظم میں انھوں نے ''وحدت الشہود'' کو وضاحت و صراحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔''کلام شاہ امین الدین اعلیٰ'' ان کی ایک اور طویل نظم ہے جس میں طالبوں کی ہدایت کے لیے شریعت و طریقت کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔''کلام شاہ امین الدین اعلیٰ'' کی بھی بحر ہندوی ہے۔''رموز السالکین'' ان کی ایک اور نظم ہے۔اس میں بھی وہی بحر مستعمل ہے جو مذکورہ دونوں نظموں میں ہے۔نظم میں تصوف کے نئے موضوعات نہیں ہیں بلکہ ان ہی موضوعات کو بیان کیا گیا ہے جو پہلے برہان الدین جانم وغیرہ بھی بیان کر چکے ہیں۔البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اعلیٰ کا کلام ان تبدیلیوں کے مطالعے کے لیے ایک نمونہ ہے۔اعلیٰ کے کلام میں زبان صاف اور بیان میں ژولیدگی کے فقدان کی وجہ سے ان کی زبان ہمارے لیے قدرے مانوس ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کی اثر پذیری اعلیٰ کے پیش رو صوفیا کے کلام کی بہ نسبت بڑھ جاتی ہے۔''گفتار امین اعلیٰ''، ''کلام شاہ امین الدین اعلیٰ'' اور ''رموز السالکین'' میں انھوں نے ایک ہی ہندوی بحر استعمال کی ہے اور یہی بحر انھوں نے ''وجودیہ'' میں بھی استعمال کی ہے۔''وجودیہ'' میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ نظم اور نثر دونوں بلکہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔جن متصوفانہ خیالات کا اظہار انھوں نے فارسی نثر میں کیا ان ہی خیالات کو اردو نظم کے قالب میں بیان کیا ہے۔اس کتاب میں اردو نثر بھی استعمال کی گئی ہے جس میں علوی اور سفلی

مدارج کا بیان ہے۔''محبّ نامہ'' میں انھوں نے معشوق کا سراپا بیان کیا ہے۔ یہ ایک عاشقانہ نظم ہے اور تصوف کے مسائل سے اسے کوئی علاقہ نہیں۔ اس نظم کی ہیئت کسی قدر غزل سے مشابہت رکھتی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ قافیے کا التزام نہیں کیا بلکہ ردیف کی پابندی کی ہے۔ البتہ اعلیٰ نے اس نظم کے مطلع میں صوتی قافیہ رکھا ہے۔نظم کی بحر فارسی اوزان سے ماخوذ ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل شعر ملاحظہ کیجیے ۔

دنداں مثال بجلیاں رخشاں کلام کرنیں

زہرہ دھرے نہ دیدہ خوبیں نہ چھاؤنے کوں

اعلیٰ نے یہ غزل نما ہیئت کئی بار استعمال کی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم پر''غزل'' کا عنوان دیا گیا ہے جس میں انھوں نے میراں جی و جانم کے فیضان اور طریقت کے موضوعات کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح ایک غزل کا عنوان''خیال ریختہ'' ہے۔ اس میں ہیئت تو وہی ہے جو''محبّ نامہ'' میں استعمال کی گئی ہے لیکن اس کا آدھا مصرع فارسی اور آدھا اردو میں ہے۔

یہی انداز اور اسلوب ان کے گیتوں اور دوہروں میں بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ گیت اور دوہرے گجری روایت سے بہمنی اور پھر عادل شاہی دور میں منتقل ہوئے۔ لہٰذا ان کی روایت وہی رہی جو گجری ادب میں قائم ہوگئی تھی اور بیشتر شعرا نے ان اصناف میں گجری روایت کا ہی تتبع کیا ہے البتہ زمانے کی رفتار کے مطابق زبان کی تبدیلی بھی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً اعلیٰ کا گیت''در مقام دھناسری'' کے مندرجہ ذیل بول ملاحظہ کیجیے ۔

جھولو جھولو اپنے پیا سوں

ہیل میل جھولو کھولو

ذات پنے میں آیا نور

پاک محمد منزہ نور

بھوک کارن کیا ظہور

اعلیٰ کی نثر ترتیب، تنظیم، ربط، جملوں کی ساخت اور تسلسل بیان کے اعتبار سے خوش دہاں کی نثر سے زیادہ صاف ہے۔ ان کی نثر میں فاعل، مفعول اور فعل کی ترتیب میں ماضی کی نثر کے بالمقابل زیادہ باقاعدگی ہے۔ مثال کے طور پر''وجودیہ'' سے ماخوذ درج ذیل اقتباس پر غور کیجیے:

''مرید نے پوچھا مرشدِ کامل سوں کہ اے مرشد رہنما والی ہادی صاحبِ زمان کلمہ کا کیا معنا ہے؟ سو بولو ہور مہربانی کرکے یو رمز مجھ پر کھولو۔ تب مرشد نے فرمائے کہ کلمہ کا ظاہر معنا یو ہے کہ نہیں کوئی معبود برحق مگر اللہ ہے۔ ہور محمدؐ بھیجے گئے ہیں۔ اوس معنی کوں برحق کہ جاننا ہور اللہ کو ایک ماننا۔ تب ظاہر کا مسلمان ہوا۔''

''گفتار شاہ امین الدین اعلیٰ'' اور''کلمۃ الاسرار'' بھی ان کی نثری تصانیف ہیں۔''کلمۃ الاسرار'' سوال و جواب کے پیرایے میں لکھی گئی ہے اور سوال پوچھے جانے کا علم بھی جواب دینے والے کے جواب سے ہوتا ہے۔ یہ اعلیٰ کی نثر کا سب سے بہترین نمونہ ہے۔

1.8 قطب شاہی عہد کے صوفیا اور ان کی خدمات

قطب شاہی دور میں اردو ادب شروع سے ہی غیر مذہبی میلان کا حامل رہا ہے۔ اس کے باوجود دو صوفی بزرگ ایسے ہیں جن کی نثری تصانیف کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ذکر کے بغیر دکن میں اردو ادب اور صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ نامکمل کہلائے گا۔

1.8.1 میراں جی حسن خدانما:

میراں جی حسن خدانما کی نثری تصانیف ''چہار وجود''، ''شرح تمہیدات ہمدانی'' اور ''قربیہ'' بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ میراں جی حسن خدا نما (1663-1595) عبداللہ قطب شاہ کی سرکار میں سواروں کے جمعدار تھے۔ وہ بیجا پور کے دربار میں قطب شاہی سلطنت کے سفیر بھی رہے۔ انھوں نے اپنی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تین کتابیں تالیف کیں۔ وہ اپنی تصنیف ''چہار وجود'' میں سوال و جواب کی صورت میں متصوفانہ مضامین کی تشریح پیش کرتے ہیں۔ ''تمہیدات ہمدانی'' عربی کی مشہور تصنیف ہے جسے ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی (م 1138) نے تحریر کیا تھا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (م 1421) نے فارسی میں اس کتاب کی شرح لکھی۔ میراں جی حسن خدانما نے گیسو دراز کی اسی فارسی شرح کو ''شرح تمہیدات ہمدانی'' کے نام سے بہ زبان دکنی تحریر کیا۔ چہار وجود، شرح تمہیدات ہمدانی اور رسالہ قربیہ کا نام معروف ہے۔ چہار وجود سوال و جواب کی شکل میں تصوف کی تشریح پر مشتمل ہے۔ تمہیدات ہمدانی میں عقائد، تصوف اور سلوک کے مسائل کو قرآن و احادیث کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ خدانما کی عبارت صاف ہے اور فارسی اسلوب کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔

1.8.2 میراں یعقوب:

اس دور میں میراں جی حسن خدانما کے شاگرد میراں یعقوب کی تصنیف ''شمائل الاتقیا'' کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ میراں یعقوب کی نثر میں سادگی اور پُرکاری دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر تبلیغی مقاصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ادبیت کے تقاضوں کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ نمونے کے طور پر درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''جھوٹ کیوں ہے۔ جوں چودویں رات کا چاند۔ جوں جوں دن جاتے تیوں تیوں کم ہوتا۔ ہور سچ
> جوں پہلا چاند ہے۔ روز روز روشن ہوتا ہے۔''

اوپر پیش کیے گئے اقتباس میں تبلیغ کا دلنشین انداز اور نثر کا ادبی حسن اپنی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ صاحب کتاب نے متصوفانہ اور شرعی اصطلاحات کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ مثال کے طور پر وحدت کا ترجمہ ''ایک پنا''، دوئی کا ''دوپنا''، کثرت کے لیے ''بہوت پنا''، آدمیت کے لیے ''آدمی پنا''، خودی کے لیے ''میں پنا'' وغیرہ۔ میراں یعقوب کی کتاب ''شمائل الاتقیا'' دراصل عمادالدین دبیر معنوی کی تصنیف ہے۔ میراں یعقوب نے اسی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ لفظی ہے لیکن میراں یعقوب نے صراحت و وضاحت کے لیے کچھ اضافے بھی کیے ہیں۔ ان اضافہ شدہ جملوں سے میراں یعقوب کی نثر نگاری کے جوہر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ترجمہ کی نثر سادہ اور روزمرہ سے متصف ہے جب کہ اضافہ شدہ نثر میں رنگینی کا عنصر خاص طور پر متوجہ کرتا ہے۔ میراں یعقوب نے عبارت کے ترجمے کے ساتھ ساتھ تصوف اور شریعت کی اصطلاحات کو بھی اردو میں منتقل کیا ہے۔ اردو نثر کے ابتدائی اور ارتقا پذیر دور میں اصطلاح سازی کے اعتبار سے ترجمے کا یہ پہلو خصوصی توجہ کا حامل ہے۔

1.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ☆ اردو زبان کی ابتدائی تشکیل اور ترسیل میں صوفیائے دکن کی تحریری و تقریری سرگرمیاں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔
- ☆ دکن کے صوفیا نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں جو گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

☆ خوش نامہ، خوش نغز، شہادت الحقیق اور مغز مرغوب خواجہ گیسو دراز بندنواز کی نظمیں ہیں۔

☆ ''وصیت الہادی''، ''بشارت الذکر''، ''فرمان از دیوان''، ''حجتہ البقا''، ''ارشاد نامہ''، ''منفعت الایمان''، ''نکتۂ واحد'' اور ''سکھ سہیلا'' شاہ برہان الدین جانمؒ منظوم کلام ہے۔ کلمتہ الحقائق ایک رسالہ ہے، جوان کی نثری تصنیف ہے۔

☆ شاہ امین الدین اعلیٰ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں 'محبّ نامہ'، ''رموز السالکین''، ''کلام اعلیٰ'' نظم میں اور ''گفتار حضرت امین''، ''وجودیہ'' اور ''کلمتہ الاسرار'' نثری تصانیف ہیں۔

☆ بہتر سماج کی تشکیل میں صوفیا کے روحانی کردار کے ساتھ ان کی لسانی خدمات کو بھی منظر عام پر لانا چاہیے۔

☆ بلا شبہ ان کے ارشادات وملفوظات کا لسانی مطالعہ اس پُر آشوب دور میں لسانی کدورتوں کو مٹانے میں معاون ثابت ہوگا۔

1.10 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
گجری	:	اردو زبان کی وہ ابتدائی شکل جو گجرات اور اس کے گردونواح میں بولی جاتی تھی.
دکنی	:	قدیم اردو زبان جو شمال سے دکن میں آئی اور دکن کی نسبت سے دکنی کہلائی۔
ریختہ	:	اردو زبان کا ایک نام، اردو شاعری جس کا آغاز ولؔی کے سفر دہلی کے بعد ہوا۔
ہندوی	:	اردو کے قدیم ناموں میں سے ایک نام۔
ملفوظات	:	بزرگوں کے کہے ہوئے۔
کہہ مکرنیاں	:	شاعری کی ایک صنف جو امیر خسرو سے منسوب ہے۔
غرۃ الکمال	:	حضرت امیر خسرو کے دیوان کا نام۔
معرفت	:	شناخت، پہچان، خدا کی ذات وصفات کی عظمت کی پہچان۔
شریعت	:	زندگی گزارنے کے لیے دین کا سیدھا راستہ، اسلامی احکام کا مجموعہ۔
طریقت	:	قلب (باطن) کی صفائی کا راستہ۔
جمعدار	:	قدیم زمانے میں فوج کے ایک عہدے کا نام۔
یک پنا	:	وحدت، خدا کے سوا سب کو غیر موجود سمجھنا۔
دوپنا	:	دوئی، خدا کے وجود کے ساتھ دوسروں کے وجود کو بھی ماننا

1.11 نمونہ امتحانی سوالات

1.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ''چھند چھنداں'' کس شاعر کا منظوم کلام ہے؟

2۔ ''غرۃ الکمال' فارسی کے کس باکمال شاعر کی تخلیق ہے؟

3۔ کس بزرگ صوفی کو ہندوی کا پہلا شاعر مانا جاتا ہے؟

4۔ شاہ میراں جی شمس العشاق کا تعلق کس مشہور صوفی کے سلسلے سے تھا؟

5۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کا شیخ خوش دہاں سے کیا رشتہ تھا؟

6۔ میراں جی حسن خدانما کس قطب شاہی بادشاہ کی سرکار میں ملازم تھے؟

7۔ ''شمائل الاتقیا'' کس کی تصنیف ہے۔

8۔ میراں یعقوب نے ''وحدت'' کا کیا ترجمہ کیا ہے؟

9۔ ''کلمۃ الاسرار'' کس صوفی شاعر کی کتاب ہے؟

10۔ میراں جی حسن خدانما نے سوال و جواب کی شکل میں کون سی کتاب لکھی؟

1.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ جنوبی ہند میں اردو کی ترویج کا محرک کیا ہے؟

2۔ شیخ غلام محمد داوَل نے کتنی نظمیں لکھیں؟ تعارف بیان کیجیے۔

3۔ اعلیٰ کی نظم ''محبّ نامہ'' کی ہیئت واضح کیجیے۔

4۔ میراں جی حسن خدانما کی نثری تصانیف کے نام لکھیے۔

5۔ میراں یعقوب کی ترجمہ کردہ اصطلاحات بیان کیجیے۔

1.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اردو زبان کی ترویج میں صوفیا کے ابتدائی نقوش کا مفصل حال لکھیے۔

2۔ شاہ برہان الدین جانم کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ امین الدین اعلیٰ کی نثری تصنیفات کا جائزہ لیجیے۔

1.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	مقالات حافظ محمود شیرانی	مظہر محمود
2۔	تاریخ ادب اردو	جالبی، جمیل
3۔	دیباچہ غرۃ الکمال	امیر خسرو، مترجم: لطیف اللہ گلشن اقبال
4۔	اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام	عبدالحق، مولوی
5۔	دکن میں اردو	ہاشمی، نصیر الدین
6۔	دکنی ادب کی تاریخ	زور، ڈاکٹر محی الدین قادری
7۔	قدیم اردو	عبدالحق

اکائی 2: دکنی زبان کی لسانی خصوصیات

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 دکنی زبان کی لسانی خصوصیات

2.2.1 دکنی اور شمالی ہند کی اردو کے مشترک الفاظ

2.2.2 دکنی میں سنسکرت کے الفاظ

2.2.3 دکنی میں جمع بنانے کا قاعدہ اور علامت مستقبل کا استعمال

2.2.4 دکنی کے مخصوص الفاظ اور ضمائر

2.2.5 دکنی میں الفاظ کی تکرار، حروفِ استدراک اور حروفِ تشبیہہ

2.3 اکتسابی نتائج

2.4 کلیدی الفاظ

2.5 نمونۂ امتحانی سوالات

2.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

دکنی زبان کی خصوصیات موجودہ اُردو سے بہت الگ اور مختلف ہیں۔ اصل میں یہ خصوصیات قدیم اُردو کی خصوصیات ہیں۔ اسی وجہ سے بعض علما نے دکنی کو ''اُردوئے قدیم'' بھی کہا ہے۔ جیسے شمس اللہ قادری نے دکنی شعرا کے بارے میں جو اپنی کتاب لکھی ہے اس کا عنوان ہی ''اُردوئے قدیم'' ہے۔ یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ اُردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی اور پھر بعض تاریخی حالات و واقعات کی وجہ سے دکن پہنچی۔ یہ زبان شمالی ہند میں تیزی سے بدلنے لگی لیکن دکن میں اپنی قدیم شکل میں باقی رہی۔ اسی وجہ سے وہ موجودہ اُردو سے اتنی اور ایسی مختلف ہو گئی کہ اب اسے دکنی اُردو کہا جاتا ہے۔ قدیم اُردو شمال میں صرف بول چال کے لیے استعمال ہوئی چوں کہ وہ ادبی اغراض کے لیے استعمال نہیں ہوئی اس لیے اس کے نمونے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جتنے کچھ نمونے تحقیق کے بعد ملے اور جمع ہوئے ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دکنی زبان کی لسانی خصوصیات

اصل میں قدیم اُردو زبان ہی کی خصوصیات ہیں،لیکن موجودہ طور پر چوں کہ قدیم اُردو کی یہ خصوصیات جدید اُردو سے غائب ہو چکی ہیں اس لیے یہ خصوصیات اب دکنی اُردو کی خصوصیات بن گئی ہیں۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ دکنی اور شمالی ہند کی اردو کے مشترک الفاظ سے واقف ہو سکیں۔
- ☆ دکنی میں شامل سنسکرت کے الفاظ کی نشاندہی کر سکیں۔
- ☆ دکنی میں جمع بنانے کا قاعدہ اور علامت مستقبل کے استعمال سے واقف ہو سکیں۔
- ☆ دکنی کے مخصوص الفاظ اور ضمائر کو واضح کر سکیں۔
- ☆ دکنی میں الفاظ کی تکرار، حروفِ استدراک اور حروفِ تشبیہہ کی وضاحت کر سکیں۔

2.2 دکنی زبان کی لسانی خصوصیات

دکنی اُردو یا اُردوئے قدیم کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ زبان دوسری ہندوستانی زبانوں سے زیادہ قریب تھی۔صرفی اور نحوی لحاظ سے دوسری ہندوستانی زبانوں کی بہت سی خصوصیات اس میں ملتی ہیں۔دکنی میں ہندوستانی زبانوں کے جو الفاظ ملتے ہیں، اس کے تعلق سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''اس دور کی زبان میں ہمیں مختلف زبانوں کی ایک کھچڑی سی پکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، جس میں مقامی زبانوں کے علاوہ کھڑی بولی، برج بھاشا، اودھی، سرائیکی، پنجابی، راجستھانی، سنسکرت اور گجری وغیرہ کے اثرات ایک ساتھ پک رہے ہیں۔عربی، فارسی، ترکی الفاظ اس کھچڑی زبان میں ایک حلاوت پیدا کر کے اسے ایک نیا رنگ دے رہے ہیں۔عربی 'فارسی کے لسانی اور تہذیبی اثرات نے زبان کا خمیر اٹھنے اور جلد پک کر تیار ہو جانے کے عمل میں مدد دی۔''
>
> (تاریخ اُردو ادب۔جلد اول صفحہ 197)

قدیم اُردو اور دکنی میں حقیقت میں کوئی فرق نہیں تھا۔قدیم اُردو جب دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اُردو زبان کی تاریخ پر جو کام کیا ہے اس میں انہوں نے ہر جگہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ قدیم اُردو اور دکنی ایک ہی زبان ہے۔وہ ''معراج العاشقین'' کی زبان کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''وہ چودھویں صدی عیسوی کی ''زبان دہلوی'' کی نشان دہی کرتی ہے''(مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 149)

انہوں نے ''معراج العاشقین'' میں استعمال ہونے والے الفاظ کی فہرست یوں دی ہے: کاڑا (جوشاندہ)' ہور (''اور' یہ پنجابی اور کھڑی میں ملتا ہے) نک (ناک)' بارا (ہوا)' پیلانا (پلانا)' لگ (تک)' بوی (بو)' سوں (سے)' تے (سے)' اُپس کو (اپنے کو)' اپے (خود)' کیاں (کی' کی جمع)' انگے (آگے)' دسرا (دوسرا)' تسرا (تیسرا)' اندھارا (اندھیرا)' اجیالا (اجالا)' نہیں (نہیں)' لک (لاکھ)' میریاں (میری کی جمع)' دک (دکھ)' اے (یہ)' پینے (پہنے)' باج (بغیر)' دسنا (دکھائی دینا)' پیٹ (پیٹھ)' سی (سے)' منا (منع)۔

''معراج العاشقین'' کا مقابلہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مطابق اگر دکنی شاعر نظامی کی زبان سے کیا جائے تو ''نظامی کی زبان کی قدامت

مسلم ہو جاتی ہے۔'' دکنی زبان پر شمالی ہند کی زبانوں کے اثرات کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''نظامی کی زبان میں نہ صرف راجستھانی اور پنجابی کی اکثر شکلیں پائی جاتی ہیں بلکہ اس پر اپ بھرنشی روایات کا ٹھپہ بھی صاف طور پر نظر آتا ہے۔ اس بنا پر بھی قیاس کرنا پڑتا ہے کہ دکن میں نواح دہلی کی ایک سے زیادہ زبانوں کے اثرات پہنچے ہیں'' (مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 15)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب ''مقدمۂ تاریخ زبان اُردو'' کے پانچویں اور آخری باب میں مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ دکنی زبان کی خصوصیات اصل میں قدیم اُردو ہی کی خصوصیات ہیں۔ اسی وجہ سے دکنی' شمالی ہند کی مختلف بولیوں سے متاثر ہے۔ دکنی اور شمالی ہند کی مختلف بولیوں کی لسانی خصوصیات یکساں ہیں۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنے آخری باب کا ذیلی عنوان حسب ذیل رکھا ہے:

دکنی کی لسانی خصوصیات کا تقابل نواح دہلی کی بولیوں سے''

اس باب میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے جگہ جگہ دکنی' ہریانی' کھڑی بولی اور میواتی سے اُردو کا تقابل کر کے یہ بتایا ہے کہ:

''دکنی زبان کے تقریباً تمام حروف نواح دہلی کی بولیوں میں رائج ہیں''

(مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 286)

دکنی میں ''اں'' لگا کر جمع بنانے کا طریقہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مطابق میرٹھ' مظفر نگر اور سہارنپور میں جمع بنانے کا یہ طریقہ آج بھی رائج ہے۔ ادبی سطح پر بھی یہ طریقہ استعمال ہوتا تھا۔ شمالی ہند کے قدیم شعرا فائز اور حاتم کے اشعار سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے دعوے کو مدلل بنا دیا ہے۔

ع دو بھواں تیغ جنوبی سی دراز (فائز)

ع لب پر گلوں کے مہر کرے ان لباں کا رنگ (حاتم)

دکنی میں ''میرا'' کی بجائے ''مج'' یا ''منج'' اور ''تیرا'' کی بجائے ''تج'' استعمال ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین اس کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''قدما کے یہاں اس کی کثرت سے مثالیں مل جاتی ہیں جس سے ثابت ہے کہ یہ دکنی سے مخصوص نہیں مثلاً حاتم کے یہاں تم ساتھ' تجھ گل بدن کی بو' تج عشق' تجھ پاس' ہمن پاس۔''

(مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 284)

2.2.1 دکنی اور شمالی ہند کی اُردو کے مشترک الفاظ:

اسی طرح 'ہمنا' ہمن کو' تمنا' تمن کو' بھی صرف دکنی کی خصوصیات نہیں ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کہتے ہیں کہ حاتم کے کلام میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں سعدی دکنی کا حسب ذیل شعر پیش کرتے ہیں' جس میں ضمائر کی یہ شکلیں مل جاتی ہیں۔

ہمنا تمن کو دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا

ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے

(مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 258)

'ہمن'، 'ہمیں' اور ہمیں کو' کی دکنی شکلیں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تحقیق کے مطابق قدیم اُردو میں رائج تھیں۔ جیسے چندر بھان برہمن کے اس مصرعے میں:

ع خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے

دکنی کا ''سوں' افضل جھنجھانوی نے استعمال کیا ہے:

ع سنی دل سوں، کبھی دیکھی ہمن کوں

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کہتے ہیں کہ دکنی ضمائر میں قابل ذکر ''اپس'' ہے۔ یہ ضمیر محمد قلی سے لے کر ولی تک ہر ایک کے کلام میں مل جاتی ہے۔ یہ بھی افضل کے ''بارہ ماسہ'' میں مل جاتی ہے۔

اری سبزک پیا کے باغ جاکر

اپس کوں بے وفا سیتی لوکا کر

(مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 287)

اسی طرح دکنی کے تقریباً تمام الفاظ نواح دہلی کی بولیوں میں قدیم زمانے سے رائج ہیں جیسے 'سیتی'۔ 'سیتے' تھے' سوں' ستیں' لگوں' لگ' لگن' پہ' پُو' یہ تمام حروف قدیم شعرا یعنی فائزؔ' آبروؔ' حاتمؔ اور دیگر متقدمین کے کلام میں بار بار آتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں مثال کے طور پر یہ درج ذیل اشعار پیش کرتے ہیں:

ادھر اس کے یاقوت سیتی ہیں بیش

عقیق یمن لب سیتی منفعل

فائزؔ

شعر کو مضموں ستے جو قدر رہی ہے آبروؔ

قافیہ سیتے ملایا قافیا تو کیا ہوا

آبروؔ

دل میں طمع نہیں مجھے شاہ و گدا ستے

میں سب کوں چھوڑ ساز کیا ہوں خدا ستے

حاتمؔ

اس کے علاوہ دوسرے الفاظ جو دکنی میں رائج ہیں شمالی ہند کی قدیم اُردو اور وہاں کی بولیوں میں مل جاتے ہیں۔ یہاں ان الفاظ کی فہرست

دی جارہی ہے جواب دکنی کی خاصیت بن گئے ہیں لیکن قدیم اُردو میں یہ رائج تھے۔

ہور (اور)' دھر یا دھیر (سمت)' کدھیں (کبھی)' اتاول (جلد)' اتا' جتا (اتنا اور جتنا)' وستاد (استاد)' اچھنا (ہونا)' دسنا یا دیسنا (دکھائی دینا)' پتیانا (یقین کرنا)' اپجنا (اگنا)' ناؤں' ٹھاؤں (نام' جگہ)

مذکورہ بالا الفاظ کی فہرست ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب میں دے کر یہ کہا ہے کہ دکنی زبان کے یہ تمام الفاظ شمالی ہند کی بولیوں اور زبانوں میں ملتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے خیال میں مرہٹی اور گجراتی زبان کے بعض لسانی اثرات کو چھوڑ کر دکنی کے تمام غریب الفاظ کی توجیہ نواح دہلی کی چار بولیوں ہریانی' کھڑی' میواتی اور برج سے کی جاسکتی ہے۔ اس کے برخلاف دکن میں اجنبی بولیوں کے ماحول میں یہ لسانی ارتقا بالکل رک جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی زبان میں الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں آج سے نوسو برس پہلے رائج تھیں یا جواب صرف گھریلو اور دیہاتی زبان میں پائی جاتی ہیں۔''

(مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 291-290)

اس ساری بحث سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اُردوئے قدیم اور دکنی ایک ہی زبان ہے۔ بعض حضرات کے ذہن میں یہ تصور ہے کہ دکنی اور موجودہ اُردو دو الگ زبانیں ہیں قطعی طور پر صحیح نہیں ہے۔ اب چوں کہ موجودہ اُردو میں دکنی کے وہ الفاظ نہیں ملتے جو قدیم اُردو میں استعمال ہوا کرتے تھے اس لیے دکنی میں پائے جانے والے یہ الفاظ دکنی اُردو کی لسانی خصوصیات بن گئے ہیں۔

جس زمانے میں قدیم اُردو دکن پہنچی وہ ایسا زمانہ تھا جب اُردو سارے ہندوستان میں پھیل رہی تھی اور وہ ہندوستان گیر صورت اختیار کر رہی تھی یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے صوفیا اور مذہبی پیشوا اسی زبان میں اپنی تعلیمات پھیلا رہے تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''اس عہد کے مذہبی پیشواؤں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر یہ احساس ہوگیا تھا کہ ان کا عالم گیر پیغام ایک عالم گیر زبان میں ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ نام دیو نے مرہٹواڑے' میں کبیر داس نے پورب اور گرونانک نے پنجاب میں بیٹھ کر لشکریوں اور بیوپاریوں کے ذریعے پھیلی ہوئی اس زبان کو اپنایا جسے خسرو نے ''زبان دہلوی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔'' (مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 152)

قدیم اُردو ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک جس طرح پہنچ رہی تھی اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''دہلی کے مرکز سے جو نئی لسانی لہریں تمام ہندوستان میں پھیل رہی تھیں ان کا عکس ہمیں دکن کے دور دراز گوشوں سے نام دیو کے کلام تک مل جاتا ہے۔'' (مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 152)

2.2.2 دکنی میں سنسکرت کے الفاظ:

جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے کہ دکنی کی سب سے بڑی اور اہم خاصیت یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بہت قریب تھی۔ جیسے ''والا'' کے لیے ''ہارا'' کا لفظ دکنی میں آتا ہے۔ لیکن یہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

لفظ ''والا'' مابعد کا ارتقا ہے۔ قدیم دکنی' ہریانی' پنجابی اور برج میں ہمیشہ ''ہارا'' آیا ہے جیسے

''جانہارا''۔''پانہارا''　　　　　(مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 163)

دکنی کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں بعض جگہ تو یہ اپنی خالص شکل میں ہیں اور بعض جگہ اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق انہیں بدل دیا گیا ہے۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''جدید آریائی زبانیں جب ادبی شکل اختیار کرتی ہیں تو انہیں خواہ مخواہ سنسکرت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔مسلمانوں کی آمد سے ''سنسکرتیت'' کے اس رجحان کو زبردست صدمہ پہنچا۔انہوں نے اپنا خزانۂ الفاظ بیشتر فارسی اور عربی سے لیا۔ اور ہندوستانی الفاظ کی صحت کی مطلق پرواہ نہ کی چناں چہ دکنی ادبیات میں سنسکرت کے اکثر الفاظ توڑ مروڑ کر ذیل کی شکل میں ملتے ہیں:

پرم' پیم (پریم)' دشٹی (درشٹی = نظر)' چمن (چمبن = چومنا)' انجھو (اشرو= آنسو)' سیتل (شیتل = ٹھنڈا)' بست (وستو= چیز)' کیس (کیش= بال) وغیرہ۔

سنسکرتیت کے اس رجحان کی وجہ سے بہت سے الفاظ دکنی میں استعمال ہوتے ہیں جو خالص شکل میں ہیں۔دکنی زبان وادب کی یہ بھی ایک اہم خاصیت ہے کہ اس میں سنسکرت کے خالص الفاظ بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''سنسکرتیت کے ہی بڑھتے ہوئے عام رجحان سے مسلمانوں کو بھی مفر نہ تھا۔اس کی شہادت' ہمیں قدیم دکنی ادب سے ملتی ہے۔ جہاں خالص سنسکرت کے بے شمار الفاظ بلاتکلف نظم ونثر میں استعمال کیے گئے ہیں۔

میگھ (بادل)' دوت (پیامبر)' ترلوک (تینوں عالم)' چتر (ہوشیار)' جیو (جی)' چرن (قدم)' چنتا (فکر)' دنکر (دن کرنے والا یعنی سورج)' درپن (آئینہ) سور (سورج)' روی (سورج)' رکت (خون)' شبد (لفظ)' سنگرام (لڑائی)' سیس (سر)' ہردے (دل)' ادھک (زیادہ)' بہو (بہت)' وانر (بندر)' الک (زلف)' پرکٹ (ظاہر)' وینا (بین)' انتر (راز)' بھان (سورج)' پستک (کتاب)' وغیرہ۔

قدیم دکنی' قدیم اُردو ہی تھی۔افضل کی مشہور ''بارہ ماسہ'' یا بکٹ کہانی' جو شمالی ہند کی قدیم زبان کا نمونہ ہے' وہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ قدیم اُردو جب دکن آئی تو وہ دکنی کہلائی۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''افضل کی زبان کا لسانی تجزیہ کیا جائے تو قدیم دکنی کی ابتدا پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بات اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ دکنی زبان کا جواز ہریانی اور ہندوستانی (کھڑی یا زبان دہلوی) سے پیش کیا جاسکتا ہے۔گوکئی لحاظ سے افضل کی اُردوؤ دکنی کے مقابلے میں ارتقا یافتہ ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے اسما' ضمائر' حروف اور افعال' افضل نے جو استعمال کیے ہیں وہی دکنی کی کتابوں میں جس طرح ملتے ہیں ان کو پیش کیا ہے۔

''ہم کوں۔اپس کوں (دکنی میں بھی ملتا ہے) ہمن سے (ہم سے دکنی میں بھی ملتا ہے)

حروف: کن کوں (کسی کو)' باجھ (بغیر۔ پیا باج پیالہ پیا جائے نا) سوں۔سیں (دکنی کے مطابق)

اس سلسلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے شاہ سید برکت اللہ مارہروی کا کلام پیش کیا ہے۔شاہ برکت اللہ کے کلام میں بہت سے الفاظ اسی طرح ملتے ہیں جو دکنی میں ہیں۔ذیل میں ان الفاظ کی نشاندہی کی گئی ہے:

گھر تج کے جا جنگل میں پڑے تب سمجھ پری
تن من میں پیم کی اَگ پڑی تب سمجھ پری
تکیہ جو مخملی و دگر سیج چھوڑ کے
جب اینٹ زیر سیس دھری تب سمجھ پری

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے:

''قدیم اُردو میں بیشتر (ڈ) کی آواز ملتی ہے (ڑ) کی آواز اٹھارہویں صدی کی ابتدا کا ارتقا ہے۔(ڈ) کی آواز آج بھی پنجابی، راجستھانی، ہریانی اور کھڑی بولی کے بعض اضلاع (میرٹھ، مظفرنگر، سہارنپور) میں عام مستعمل ہے:

بڈا	بجائے	بڑا
تھڈی	بجائے	ٹھوڑی
گڈھا	بجائے	گڑھا
علی گڈھ	بجائے	علی گڑھ

دکنی میں بھی قدیم اُردو کی طرح (ڈ) کی آواز ملتی ہے، جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دکنی یا قدیم اُردو دوسری ہندوستانی زبانوں سے زیادہ قریب تھی۔دکنی کے ایسے الفاظ جو اب اس کی خاصیت سمجھے جاتے ہیں وہ شمالی ہند کی قدیم اُردو میں بھی استعمال ہوتے تھے۔لیکن مظہر جان جاناں حاتم اور پھر ناسخ نے جو اصلاح زبان کی تحریکیں چلائیں ان کی وجہ سے ٹھیٹ ہندوستانی الفاظ کی جگہ بعض عربی فارسی کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے متروک الفاظ کی لمبی فہرست دی ہے۔جو حسب ذیل ہیں:

نین (چشم)، ساجن (معشوق)، جگ (دنیا)، درشن (زیارت)، ماس (گوشت)، منسا (تجویز)، موہن (معشوق)، پیو (دوست)، پیا (معشوق)، برہا (فراق)، من (دل)، سنسار (دنیا)، باٹ (راستہ)، درشن (دیدار)، دارو (دوا)، پیتم (معشوق)، سریجن (معشوق)، سرج (سورج)، جیو (جی)، بیجلی (بجلی)، جُھٹا (جھوٹا)، چند (چاند)، نمن (طرح)، بھیتر (اندر)، سیں، سوں سیتی (سے)، انگے (آگے)، بنا (بن)، باج (بغیر)، منیں منے (میں)، دوجا، دوج (دوسرا)، لگ (تک)، کن (پاس)، کوں (کو)، نزیک، نزک (نزدیک)، کدھی، کدھیں (کبھی)، اتا (اتنا)، نئیں (نہیں)، تجنا (چھوڑنا)، اتھا (تھا) اہے (ہے)، کیتا (کیا)، جاے (جلائے)۔ بوجھنا (سمجھنا)، گلنا (پگھلنا)، کئی (کوئی)، اَپس (اپنے) تمنا (تمہارے)۔

2.2.3 دکنی میں جمع بنانے کا قاعدہ اور علامت مستقبل کا استعمال:

''اں، لگا کر جمع بنانے کا قاعدہ گو فارسی کا ہے اور شاید فارسی ہی کے اثر سے پنجابی میں بھی یہی قاعدہ ملتا ہے۔مثال کے طور پر یار سے یاراں، ہم نفس سے ہم نفساں وغیرہ۔دکنی میں بھی 'اں' لگا کر جمع بنائی جاتی ہے۔لیکن یہ قاعدہ پنجابی کے علاہ ہریانی اور راجستھانی میں بھی ملتا

ہے۔مسعود حسین خاں لکھتے ہیں۔

''جمع میں حالت مفعولی کا اختتام اُردو کے برخلاف اکثر ''اں'' پر ہوتا ہے جیسے وناں' عورتاں وغیرہ یہ شکل ہریانی' راجستھانی اور پنجابی میں عام ہے۔دکنی کی بھی یہی خصوصیت ہے'' (مقدمہ تاریخ زبان اُردو۔صفحہ 91)

صیغۂ ماضی میں (یا) لگانا دکنی میں عام ہے جیسے ''پوچھا'' کی جگہ ''پوچھیا''۔لیکن یہ صرف دکنی ہی میں نہیں قدیم اُردو اور ہریانی میں بھی ملتا ہے۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''پوچھیا کی ترکیبیں' ہریانی اور قدیم اُردو' دکنی دونوں میں پائی جاتی ہیں (مقدمہ تاریخ زبان اُردو صفحہ 101)

''سی'' علامت مستقبل کے طور پر شمالی ہند کی قدیم اُردو میں رائج تھی۔اور دکن میں بھی رائج تھی۔مسعود حسین خاں نے امیر خسرو کے پیر بھائی حضرت روشن چراغ دہلوی کی تصنیف ''خیر المجالس'' سے یہ فقرہ نقل کیا ہے:

''ارے مولانا یہ بڑا ہوسی'' یعنی ارے مولانا ایں مرد بزرگ خواہد شد''

پھر وہ بتاتے ہیں کہ دکنی میں بھی ''سی'' علامت مستقبل کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔اور وہ ''سب رس'' کا یہ جملہ نقل کرتے ہیں:

''جس عشق کا کچھ درد اس کتاب کو سینے پر تے ہلاسی نا۔اس کتاب بغیر اپنا وقت بھلاسی نا''

اس کے بعد وہ احمؔد اور ولؔی کے اشعار پیش کرتے ہیں جن میں 'سی' علامت مستقبل کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔

کدھیں سیج سک سنگ ملسی نہ منجہ
کدھیں من کمل پھول کھل سی نہ منجہ

......

کیا ہے زہر کا تاثیر اس میں
نہ چل سی کچھ مری تدبیر اس میں

پھر وہ لکھتے ہیں کہ یہ صرف دکنی یا قدیم اُردو کی خاصیت نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی کئی زبانوں میں یہ صورت ملتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''پروفیسر شیرانی نے اس (سی) کا تعلق ملتانی سے بتایا ہے۔حالاں کہ مغربی ہندوستان کی اکثر زبانوں (مثلاً گجراتی' مارواڑی اور جے پوری میں یہ آج تک بعینہ استعمال ہوتی ہے۔دہلی کے مضافات بالخصوص ضلع گوڑ گاؤں کی بولیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔یہاں سے یہ قدیم دہلی کے بازاروں میں عام طور سے رائج ہو گئی ہوگی۔''

(مقدمہ تاریخ زبان اُردو صفحہ 145)

اُردو کے لیے ''ہندوستانی'' کا لفظ انگریزوں سے بہت پہلے رائج ہو چکا تھا۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''شاہ جہاں کی فارسی تصنیفات میں ہندی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کا لفظ بھی زبان کے لیے عام طور پر ملتا ہے۔عبدالحمید لاہوری نے اس لفظ کو بارہا استعمال کیا ہے۔۔۔ڈاکٹر سلیمان ندوی اور پروفیسر شیرانی دونوں کا خیال ہے کہ لفظ ''ہندوستانی'' زبان کے سلسلے میں اس عہد سے قدیم ہے۔''

سید سلیمان ندوی اور پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ (988 تا 1037ء) کی فارسی دانی کے سلسلے میں مشہور مورخ فرشتؔہ

نے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بعد میں ملا وجہی نے بھی ''سب رس'' (1635ء) میں ''زبان ہندوستان'' کی ترکیب استعمال کی ہے۔

2.2.4 دکنی کے مخصوص الفاظ اور ضمائر:

بہت سے لفظ جو ''دکنی'' کی خاصیت ہیں اُردوئے قدیم اور شمالی ہند کی مختلف زبانوں اور بولیوں میں بھی مل جاتے ہیں جیسے ''دہی'' کے لیے ''دہیں'' کا لفظ ''خالق باری'' میں بھی ملتا ہے اور ''سب رس'' میں بھی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''ان کے علاوہ کوں 'توں وغیرہ تو ہر صفحہ پر مل جائیں گے۔ غنّہ کی آواز کی پیدائش جدید آریائی زبانوں کی مشترک عالم گیر خصوصیت ہے۔ توں (تو) پنجابی سے لے کر دکنی' ہریانی' کھڑی بولی' راجستھانی اور برج بھاشا تک میں یکساں طور پر قدیم زمانے سے مستعمل ہے''۔

(مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 273)

فعل میں جمع کا صیغہ صرف دکنی کی خصوصیت نہیں ہے۔ جیسے عورتاں آئیاں یہ قدیم اُردو میں بھی کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ جیسا سوؔدا نے لکھا ہے۔

یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کا ہار ہو پڑیاں

اور حاتؔم کہتے ہیں:

جب سے تری ادائیں عالم کو بھا ئیاں ہیں
تب سے جہاں میں تونے دھومیں مچائیاں ہیں

اس تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا لسانی خصوصیات کے متعلق یہ کہنا کہ اُردوئے قدیم یا دکنی نے پنجابی سے لی ہوگی' محض بے بنیاد قیاس آرائی ہوگی۔ یہی صرفی خصوصیات دہلی کے قرب وجوار کی بولیوں میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔''

(مقدمۂ تاریخ زبان اُردو 231)

پھر وہ بتاتے ہیں کہ شمالی ہند کے مختلف ادیبوں اور شاعروں نے جمع بنانے کے لیے ''اں'' کا استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قدیم ترین مصنفوں محمد افضل اور عبدؔی اور شیخ محبوب عاؔلم' ساکن جھجر وغیرہ کے یہاں ''اں'' ملتا ہے۔ مثلاً دن کی جمع دناں' کھیت کی جمع کھیتاں'' گھر کی جمع گھراں وغیرہ آج بھی ہریانہ کے علاقے میں بولا جاتا ہے۔ شیخ محبوب عالم کے ''محشر نامہ'' میں اسی نہج پر نگراں' غریباں' جھوٹاں' اونٹاں وغیرہ ملتے ہیں۔''

لب پر کلی کی مہر کرے اس لباں کا رنگ (حاتم)

آتیاں' جاتیاں کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے:

''اسی طرح سے آتیاں' جاتیاں وغیرہ حاتؔم' میؔر اور سوؔدا سے لے کر لکھنو میں میر انیؔس اور دہلی میں داؔغ تک نے باندھا ہے۔ راقم السطور نے خود دہلی کی سیڑھیوں کی زبان سے اس قسم کے صیغے سنے ہیں۔''

(مقدمۂ تاریخ زبان اُردو صفحہ 232)

البتہ صفت کی بھی جمع بنانے کا طریقہ خاص دکنی کی خاصیت ہے جیسے

کالیاں، گوریاں، سکیاں، کوں جگ میں جوتھیاں سو بسریا
کونلی سکی کوں دیکھت میں سد بھولیا دکن میں

(محمد قلی قطب شاہ)

کچیاں، کونلیاں، کنواریاں، ناریاں، کلیاں کوں نو روز آیا
محمد صدقے قطبا کوں انداں سوں ملایا ہے

(محمد قلی قطب شاہ)

وجہی کی ''سب رس'' میں بھی صفت کی جمع ملتی ہے۔ مثلاً یہ جملہ دیکھیے :

''عورتاں بچاریاں بہت بھلیاں ہیں۔''

ضمائر کے لیے دکن میں جتنے الفاظ ملتے ہیں وہ شاید ہندوستان کی کسی بھی زبان میں نہیں ملتے۔ ڈاکٹر حبیب ضیا نے دکنی ضمائر کی پوری تفصیل دی ہے۔

ضمیر متکلم :	حالتِ فاعلی	میں، اپے، ہم، ہمن، ہمنا،	ہمے، ہمیں
	حالت مفعولی	مجے، منجے، مجہ، منج، منج کوں،	ہمنا، ہمنا کوں
	حالت اضافی	موں، مج، منج	ہمن، ہمارا
ضمیر مخاطب:	حالت فاعلی	توں، تو	تم، تمن، تمنا، تمیں، تمہیں
	حالت مفعولی	تج، تجھ، تجے، تج کوں	تمن، تمنا کوں
ضمیر غائب:	حالت فاعلی	وہ، وہ، او، وے، انے	ان، اون، وے
	حالت مفعولی	اس، اس کوں، اسے	انوں کوں، انھوں کو، ان کوں
	حالت اضافی	ون کا، اتن،	انو کا، اینو کا

(دکنی زبان کی قواعد صفحہ 86)

ضمیر موصول:	حالت فاعلی	جو، جیو، جے، جن، جن نے، جنے	جن، جنو، جنھوں
	حالت مفعولی	جسے، جس کوں	جنھوں کو
	حالت اضافی	جس کا	جنھوں کا
ضمیر استفہام:	حالت فاعلی	کوں، کن، کنے، کو	کن
	حالت مفعولی	کسے، کس، کس کوں	کنے کوں

حالت اضافی	کس	کن کا

ضمیر اشارہ قریب: یوں، اے، یے

ضمیر اشارہ بعید: وہ، وو

ضمیر تنکیر: کچھ، کچ، کوچ

وہ افعال جو متعلق فعل زماں کہلاتے ہیں۔ دکنی میں ملتے ہیں ان افعال سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فعل کس زمانے میں واقع ہوا۔

1۔ اب کے لیے اِتا، اِتال، ایتال

2۔ جب کے لیے جداں، جدھاں، جو

3۔ تب کے لیے تدھاں، تو

4۔ اول کے لیے پچھے، پچھیں، پچھیں

5۔ جلدی کے لیے ترت، بیگی، بیگ

6۔ ہمیشہ کے لیے جم، سدا

متعلق فعل استفہام، جس میں فعل کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ دکنی میں ذیل کے الفاظ ملتے ہیں:

کیوں کے لیے کی، کے، کاہے، کاہے کوں، کائیکوں، کس دھات

ڈاکٹر حبیب ضیا نے لکھا ہے:

''کیوں، کے لیے ''کے'' کا استعمال دکنی کے لیے خاص ہے۔ اُردو میں یہ لفظ ان معنوں میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔''

مثال کے طور پر انہوں نے یہ شعر پیش کیا ہے،

مونین میانے بیں کے بھی کے نہ آوتے

مجلس ہماری کوں نہیں درباں کا احتیاج

(دکنی زبان کی قواعد صفحہ 191)

متعلق فعل عدد میں یک بار کے علاوہ دو بار کے لیے ''دوجی بار'' سو بار کے لیے ''صد بار''، متعلق فعل مقدار میں اتنا کے لیے ''یتا'' جتنے کے لیے ''جتا''، مرکب متعلق فعل سے کسی فعل کی وضاحت ہوتی ہے۔ دکنی میں اس کی بھی کئی صورتیں ملتی ہیں:

1۔ کئیں کائیں، آسے پاسے

2۔ جاں تلک، وہاں تلک، جولگ، اب لگ، جدھاں لگ، جاں لگوں

3۔ جلگ، تلگ، جوںگن، کوتلک

علامتِ اضافت: اُردو میں علامت کا، کے، کی ہے۔ لیکن دکنی میں ان کے ساتھ علامت اِضافت کی قدیم شکلیں بھی بہت استعمال ہوتی ہیں: کا، کے لئے، کرا اور کیرا، کے کے لیے ''کیرے''، کی کے لیے ''کری'' اور ''کیری''

حرفِ جار: اسم یا ضمیر کا تعلق فعل یا صفت کے ساتھ ظاہر کرنے والے حروف حرفِ جار کہلاتے ہیں۔ اُردو میں ''سے''،'' ئیں''،'' تک' اور پر استعمال ہوتے ہیں۔ دکنی میں ان کے علاوہ حرفِ جار کی کئی صورتیں ملتی ہیں:

''سے'' کے لیے ''سوں''، ''ستی''، ''سیتی''، ''سیتیں''، ''سیتھیں''، ''سیں''، ''سے''، ''ستھے''، ''تھے''، ''تے''۔

''تک'' کے لیے ''تلگ''، ''لگ''، ''لگوں''، ''لگن''، ''پر'' کے لیے ''اپر' اپرال' پُوپہ

الفاظ کی تکرار سے بعض وقت تاکید' بعض جگہ مبالغہ تو کبھی تعمیم اور کبھی کثرت کا مفہوم پیدا کیا جاتا ہے۔ دکنی کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں صرف لفظ کی تکرار نہیں ہوتی بلکہ ''ے'' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے 'بال بال' کی جگہ 'بالے بال'۔ 'رگ رگ کی جگہ 'رگے رگ'۔ 'جنگل جنگل' کی جگہ جنگلے جنگل' بن بن کی جگہ 'بنے بن' وغیرہ۔ ڈاکٹر حبیب ضیا نے اس سلسلے میں درج ذیل اشعار پیش کیے ہیں۔ جن میں مذکورہ بالا الفاظ کی تکرار دکنی زبان کی اس خاصیت پر روشنی ڈالتی ہے۔

رگے رگ بالے بال تے اوچہ نام
دھڑکتا نکلتا اچھے جم مدام
کرم کے بھار نئیں نکلے نہیں تو
گھرے گھر غلغلا ور زور ہوتا
دنڈلا کے دندے اے چھوڑ گھردا
ہو جنگلے جنگل فرار پکڑے
اگر تج سا سرو کئیں ھور ہوتا
بنے بن بلبلاں کا شعور ہوتا

2.2.5 دکنی میں الفاظ کی تکرار' حروفِ استدراک اور حروفِ تشبیہہ:

الفاظ کی تکرار کے سلسلے میں دکنی میں ''ے'' کے علاوہ ''ی''''ن'' کا بھی استعمال ہوتا ہے جیسے:

عشق نے کھیل کھیلیا ٹھارین ٹھار (ماخوذ دکنی زبان کی قواعد)

حروف عطف دو جملوں یا کلموں کو ملاتے ہیں۔ اُردو میں ''اور''''و''اور''یا'' حروف عطف ہیں۔ اُردو کے عام قاعدے کے مطابق ایک ساتھ دو حروف عطف نہیں آتے لیکن دکنی زبان کی یہ خاصیت ہے کہ اس میں بعض وقت دو حروف عطف آتے ہیں: جیسے

قدرعنا و ہور لٹکتا چال (محمد قلی)

اسی طرح ''و''اور''یا'' ایک ساتھ

ہمیں کیا جو ہمنا تے کچھ خیر ہو
اپس نفس پر حب و یا بیر ہو (نصرتی)

(دکنی زبان کی قواعد صفحہ 227-226)

حروف استدراك: دو جملوں کے درمیان حروف استدراک آتے ہیں۔ پہلے جملے میں جو شبہ ہوتا ہے' اسے یہ حروف دوسرے جملے میں رفع کر

دیتے ہیں۔ اُردو میں 'لیکن'۔ 'مگر' گرچہ' اور 'بلکہ' حروفِ استدراک ہیں۔ دکنی میں گو مذکورہ بالا حروفِ استدراک استعمال ہوتے ہیں لیکن خاص دکنی کے حروف استدراک ''ولے''۔ ''پن''۔ اور 'اما''

1۔ ''بعض کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کوں قیامت میں دیکھیں گے
ولے حیراں ہوئیں گے کہہ نا سکیں گے'' (وجہی)

2۔ ع ''بات جدا پن بھید و ہیچ (وجہی)

3۔ ع بتّی ساری تھی اماّ تیل نہیں تھا (ابن نشاطی)

حروف استثنا: یہ حروف ایک چیز یا شخص کو دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ اُردو میں ''بغیر' اور ''بجز'' ملتے ہیں۔ دکنی میں ان کے لیے 'بن'۔ 'بنا' اور 'باج' بھی ملتے ہیں جیسے:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا
(محمد قلی قطب شاہ)

یا

وہاں دوسرا نہ تھا کوئی علی باج
(وجہی)

تجھ بن اور نکوے نا خالق دوجا ہوئے

حروف تخصیص اُردو میں کئی ہیں، ہر' بھی' تو' ہی' لیکن جو دکنی کے لیے مخصوص ہیں وہ ''بھی'' کی جگہ ''بی'' جیسے

انو بی یو مخفی اسراریوں کتے ہیں اظہار

اُردو اور دکنی دونوں میں ''ہی' یہی' وہی استعمال ہوتے ہیں لیکن دکنی کا مخصوص حروف تخصیص ''چ'' ہے۔ یہ مرہٹی زبان کے اثر سے آیا ہے جیسے وے حیران ہوئیں گے کہہ نا سکیں گے کہ یونچہ ہے یا ایساچ ہے (وجہی) اسی طرح اتنا ہی کے لیے ''اتناچ'' ویسا ہی کے لیے ''ویساچ'' اپنا ہی کے لیے ''اپناچ'' تیرا ہی کے لیے ''تیراچ'' دکنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

حروف تشبیہ: ایک دوسرے کے مانند قرار دینے کے لیے آتے ہیں۔ اُردو اور دکنی میں 'مانند' سی'۔ 'سا' کے حروف آتے ہیں لیکن مخصوص دکنی کے حروف تشبیہ حسب ذیل ہیں:

''ناد''۔ ''دمن''۔ ''سار''

چلی پانی پہ کشتی باد کے سار
فلک کے نادکس جاگے پہ نا ٹھار
(ابن نشاطی)

کیا سکھ وطن واں عزیزاں کی سار
گیا دُکھ سو دندیاں نمن جگ تے بھار
(نصرتی)

رگ رگ وہ خوش روح نمنے سرس
جلگ دینے ہارا اتھا رنگ رس
(نصرتی)

اُردو میں پریشانی، حیرانی اور سرگردانی استعمال ہوتے ہیں لیکن دکنی میں پریشانی کی جگہ ''پریشانگی'' حیرانی کے لیے ''حیرانگی'' اور سرگردانی کے لیے ''سرگردانگی'' استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے

''لٹ کو اس کی پریشانگی پڑ، اس کی حیرانگی پڑ، اس کی سرگردانگی پر مہر آئی'' (وجہی)

دکنی اُردو اور اُردوئے قدیم دونوں کی لسانی خصوصیات ایک ہی تھیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں چونکہ قدیم اُردو تحریری شکل میں محفوظ نہیں رہ سکی اس وجہ سے جدید اُردو، قدیم اُردو سے بالکل الگ اور مختلف ہوگئی۔ اور آج دکنی اُردو کی لسانی خصوصیات ہی ہماری دسترس میں ہیں۔ لیکن اُردو زبان کے ارتقا کے تسلسل کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے قدیم اُردو کی لسانی خصوصیات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے یہاں دکنی اُردو کے ساتھ ساتھ قدیم اُردو کی لسانی خصوصیات کو بھی واضح کر دیا گیا ہے تاکہ ان حضرات کے سامنے جو دکنی اور جدید اُردو کو الگ سمجھتے ہیں اُردو زبان کے ارتقا کا نقشہ بھی آجائے۔ اور دکنی اُردو کی لسانی خصوصیات بھی واضح ہو جائیں۔

2.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ اُردو کی پیدائش شمالی ہند میں ہوئی، یہ بات مسلّمہ ہے۔ وہی اُردو بولنے والے دکن میں جب آباد ہوئے تو اس زبان کا فروغ دکن میں ہوا۔ اُردو کے نام، مقام کی مناسبت سے بدلتے گئے۔

☆ اُردو ہند میں پیدا ہوئی اس وجہ سے اسے ''ہندی'' بھی کہا گیا اور ہندوستان کی مناسبت سے ''ہندوی'' بھی کہلائی۔

☆ ابتدا میں اُردو کو ''ہندی'' اور ''ہندوی'' بھی کہا گیا۔ دہلی میں چوں کہ اس کو فروغ حاصل ہوا اس وجہ سے وہ ''زبان دہلوی'' بھی کہلائی اور جب وہ گجرات پہنچی تو ''گجری'' کے نام سے بھی وہ پکاری گئی۔

☆ جب وہ دکن آئی تو ''دکنی'' کہلائی۔ دکن کے بعد جب پھر وہ ادبی روپ اختیار کر کے شمالی ہند پہنچتی ہے تو ''ریختہ'' کہلاتی ہے۔ شاہی دربار میں پہنچی تو ''اُردوئے معلیٰ'' کہلائی۔ اس کا نام ''اُردو'' بہت بعد میں پڑا۔

☆ قدیم اُردو اور دکنی ایک ہی زبان تھی۔ اسی وجہ سے شمس اللہ قادری نے دکنی شعرا کا جب تذکرہ لکھا تو اسے ''اُردوئے قدیم'' کا نام دیا۔ دکنی اور قدیم اُردو کی لسانی خصوصیات ایک ہی ہیں۔ اس وجہ سے ہم دکنی کو قدیم اُردو اور قدیم اُردو کو دکنی کہیں تو ایک ہی بات ہوگی۔

☆ دکنی کی سب سے بڑی اور اہم خاصیت یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بہت قریب تھی۔ جیسا کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے

فخر دین نظامی کی زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس پر راجستھانی اور پنجابی کے علاوہ اَپ بھرنش روایات کا اثر بھی صاف طور پر نظر آتا ہے۔اور یوں دکنی زبان پر نواح دہلی کی کئی زبانوں کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

☆ اُردو سارے ہندوستان میں پھیل رہی تھی اسی وجہ سے صوفیا اور مذہبی پیشواؤں نے بھی اپنی تعلیمات اور تلقین کے لیے اسی زبان کو اپنایا۔ دکنی کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ اس میں سنسکرت کے بھی بہت سے الفاظ خالص شکل میں اور بدلی ہوئی شکل میں ملتے ہیں۔

☆ دکنی کے اسما' ضمائر' افعال اور حروف اپنی خاصیت رکھتے ہیں۔ گو یہ قدیم اُردو میں پائے جاتے ہیں لیکن جدید اُردو میں چوں کہ یہ بالکل نہیں ملتے اس لیے یہ دکنی اُردو کی لسانی خاصیت بن گئے ہیں۔

☆ شمالی ہند میں اصلاح زبان کی تحریکوں کی وجہ سے بھی دکنی اور جدید اُردو میں دوری پیدا ہوگئی سب سے پہلے مظہؔر جان جاناں نے یہ تحریک شروع کی' بعد میں حاتؔم اور پھر ناسخؔ نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کی وجہ سے وہ ہندوستانی الفاظ جو اُردو ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی استعمال ہوتے تھے وہ متروک قرار دیے گئے، جو الفاظ ان کی تحریکوں کی وجہ سے متروک ہوئے وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ یہاں ان میں سے چند دیے جا رہے ہیں:

☆ نین (چشم)' ساجن (معشوق)' جگ (دنیا)' پیا (معشوق)' من (دل)' دارو (دوا)' بنا (بن)' نئیں (نہیں)' تجنا اور (چھوڑنا) یہ تمام الفاظ دکنی میں استعمال ہوتے آئے تھے۔ ان کو ترک کرنے سے بھی دکنی یا قدیم اُردو اور جدید اُردو میں دوری پیدا ہوگئی۔

☆ شمالی ہند کے قدیم شاعروں کے پاس دکنی کی بہت سی لسانی خصوصیات ملتی ہیں۔ جیسے ''اں'' سے جمع بنانے کا قاعدہ' افضؔل' اور شیخ محبوب عالم کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اسی طرح اسما میں جمع کا صیغہ استعمال ہو تو افعال میں بھی جمع کا صیغہ استعمال کرنے کا قاعدہ میرؔ اور سوداؔ کے ہاں بھی ملتا ہے۔

☆ دکنی کی ایک اور لسانی خصوصیت یہ رہی ہے کہ ضمائر کے لیے اس میں جتنے الفاظ ملتے ہیں وہ شاید ہی کسی اور ہندوستانی زبان میں ملیں۔ ویسے اپے' ہمنا' ہمیں' تمنا' تمیں' یؤ' اے' یے' وو اس طرح بیسیوں الفاظ ملتے ہیں۔

☆ الفاظ کی تکرار سے بعض وقت تاکید' بعض جگہ مبالغہ' کبھی تعمیم اور کبھی کثرت کا مفہوم پیدا کیا جاتا ہے۔ دکنی کی خاصیت یہ ہے کہ ''ے'' لگا کر الفاظ کی تکرار کی جاتی ہے جیسے جنگل جنگل کی جگہ جنگلے جنگل' بال بال کی جگہ بالے بال' گھرے گھر' رگے رگ وغیرہ۔

☆ اسی طرح بعض حروف تشبیہ بھی خاص دکنی کے ہیں۔ مانند یا طرح کی جگہ ''ناذ'' تمنے' نمن اور سار' بعض حروفِ استدراک خاص دکنی کے ہیں۔ یہ حروف دو جملوں کے درمیان آتے ہیں پہلے جملے میں جو شبہ ہوتا ہے وہ دوسرے جملے سے رفع ہو جاتا ہے۔

☆ اُردو میں لیکن' مگر' گرچہ' بلکہ حروف استدراک ہیں۔ دکنی میں ان کے علاوہ' ولے' پن' اما ملتے ہیں اور یہ دکنی کے لیے مخصوص ہیں:

ولے حیراں ہوئیں گے کہہ نا سکیں گے (وجہؔی)

بات جدا پن بھید و یچ (وجہؔی)

بتی ساری تھی اما تیل نئیں تھا (ابن نشاطؔی)

☆ دکنی اُردو کی یہی لسانی خصوصیات ہیں جو اسے جدید اُردو سے الگ کرتی ہیں۔

2.4 کلیدی الفاظ

الفاظ		معنی
لسان	:	زبان، بولی
نحو	:	وہ علم جس سے کلمات کا جوڑنا، توڑنا اور ان کا باہمی تعلق معلوم ہو
میانے	:	میں
جاگہ	:	جگہ
غریب الفاظ	:	نامانوس الفاظ
صرف	:	وہ علم جس سے کلموں کی شناخت اور ادل بدل معلوم ہو
مونین	:	میری آنکھیں
دندی	:	دشمن
دینے ہارا	:	دینے والا

2.5 نمونہ امتحانی سوالات

2.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دکنی کا دوسرا نام کیا ہے؟

2۔ ''اردوئے قدیم'' کس کی تصنیف ہے؟

3۔ امیر خسرو نے اردو زبان کو کس نام سے یاد کیا؟

4۔ ''خیر المجالس'' کس کی تصنیف ہے؟

5۔ ''میگھ'' کس زبان کا لفظ ہے؟

6۔ ''ترلوک'' کے معنی کیا ہیں؟

7۔ ''بکٹ کہانی'' کس کی تصنیف ہے؟

8۔ ''بکٹ کہانی'' کا دوسرا نام کیا ہے؟

9۔ ''خالق باری'' کا مصنف کون ہے؟

10۔ ''وہی'' کو دکنی میں کیا کہا جاتا ہے؟

2.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دکنی زبان کی لسانی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ دکنی اور شمالی ہند کی اردو کے مشترک الفاظ کی نشاندہی کیجیے۔

3۔ دکنی میں سنسکرت الفاظ کی نشاندہی کیجیے۔

4۔ دکنی کے مخصوص الفاظ اور ضمائر کی وضاحت کیجیے۔

5۔ دکنی میں الفاظ کی تکرار، حروفِ استدراک اور حروفِ تشبیہہ پر مضمون لکھیے۔

2.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دکنی اور قدیم اردو کی مشترکہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ دکنی اردو کی اہم خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ دکنی کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسن خاں کے لسانی نظریے کو پیش کیجیے۔

2.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	مقدمۂ تاریخ زبان اردو	پروفیسر مسعود حسین خاں
2۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
3۔	دکنی زبان کی قواعد	ڈاکٹر حبیب ضیا
4۔	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ
5۔	اردو میں لسانیاتی تحقیق	پروفیسر عبدالستار دلوی

اکائی 3 : دکنی شاعری کی خصوصیات

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید
3.1 مقاصد
3.2 دکنی شاعری کی خصوصیات
3.2.1 دکنی شاعری کی عمومی خصوصیات
3.3 دکنی مثنوی کی خصوصیات
3.4 دکنی غزل کی خصوصیات
3.5 دکنی قصیدے کی خصوصیات
3.6 دکنی مرثیے کی خصوصیات
3.7 دکنی رباعی کی خصوصیات
3.8 اکتسابی نتائج
3.9 کلیدی الفاظ
3.10 نمونہ امتحانی سوالات
3.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
3.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
3.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

دکنی زبان میں شاعری کی نشو و نما کا زمانہ کم و بیش چار صدیوں کی طویل مدت پر محیط ہے۔ پندرھویں صدی کی ابتدا سے قدیم دکنی شاعری کے نمونے ملنے شروع ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ اٹھارویں صدی کے وسط بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ سترھویں صدی کو کلاسیکی دکنی شاعری کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے کیوں کہ اس عہد میں محمد قلی، وجہی، غواصی، نصرتی، ہاشمی اور ابن نشاطی جیسے جید شعرا پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے زرخیز تخیل، مہارت، زبان اور فکر و فن کے ذریعہ دکنی شاعری کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ کیا۔

سترھویں صدی سے قبل یعنی پندرھویں اور سولہویں صدی سے تعلق رکھنے والی دکنی شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں صوفی شعرا کی

منظومات کے علاوہ نظامی بیدری کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اور اشرف بیابانی کی مثنوی نوسر ہار قابل ذکر ہیں۔ اگر چہ ان مثنویوں میں ادبی عناصر بھی پائے جاتے ہیں لیکن اردو زبان کی تاریخ میں ان مثنویوں کو لسانی اعتبار سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، لیکن سترھویں صدی کے آتے آتے دکنی بولی کی سطح سے ترقی کر کے ادبی زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس عہد میں ایسے شعری کارنامے وجود میں آئے جن پر اردو زبان آج بھی بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔ جب ہم قدیم دکنی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زبان کی قدامت سے قطع نظر دکنی شاعری میں کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو اُسے مابعد زمانے کی شمالی ہند کی شاعری سے ممیّز کرتی ہیں۔ اس اکائی میں ہم دکنی شاعری کی عمومی خصوصیات و رجحانات کے علاوہ دکنی شاعری کی چار اہم اصناف یعنی مثنوی، غزل، قصیدہ اور رباعی کی امتیازی خصوصیات کا مطالعہ کریں گے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ دکنی شاعری کی عمومی خصوصیات اور رجحانات کی وضاحت کر سکیں۔
- ☆ دکنی مثنوی کی خصوصیات پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ دکنی غزل کے امتیازات کی نشاندہی کر سکیں۔
- ☆ دکنی قصیدے کی انفرادیت پر اظہار خیال کر سکیں۔
- ☆ دکنی مرثیے کی امتیازی خصوصیات پر گفتگو کر سکیں۔
- ☆ دکنی رباعی کے امتیازات اجاگر کر سکیں۔

3.2 دکنی شاعری کی خصوصیات

3.2.1 دکنی شاعری کی عمومی خصوصیات:

جب ہم دکنی شاعری کا بہ غور مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی چند امتیازی خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں جن میں سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت اس کی زبان کی سادگی ہے۔ دکنی شعرانے بیشتر اصناف سخن میں فکر وفن کے اعلیٰ نمونے پیش کیے لیکن ان فن پاروں میں انہوں نے جو زبان استعمال کی وہ عام بول چال کی زبان سے الگ نہیں ہے۔ دکنی شاعری کے ذخیرے میں فلسفیانہ افکار، عاشقانہ مضامین، بزم کی رونقیں، رزم کے معرکے، انسان کے نازک جذبات واحساسات غرض داخلی اور خارجی زندگی کے تمام پہلو ملتے ہیں لیکن کہیں مشکل زبان، پیچیدہ اظہار، بوجھل طرز بیان کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ محمد قلی، حسن شوقی، وجہی، غواصی، نصرتی ابن نشاطی وغیرہ کو گزرے صدیاں بیت گئیں لیکن انہوں نے جو زبان استعمال کی وہ بڑی حد تک آج بھی تلنگانہ، آندھرا پردیش، کرناٹک اور ٹامل ناڈو کے علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے البتہ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ قدیم دکنی کے بہت سارے الفاظ متروک ہو چکے ہیں، اور خود اہل دکن کے لیے نامانوس ہیں۔ لیکن دکنی الفاظ کا بڑا ذخیرہ محفوظ ہے اور آج بھی چلن میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم دکنی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ شاعری اپنے مزاج و ماحول اور مانوس لب ولہجے کے سبب دور حاضر کی شاعری کے مقابلے میں ہمیں زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔

دکنی ادیبوں اور شاعروں نے ہندوستانی زبانوں سے دل کھول کر استفادہ کیا اور ان زبانوں کے الفاظ کو جوں کا توں یا تلفظ میں تغیر کے

ساتھ اپنی بولی کا حصہ بنایا۔ دکنی تخلیق کاروں نے عوامی بولی کو تخلیقی زبان بنایا۔ وہ عوام کی ٹکسال سے الفاظ کے سکے حاصل کرتے اور عوام ہی کی بول چال، روزمرے، محاورے، ضرب الامثال، استعارے، کنایے اور تشبیہات کے نگینوں سے اپنی شاعری میں مرصع سازی کرتے تھے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ دکنی ادبا و شعرا معمولی پڑھے لکھے لوگ نہیں تھے۔ ان میں سے بیشتر علما تھے جنہیں اس دور میں ملاّ کہا جاتا تھا جیسے ملا وجہی، ملا غواصی، ملا نصرتی وغیرہ۔ وہ عربی اور فارسی پر عبور رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تو الفاظ کی صحت کا پورا خیال رکھ سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنی علمیت کی نمایش سے گریز کیا اور الفاظ کو اپنے اصل معنی و تلفظ کے بجائے انہیں معنوں اور اسی تلفظ کے ساتھ استعمال کیا جو عوام میں رائج تھے۔

زبان کے معاملے میں دکنی شعرا کا رویہ بالکل واضح اور ان کا نقطۂ نظر حقیقت پسندانہ تھا۔ وہ اپنی زبان کو نہ تو عربی اور فارسی آمیز بنانا چاہتے تھے اور نہ ہی سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے اسے بوجھل کرنا چاہتے تھے۔ احمد گجراتی اپنی مثنوی ''یوسف زلیخا'' میں کہتا ہے ''میں نے اس قصے میں بہت زیادہ عربی اور فارسی الفاظ استعمال کرنے سے گریز کیا ہے'':

عرب الفاظ اس قصے میں کم لیاؤں　　ضرور آپڑیا تو ملونی بھی کر

اسی طرح صنعتی اپنی مثنوی ''قصہ بے نظیر'' میں سنسکرت الفاظ کے زیادہ استعمال سے اجتناب برتنے کی بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''میں نے اس مثنوی میں سنسکرت کے کم سے کم الفاظ استعمال کیے ہیں اور دکنی زبان میں سنسکرت کے مطالب بیان کیے ہیں جنہیں سمجھنا آسان ہے''۔

رکھیا کم سہنسکرت کے اس میں بول　　ادک بولنے تے رکھیا ہوں امول
جسے فارسی کا نہ کچھ گیان ہے　　سو دکھنی زباں اس کو آسان ہے
سو اس میں سہنسکرت کا ہے مراد　　کیا اس تے آسانگی کا سواد
کیا اس تے دکھنی میں آسان کر　　جو ظاہر دسیں اس میں کئی کئی ہنر

دکنی شعرا نے افراط اور تفریط سے بچتے ہوئے درمیانی راہ اختیار کی۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ دکنی شاعری کو فارسی شاعری کے ہم پلہ کر دیں جیسا کہ نصرتی کہتا ہے: ع۔ دکن کا کیا شعر جوں فارسی

دکنی شعرا نے اپنے فکر و فن کے ذریعہ دکنی زبان کے امکانات کو بروئے کار لا کر اسے ابلاغ و ترسیل کی نئی بلندیوں سے ہم کنار کیا۔ زبان و بیان کو زیادہ صاف، سلیس، عام فہم اور رواں بنانے کے لیے انہوں نے جہاں ضرورت پیش آئی وہاں دوسری زبانوں سے الفاظ، لہجہ اور اسلوب بھی مستعار لیا لیکن ان کی پہلی ترجیح دکنی الفاظ ہوتے۔ چناں چہ ہاشمی اپنی مثنوی یوسف زلیخا میں کہتا ہے۔

اول قصد کر دکھنی بولی اوپر　　ضرور آپڑیا تو ملونی بھی کر

نصرتی کا بھی یہی خیال تھا کہ دکنی کی خصوصیات کو فارسی زبان کی خصوصیات سے ملا کر ایک نیا فنی معیار قائم کیا جائے۔ اسی لسانی امتزاج کو جس کی بدولت تخلیقی عمل میں دکنی زبان قوت اظہار کے نئے عروج پر پہنچتی ہے۔ نصرتی شعر تازہ کہتا ہے۔

دگر شعر ہندی کے بعضے ہنر　　نہ سکتے ہیں لیا فارسی میں سنور
میں اس دو ہنر کے خلاصے کوں پا　　کیا شعر تازہ دونوں فن ملا

دکنی شعرا ایک تو یہ چاہتے تھے کہ دکنی فارسی اور سنسکرت سے بوجھل نہ ہونے پائے تا کہ عام لوگ بھی ادب سے لطف اندوز ہو سکیں، دوسرے

وہ سلاست، ربط اور فنکاری کو شاعری کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں وجہی اپنی مثنوی قطب مشتری میں کہتا ہے:

کتا ہوں تجے پند کی ایک بات — کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات
جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس — بھلا ہے جو ایک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس کیرے بات میں — پڑیا جائے کیوں جزلے کر ہات میں
جسے بات کے ربط کا فام نئیں — اسے شعر کہنے سوں کچ کام نئیں

سلیس کے لغوی معنی ہیں آسان، رواں، ہموار۔ وہ عبارت جس میں ثقیل الفاظ نہ ہوں، یا ایسے اشعار جن میں مشکل الفاظ نہ ہوں۔ دکنی شعرا کی نظر میں شاعری کا معیار سلاستِ بیان تھا جس پر وجہی کے علاوہ دیگر شعرانے بھی زور دیا ہے۔ چنانچہ ہاشمی کہتا ہے:

سلیس بول قصہ، ہے گر ہوش مند — سلیس کوں کریں عاقلاں سب پسند
سلیس بولنا باریکی کا ہے کام — سلیس کوں تو عزت ہے جگ میں تمام

دکنی شعرا ہیئت و مواد اور لفظ و معنیٰ دونوں کو مساوی اہمیت دیتے تھے۔ وہ ان کی دوئی کے قائل نہیں تھے۔ الفاظ کے حسن اور اظہار کی خوبی کے ساتھ وہ بیان میں زور اور جذبے میں شدت کو ضروری سمجھتے تھے تاکہ بات سننے والوں کے دل میں اتر جائے ان کے جذبات و احساسات میں حرکت پیدا کرے اور وہ پھڑک اٹھیں، وجہؔی کہتا ہے:

وو کچ شعر کے فن میں مشکل اچھے — کہ لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے
اگر فام ہے شعر کا تج کوں چھند — چنے لفظ لیا ہور معنی بلند
رکھیا ایک معنی اگر زور ہے — ولے بھی مزا بات کا اور ہے
اگر خوب محبوب جیوں سورہے — سنوارے تو نور علی نور ہے
ہنر مشکل اس شعر میں یوچ ہے — کہ تھوڑے اچھیں حرف معنی سولئے
دیوانا ہوں میں اس رنگی بات کا — کہ ہر دل میں جیو ہو کرے ٹھار آ
کہاں بات وو چنچل ہور چلبلی — کہ دل کوں نھواں سو کرے گدگلی
سخن گو وہی جس کی گفتار تھے — اچھل کر پڑے آدمی ٹھار تھے

اسی کے ساتھ ذاتی فکر اور اُپج پر بھی زور دیتے ہیں اور گھسے پٹے خیالات کو دہرانے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔

نکو بول مضمون تو، ہور کا — کہ کالا ہے دو جگ میں موں چور کا
جو کرتا یکس کا ہنر دیک کر — ہنر وند اسے نئیں کتے ہیں ہنر
ہنر وند اس کوں کھیا جائے گا — جکوئی اپنے دل تے نیا لیائے گا

وہ شاعری کے لیے بچن کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ شاعری دین و دنیا دونوں کے لیے ناگزیر ہے اور اس کا ہر کس و ناکس خاص و عام محتاج ہے۔

قلم کاف اور نوں تے جونکلیا بھار سو پہلے بچن کوں کیا آشکار
بچن عرش کرسی پو تھے دھائے ہیں بچن آدمی کے بدل آئے ہیں
بچن تے ہوئی نام نیکی بدی بچن تے ہوئے منتہی ، مبتدی
بچن تے چلے دین و دنیا تمام بچن کے ہیں محتاج سب خاص و عام

اوپر کی مثالوں سے دکنی شاعروں کا نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ وہ شاعری کو ایک اہم اور ضروری فن بتلاتے ہیں، جس کے بغیر دین و دنیا کا کوئی کام ممکن نہیں۔ چوں کہ شاعری کو وہ ایک اہم اور ناگزیر فن اور انسانیت تک پیام پہنچانے کا ذریعہ سمجھتے تھے' اس لیے وہ چاہتے تھے کہ شاعری کی زبان' اس کا اسلوب اور اس کا لہجہ عام فہم ہوتا ہے کہ عام آدمی اس پیام کو سمجھ سکے۔ اس لیے انہوں نے فن کار پر یہ پابندی عائد کی کہ جو بات کہے اس انداز میں کہے کہ سننے والا چونک اٹھے اور بات اس کے دل میں اتر جائے۔

دکنی ادب کی ایک اور نمایاں خصوصیت اس کی حب الوطنی ہے۔ طبعی کہتا ہے ۔

جو کوئی یاد کرتا نیں اپنا وطن او مردا ہے پیرن ہے اس کا کفن
اگر کوئی غربت میں شاہی کرے اگر مال ہور ملک' لاکھاں دھرے
اپس کوں دیکھے کھول کر جوں انکھیاں دیوے خاک تن کا وطن کا نشاں
وطن سب کوں دنیا میں پیارا اہے سفر ہے سو جوں باد بارا اہے

اور یہ جذبہ دکھن کے ہر ادب پارے کی روح میں رچا بسا ہے۔ وجہی قطب مشتری کے ہیرو کی زبان سے اپنے دیس تلنگانہ کی یوں تعریف کرواتا ہے ۔

دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں پنچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ
دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
دکھن ملک بھوتیچ خاصا اہے تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

اردو شاعری پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اس کی فضا بدیسی ہے۔ اس میں گل و بلبل' لیلیٰ مجنوں' شیریں اور فرہاد کے بدیسی تذکروں کے سوا کچھ نہیں۔ رام اور کرشن' دروپدی اور سیتا کا ذکر تک نہیں ملتا۔ مور کی چنگھاڑ' کوئل کی کوک اور پپیہے کی پیہو پیہو سے اردو ادب کے نغمے نا آشنا ہیں۔ اور یہ اعتراض کسی حد تک درست بھی ہے۔ لیکن دکھنی ادب میں ان عناصر کی کمی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دکھنی ادب کی فضا' اس کا مزاج اور اس کی روح سرتا سر ہندوستانی ہے اور اس پر مقامی زندگی کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

دکنی ادب کا بڑا حصہ مسلسل نظموں اور مثنویوں پر مشتمل ہے' جن کی قابل لحاظ تعداد یا تو ترجمہ ہے یا ماخوذ لیکن دکنی فن کاروں نے ان قصوں کو اپنا لیا ہے اور اظہار پر بدیسی اثر کی پرچھائیں تک پڑنے نہیں دی ہے۔ بزم اور رزم کے نقشے' خلوت اور جلوت کے خاکے' رہن سہن کے طریقے' طرز معاشرت' آداب' ماحول' فضا' کرداروں کی نفسیات' ان کا مزاج' طرز فکر غرض کہیں بدیسی رنگ نہیں ملے گا۔

سلطان محمد قلی دکنی کا بہت بڑا شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں اُپج، شگفتگی، تنوع کے علاوہ واقعیت حقیقت پسندی کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے ہاں سماجی زندگی بھرپور انداز میں ملتی ہے۔ زندگی کے روزمرہ کے واقعات، عیدوں اور تہواروں کے خاکے، سماجی تقریبات کے نقشے، بسنت، نوروز، محرم، مرگ، برسات، میلے، مہندی، سانچق، جلوہ، جلوے کی گھڑیاں، سالگرہ، نٹوں کے کرتب، کھیل۔ پھوکڑی پھوٗ ڈھان ڈھکنی وغیرہ پھلوں ترکاریوں، پھولوں، محلوں غرض ہر موضوع پر اس کے ہاں نظمیں ملیں گے۔ ان میں شخصی عنصر یا زیادہ ضرور ہے۔ لیکن جہاں تک موضوعات کے تنوع کا تعلق ہے۔ نظیر کے علاوہ اردو کا کوئی دوسرا شاعر اس سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔ ہم بڑی حد تک اس دور کی تہذیبی تاریخ کا پتہ سلطان محمد قلی کی شاعری سے چلا سکتے ہیں۔

دکنی ادیبوں کے ہاں گل وبلبل، سروشمشاد، لالہ و یاسمن کے ساتھ کنول، چنپا، کیوڑا، گیند، سیوتی، جوہی، بگلہ، بطخ، قاز، مینا، پپیہا، مور، کوئل، بسنت، دھپ کالا، ٹھنڈ کالا کا ذکر بھی ملتا ہے ان کے ہاں شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں کے ساتھ رام اور سیتا، کرشن اور رادھا کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔

ہر ایک گوپنی شہ کی جوں ماہ ہے — کہ اس دور کا کشن او شاہ ہے
ہندو میں کہاں اور ترک توں کہاں — کہاں رام سیتا مورک تو کہاں
سہاتی ہے دھن شاہ خوش فام سوں — کہ گمتی ہے سیتا مگر رام سوں

لیکن جب اردو شاعری کا شمال میں آغاز ہوا تو یہ عنصر دھیرے دھیرے کم ہوتا گیا۔ شمال کے شاعروں میں دکنی ادب کی روایات کو بھلا دیا اور فارسی شاعری کی پیروی اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری پر متذکرہ بالا اعتراض کیا جاتا ہے۔

3.3 دکنی مثنوی کی خصوصیات

اردو مثنوی کے آغاز وارتقا کا تحقیقی جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو شاعری کی اس اہم صنف کا آغاز دکنی زبان میں ہوا۔ دکنی زبان میں چھوٹی بڑی بکثرت مثنویاں لکھی گئیں۔ یہ صنف دکنی شعرا میں نہایت مقبول تھی کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اولاد سے آدمی کا نام چند پشتوں تک چلتا ہے لیکن مثنوی کی بدولت اس کا نام ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار کا شاعر عبدل ''ابراہیم نامہ'' میں بادشاہ کی زبانی کتاب (شاعری) کی اہمیت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

نوی بات مضمون کر ایک کتاب — نہ کس فکر گندیا ہے تس کا جواب
نہ باقی رہے کچھ تو عالم نشاں — اگر کچھ رہے تو بچن شعر جان
شعر شاہو کا تو سو ہے یادگار — رکھے ناؤں عالم میں جیوتا قرار
کہ جو تلکوں دنیا رہے کہ منڈان — پھرے شعر تلکوں ہو عالم نشان

اسی طرح صنعتی اپنی مثنوی قصہ بے نظیر میں کہتا ہے:

نہیں جگ میں جینا کسے پائدار — مگر او کہ جس تے رہے یادگار
رہنا ناوں باقی، بڑا کام ہے — جویاں ہیں جو کئی جگ میں گمنام ہے
سدا زندگانی اُسے ہے شرف — جو دنیاں میں اس تے رہے یک خلف

کہ اس بعد روشن کرے انجمن　　　خلف خوب روشن سو ہے خوش سخن

جو بولے ہیں یوں عارفان سلف　　　کہ ہے شعر بہتر سوں بہتر خلف

دکنی شعرا نے مثنوی کی روایت فارسی شاعری سے مستعار لی۔ فارسی میں عشقیہ، رزمیہ، اخلاقی، حکیمانہ غرض ہر قسم کی مثنویاں موجود ہیں۔ فارسی کی تقلید میں دکنی شعرا نے بھی اس صنف کی ہیئتی و موضوعاتی وسعت اور سہولت سے استفادہ کرتے سیکڑوں مثنویاں بیسوں موضوعات پر لکھی ہیں جن کی تفصیل آگے دی جائے گی۔

دکنی مثنویوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے موضوعات میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ موضوعات میں اس قدر تنوع اور رنگا رنگی شمالی ہند کی مثنویوں میں نظر نہیں آتی۔ ذیل میں دکنی مثنویوں کے موضوعات اور ان موضوعات پر مبنی اہم مثنویوں کے نام دیے گئے ہیں:

مذہبی مثنویاں: ان میں فقہی مسائل بیان کیے گئے ہیں جیسے ضعیفی کی مثنوی ہدایت ہندی، شاہ ملک کی احکام الصلواۃ، صنعتی کی گلدستہ عاجز کی قصہ ملکہ مصر قطب رازی کی تحفۃ النصائح، فراقی بیجاپوری کی مراۃ الحشر وغیرہ۔

صوفیانہ مثنویاں: ان میں تصوف و معروفت کے مسائل کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے جیسے خوش نامہ، خوش نغز، شہادت التحقیق (میراں جی شمس العشاق) ارشاد نامہ (برہان الدین جانم) من لگن (بحری) وغیرہ۔ دکنی زبان میں صوفیانہ مثنویاں اس کثرت سے لکھی گئی ہیں کہ شمالی ہند میں ان کی عشر عشیر بھی نہیں لکھی گئیں۔

مذہبی قصے: یہ ایسی مثنویاں ہیں جن میں مذہبی روایات پر مبنی قصے یا واقعات پیش کیے گئے ہیں مثلاً قصہ بے نظیر (صنعتی) یوسف زلیخا (احمد گجراتی) معراج نامہ (بلاقی)) قصص الانبیا (قدرتی) وفات نامہ (دریا) معراج نامہ (مختار) شمائل نامہ (عبدالحمد ترین) معجزہ فاطمہ (محبّ) وغیرہ۔

تاریخ وسوانح: دکنی شاعری کا ایک اہم موضوع تاریخ اور سوانح بھی رہا ہے۔ اس زمرے میں خصوصاً عبدل بیجاپوری کی مثنوی ابراہیم نامہ، نصرتی کی علی نامہ اور تاریخ اسکندری فیروز کی پرت نامہ، افضل کی مثنوی محی الدین نامہ، مومن کی اسرار عشق وغیرہ اہم ہیں۔

عشقیہ: دکنی میں عشق و محبت کی داستانوں پر مبنی متعدد مثنویاں لکھی گئی ہیں جیسے قطب مشتری (وجہی) سیف الملوک و بدیع الجمال (غواصی) ماہ پیکر (جنیدی) رضوان شاہ و روح افزا (فائز) بہرام و گل اندام (طبعی) لیلی مجنوں (محمد عاجز) وغیرہ۔

رزمیہ: دکنی شاعری کا ایک اہم جز رزمیہ مثنویاں ہیں۔ دکنی شعرا نے جنگوں اور محاربات کی تفصیلات پر مبنی رزمیہ مثنویاں لکھیں۔ اس قبیل کی مثنویوں میں رستمی کی مثنوی خاور نامہ، نصرتی کی مثنوی علی نامہ، حسن شوقی کی مثنوی فتح نامہ نظام شاہ، لطیف کی مثنوی ظفر نامہ، سیوک کی مثنوی جنگ نامہ، غضنفر کی مثنوی جنگ نامہ عالم علی ں خاں، حسن علی عزت کی مثنوی اضراب سلطانی وغیرہ شامل ہیں۔ دکنی زبان میں متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں۔ بعض بزمیہ مثنویوں میں رزمیہ حصے بھی بڑے معرکے کے لکھے گئے جیسے مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال اور مثنوی پھولبن میں رزمیے حصے بڑی فنی مہارت سے لکھے گئے ہیں۔ دکنی کے مقابلے میں شمالی ہند کی اردو میں بہت کم رزمیہ مثنویاں لکھی گئی ہیں۔

دکنی کے مثنوی نگار شعرا نے طبع زاد مثنویاں لکھیں لیکن اس کے علاوہ انہوں نے اپنی مثنویوں کے قصے یا مواد کے لیے دوسری زبانوں سے بھی استفادہ کیا۔ دکنی مثنویوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دکنی شعرا نے تین طرح کے ماخذ سے اپنی مثنویوں کا مواد اخذ کیا۔ (1) ہندوستانی قصے

(2) فارسی اور عربی قصے (3) مقامی روایات۔ ہندوستانی قصوں سے استفادہ کر کے دکنی شعرا نے متعدد بلند پایہ مثنویاں لکھی ہیں جن میں کدم راو پدم راو (نظامی) طوطی نامہ (غواصی) مینا ستونتی (غواصی) گلشن عشق (نصرتی) دیپک پتنگ (سید محمد عشرتی) نیہ درپن (سید احمد ہنر) پدماوت (غلام علی) وغیرہ شامل ہیں۔ دکنی شعرا نے ان مثنویوں میں سنسکرت سے راست ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ سنسکرت قصوں کے فارسی تراجم سے استفادہ کیا ہے۔

فارسی مثنویوں، نثری قصوں اور عربی داستانوں سے بھی دکنی شعرا نے بیش از بیش استفادہ کیا اور متعدد عجمی و عربی داستانوں کو دکنی مثنویوں کے پیکر میں پیش کیا۔ فارسی سے ترجمہ کی گئی ان مثنویوں کو دکنی شعرا نے اس خوبی سے ترجمہ کیا ہے کہ ان پر طبع زاد اور اپجی ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اس زمرے کے تحت مثنوی جنت سنگھار (ملک خوشنود) خاور نامہ (کمال خاں رستمی) بہرام و بانوے حسن (دولت اور امین) بہرام وگل اندام (طبعی) یوسف زلیخا (احمد گجراتی) قصہ بے نظیر (صنعتی) اور لیلیٰ مجنوں (عاجز) قابل ذکر ہیں۔ مثنوی 'پھولبن' میں ابن نشاطی نے ہندوستانی اور عجمی (فارسی) روایات کو یکجا کیا ہے۔ اس میں قصہ در قصہ کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے ابن نشاطی نے ایک ہندوستانی اور دو فارسی قصوں کو جوڑا ہے۔

دکنی شعرا نے مقامی روایات کو بھی موضوع بنا کر مثنویاں لکھی ہیں جیسے چندر بدن اور مہیار کے عشق کی مقامی داستان کو مقیمی نے مثنوی کی شکل دی اور ''چندر بدن و مہیار'' کے نام سے خوب صورت مثنوی لکھی اسی طرح والہ موسوی نے طالب اور موہنی کی داستان محبت کو جو دکن میں نہایت مقبول ہے مثنوی کی شکل میں نظم کی اور اس کا نام ''طالب و موہنی'' رکھا۔

دکنی میں طبع زاد عشقیہ داستانیں کم لکھی گئی ہیں۔ بیشتر مثنویاں فارسی مثنویوں یا نثری قصوں سے ماخوذ ہیں۔ البتہ وجہی کی مثنوی قطب مشتری، اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کا قصہ وجہی کا طبع زاد ہے۔ اسی طرح عبدل کی مثنوی 'ابراہیم نامہ' جو بیجاپور کے حکمران ابراہیم عادل شاہ ثانی کے حالات و معمولات پر مبنی ہے طبع زاد مثنوی ہے۔ اس کے علاوہ نصرتی کی علی نامہ اور حسن شوقی کی فتح نامہ نظام شاہ بھی طبع زاد مثنویاں ہیں۔ دکنی کی بیشتر صوفیانہ مثنویاں طبع زاد ہیں جیسے میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ، شاہ داول، فیروز وغیرہ کی متصوفانہ مثنویاں طبع زاد ہیں لیکن بعض صوفیانہ مثنویاں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں جیسے ایاغی کی مثنوی ''نجات نامہ''، شغلی کی مثنوی ''پند نامہ'' وغیرہ۔

اردو مثنوی کا ڈول دکن میں ڈالا گیا اور اس کا کینڈا بھی دکن ہی میں متعین ہوا۔ دکنی میں لکھی گئی ان مثنویوں کی بہت سی خصوصیات ہیں جو انہیں شمالی ہند کی مثنویوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ دکنی مثنویوں کی ابتدا احمد، نعت، منقبت، مدح سلطان وغیرہ سے کی جاتی ہے۔ دکنی شعرا نے ان اجزا کی روایت فارسی مثنویوں سے لی۔ دکنی مثنویوں پر فارسی کا اثر اس قدر گہرا تھا کہ بعض مثنویوں میں ابواب کے عنوانات بھی فارسی زبان ہی میں ہیں۔ تاہم شعر شاعری کی تعریف کے ابواب جیسے 'در باب سخن'، 'در مدحِ شعر' وغیرہ دکنی شعرا کی جدت طبع کی دین ہیں۔ یہ ابواب فارسی مثنویوں میں نہیں ملتے۔

دکنی مثنویوں کی ابواب بندی میں بھی ایک خاص تکنیک اور جدت برتی گئی ہے وہ یہ کہ بعض مثنویوں میں (1) ابواب کی سرخیاں (عنوانات) بھی منظوم ہوتی ہیں۔ (2) سرخیوں کے اشعار کا وزن مثنوی کے اشعار کے وزن سے الگ ہوتا ہے۔ سرخیوں کے تمام اشعار ایک ہی بحر میں لکھے گئے ہیں اور ان میں قافیے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یعنی یہ اشعار قصیدے کے اشعار کی طرح ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ عنوان کا ہر شعر اس باب کے مطالب کی طرف اشارہ کرتا ہے اور انہیں اس کمال ہنرمندی سے لکھا جاتا ہے کہ اگر عنوان کے اشعار کو جوڑ لیں تو ایک قصیدہ تیار ہو جاتا ہے جس سے مثنوی کے مطالب کا خلاصہ سامنے آتا ہے۔

مثنوی میں بیان کیا گیا قصہ اور اس کے کردار خواہ ہندوستانی ہوں جیسے کدم راو پدم راو، گلشن عشق، چندر بدن و مہیار وغیرہ کے کردار یا عربی اور

ایرانی مثلاً یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں وغیرہ کے کردار مثنوی کا ماحول اور فضا ہندوستانی بلکہ خالص دکنی ہوتی ہے۔ان مثنویوں کے سماجی اور تہذیبی پس منظر کو اجاگر کرنے میں مقامی آب و رنگ اور دیسی عناصر کی کارفرمائی اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہوتی ہے کہ ان کی مدد سے دکنی تہذیب وثقافت کی تاریخ مرتب ہوسکتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دکنی شاعر زندگی کی عام اور خارجی اشیا سے زیادہ اعتنا برتتا ہے۔

مثنوی دکنی شعرا کا نہایت مرغوب اور پسندیدہ ہیتی سانچہ رہا۔بہمنی دور سے لے کر زوال بیجاپور وگولکنڈہ، بلکہ اس کے بعد بھی طویل عرصے تک دکنی شاعری میں مثنوی کو نمایاں اور ممتاز مقام حاصل رہا۔دکن میں متوسط درجے کے شعرا سے لے کر نظامی، حسن شوقی، وجہی، غواصی، نصرتی، ہاشمی اور ابن نشاطی جیسے بلند مرتبت شعرا نے اس شعری صنف کو نکھارنے اور ابھارنے میں اہم حصہ لیا اور اس میں فکر وفن کے درخشاں نمونے اپنے یادگار چھوڑے۔دکنی مثنویوں کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں تقریباً وہ تمام فنی خصوصیات موجود ہیں جو مثنوی کے لیے ضروری ہیں جیسے اشعار میں ربط وتسلسل، سلاست اور روانی، کردار نگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، مکالمہ، الفاظ کی مناسبت، صنائع وبدائع کا خلاقانہ استعمال، محاوروں اور ضرب الامثال کی برجستگی وغیرہ غرض جس پہلو سے دیکھیے دکنی مثنویوں میں جلوہ صدرنگ کی نمود دکھائی دیتی ہے۔

3.4 دکنی غزل کی خصوصیات

دیگر اصناف سخن کی طرح غزل بھی فارسی کے زیر اثر دکنی شاعری میں آئی۔ابتدائی دور میں دکنی شعرا کے یہاں غزل کو وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو اسے بعد میں نصیب ہوئی۔اس دور میں مثنوی ہی کا زیادہ زور تھا۔غزل کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔رفتہ رفتہ مثنوی کا اثر کم ہوتا گیا اور دکنی شعرا نے غزل کی طرف پوری توجہ کی اور اس صنف میں بھی بہترین نمونے یادگار چھوڑے۔دکنی شعرا میں بعض تو صاحب دیوان غزل گو تھے۔سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔عبداللہ قطب شاہ اور غواصی کے دیوان بھی دستیاب ہوئے ہیں۔بیجاپور کے سلطان علی عادل شاہ ثانی کا بھی ایک کلیات موجود ہے۔شاہ سلطان ثانی، قاضی محمود بحری، ولی اور سراج صاحب دیوان شعرا ہیں۔ان کے علاوہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے اکثر شعرا نے غزلیں کہیں ان میں خاص طور پر حسن شوقی، وجہی، نصرتی، ہاشمی، دہدار فانی، ایاغی، شغلی وغیرہ شامل ہیں۔دکنی غزل کئی جہتوں سے اپنے بعد کی شمالی ہند کی غزل سے مختلف ہے۔ذیل میں دکنی غزل کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دکنی شعرا نے اپنے ماحول اور اپنی مخصوص معاشرت کے پس منظر میں غزل کو ایک نیا مزاج عطا کیا۔ایرانی شعرا کی آواز میں دکنی شاعروں نے اپنی آواز اس طرح شامل کردی کہ دونوں آوازوں کے مدغم ہونے سے ایک نئی لے پیدا ہوئی اور غزل کو نیا لب ولہجہ اور نیا رنگ وآہنگ ملا۔

بہمنی دور کے جن غزل گو شعرا کا کلام ہم تک پہنچ سکا ہے ان میں فیروز شاہ بہمنی مشتاق اور لطفی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔بہمنی دور میں دکنی زبان کی سرپرستی اور قدردانی نے اردو شاعری کے لیے راہ ہموار کی اور محل سراؤں کے رنگین وپرکیف ماحول میں غزل کو پھلنے پھولنے کا موقعہ ملا اور اسی دور میں غزل کی باقاعدہ اور منظم کوششوں کا آغاز ہوا۔دکن کے ان اولین غزل گو شعرا کا لب ولہجہ ان کے موضوعات اور جذبات واحساسات میں فطری انداز نمایاں ہے۔ان شعرا کے فن پر تصنع کی ملمع کاری نظر نہیں آتی۔صوری اعتبار سے اس دور کی غزلیں موجودہ دور کی غزلیات کے مقابلے میں ان گھڑ اور پرکاری سے بے نیاز نظر آتی ہیں،جس طرح انسان تاریخ کے ابتدائی دور میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتا اور اپنی ضروریات کی تکمیل میں بھی سیدھا سادہ اور فطری انداز اختیار کرتا ہے اسی طرح ہر ادب میں دور آغاز کے شعرا بھی اپنی ادبی تخلیقات میں سادگی، سچائی اور حقیقت پسندی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور فطرت سے اپنے وجود کا رشتہ منقطع کرنے کے متمنی نظر نہیں آتے ہیں۔پرکاری، تزئین اور فنی لوازم کے تصورات عہد آغاز

میں اپنی جھلک نہیں دکھاتے ۔ یہ دور مابعد کا تقاضہ اور فطری عمل ہیں ۔ یہ نشو ونما اور ترقی کی علامت ہوتے ہیں اس لیے ابتدائی دور کے شعرا سے اس کی توقع نہیں کی جا سکی ۔

اس دور کی غزلیں اپنے عہد کے مخصوص تصورات و معتقدات اور جذبات و احساسات کی ترجمان ہیں اور ان کا عکس اس دور کے شعرا کے علائم اور استعارات وغیرہ میں نمایاں ہے ۔ مشتاق کہتا ہے۔

رقیب او دیوجیوں جب تب پری کے سات یوں آتا
کہ پھولاں سات کانٹا ہور شکر میانے کنکر آوے

غزل کی تشبیہات و استعارات فطرت سے ماخوذ نظر آتے ہیں ۔ ہر شاعری کے ابتدائی دور میں فنکار فطرت سے قریب اور تصنع سے دور نظر آتا ہے ۔ یہ تشبیہات و استعارات مظاہر قدرت سے ان کی ہم آہنگی اور قرب کے غماز ہیں۔

تجہ کیس گھنگھرو والے بادل پٹیاں ہیں کالے
تس مانگ کے اجالے بجلیاں اٹھیاں گگن میں
انکھیاں اُپر ہے بال یا پنجرے منے کھنجن رہیا
یا جال میں مچھلی ہے یا بادل میں سیارہ دسے

مشتاق اور لطفی کی غزل سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ یہ قدیم اردو کے اولین نمونے نہیں ہو سکتے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے پیشرو شعرا نے صنف غزل میں طبع آزمائی کی تھی ۔ اس کی صورت گری نشو ونما اور اسے مانجھنے سنوارنے اور پختگی عطا کرنے میں وہ اپنا رول بڑی خوبی کے ساتھ ادا کر چکے تھے ورنہ لطفی اور مشتاق کی غزلیں صوری اور معنوی اعتبار سے اس حیثیت کی حامل نہ ہوتیں ۔ محمود ملا خیالی اور فیروز کی شاعری اس عہد میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ ان شعرا کا ایک ادبی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اسالیب طرز ادا' بحور' لب و لہجے بندش تراکیب اور ترسیل کے پیکروں کو عجمی سانچوں میں ڈھال کر نئی روایات کی داغ بیل ڈالی ۔

گولکنڈے میں احمد گجراتی' محمد قلی قطب شاہ وجہی' غواصی' ابن نشاطی اور عبداللہ قطب شاہ وغیرہ نمائندہ غزل گو شاعر تھے ۔ ان شعرا نے اپنے دور کی ثقافت اور اپنے ماحول کی سچی اور پرخلوص ترجمانی کی ہے اور اپنے زمانے کی تہذیب و معاشرت کی بڑی متحرک تصویریں پیش کر دی ہیں ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں حالی نے جس اصلیت اور سادگی پر زور دیا تھا اس کے نقوش پہلے پہل دکنی ادب میں ابھرتے نظر آتے ہیں ۔ دکن کے غزل گو شعرا نے ہندوستان کی مخصوص فضا' یہاں کے سبزہ زاروں' قدرتی مناظر' پھلوں' باغوں' نہروں اور یہاں کی مجلسی زندگی کی بڑی اچھی مصوری کی ہے ۔ شعرائے بیجاپور میں معظم' شاہی اور نصرتی وغیرہ نے مثنوی قصیدہ اور مراثی وغیرہ کے علاوہ غزل گوئی میں بھی کمال حاصل کیا اور صنف غزل کو وسیلہ اظہار بنایا۔

گولکنڈے اور بیجاپور کے غزل گو شعرا کے یہاں ہندوستانی رنگ صرف زبان ہی سے نہیں جھلکتا بلکہ خیال اور طرز فکر میں بھی اس کا پرتو نظر آتا ہے ۔ شعرائے دکن نے گرد و پیش کی ہندوستانی معاشرت کی بڑی کامیاب عکاسی ہے ۔ انہوں نے دیوالی کے دیوں کو ایران کے لالہ زاروں پر ترجیح دی اور وطن سے اپنی ذہنی اور جذباتی وابستگی کا ثبوت دیا ۔ شعرائے دکن نے فارسی غزل کا چربہ اتارنے کے بجائے فارسی غزل کی ہیئت کو سامنے رکھ کر اردو میں غزل گوئی کا کامیاب تجربہ کیا اور فارسی اور ہندوی کی دونوں زبانوں کے موضوعات ان کے معیاروں اور طرز فکر کو غزل میں سمونے کی

کوشش کی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض جگہ فارسی اور ہندی عناصر کی آمیزش کی کوشش زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غزل کا خمیر اٹھانے اور اس کی بنیادیں تعمیر کرنے کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ اسی ہندوستانی عنصر کی بدولت فارسی کی دریوزہ گری ترک کر کے اردو غزل ایک علاحدہ اکائی کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہندوستانی تصورات، ہندوستانی فضا اور ہندوستانی معاشرت کی عکاسی دکنی غزلوں میں مقامی رنگ کے اچھے نمونے پیش کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جن میں نہ صرف فضا اور ماحول ہندوستانی ہیں بلکہ طرز فکر اور انداز نظر پر بھی ہندوستانیت کی چھاپ نمایاں ہے۔

پل پل کوں دل منے میرے نس دن سوتوں بسے　　جوں برہمن کے من میں سدا رام رام ہے

حال یکساں نہیں کہ جیوں جمنا　　گہہ بہوں پور گہہ اتر جاؤں

دکنی معاشرت دکنی رہن سہن، لباس، زیورات اور دکنی تہذیب کی بہت سی خصوصیات کی ان شعرانے موثر ترجمانی کی ہے آج جب ہم صدیوں پرانی اس تہذیب کے نقوش دیکھنا چاہتے ہیں اور اس عہد کے لوگوں کے جذبات وتصورات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اور اصناف کے ساتھ ساتھ غزل کے نمونے بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ جب تک ہم اس عہد کے مخصوص مزاج کو نہ سمجھیں اس دور کے ادب سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

محمد قلی قطب شاہ عبداللہ قطب شاہ، ابراہیم عادل شاہ اور علی عادل شاہ ثانی کی شاعری کے موضوعات، معاملات حسن وعشق، تجربات محبت کی رنگین داستانوں اور حسن کی قربت اور اس کے گونا گوں جلوؤں کی سحر آفرینی سے متعلق ہیں۔ ان کی شاعری میں رنگینی وشگفتگی، زندگی کی مسرتوں میں ڈوب جانے کا رجحان اور ایک طربیہ لے ملتی ہے جو محبت کی کامرانی وسرشاری کی ترجمان ہے۔ افسردگی، قنوطیت، سوز وگداز اور خستگی وگداختگی ان کی غزل گوئی کا رجحان نہیں۔

ملک خوشنو، حسن شوقی، نصرتی، غواصی اور وجہی جیسے سخن گستر درباروں سے وابستہ تھے اور اس رنگین وپر فضا ماحول نے ان کے شعری ذوق اور جمالیاتی شعور کو مختلف زاویوں سے متاثر کیا تھا۔ بادشاہ وقت کی خوشنودی کا ایک ذریعہ اس کے ادبی مذاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے شعر کہنا بھی تھا اس لیے ان شعرا کی غزلوں میں طربیہ تاثر اور نشاطیہ کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور انہوں نے غزل کو معاملات دل کی شاعری کی حیثیت سے برتا ہے۔

یہ عہد دراصل ایران کی ادبی خصوصیات اور ہندوستانی روایات کی آمیزش اور سنجوگ کا عہد تھا اور اس امتزاج کے زیر اثر جو نئے ادبی عناصر تشکیل پارہے تھے ان میں قدیم تصورات کی کارفرمائی کا عکس بھی موجود تھا۔ فارسی شاعری میں جذبات عشق کا اظہار مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔ دکنی شعرانے اس تصور کو بھی برقرار رکھا لیکن فرق یہ ہے کہ مخاطب واضح طور پر عورت ہے مرد نہیں۔ دکنی شعرانے غزلوں میں ارضی محبوب کو پیش نظر رکھا ہے۔ سراج اور ولی کے دور تک پہنچتے پہنچتے اردو غزل میں محبوب کا تصور تھوڑا بہت تبدیل ہو گیا اور بے ریش وبروت لڑکوں نے عورت کا مقام چھین لیا۔

دکن کے غزل گوشعرانے محبوب کے لیے تانیث کا صیغہ اکثر جگہ استعمال کیا اور یہ خصوصیت بعد کے دور میں ناپید ہوگئی۔ ان شاعروں کے یہاں حسن اپنی جلوہ سامانیوں اپنی کشش وجاذبیت اور اپنی تمام صاعقہ پاشی کے ساتھ ساتھ اپنی صحیح جنس میں نمودار ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جانا تجے جو دیکھت جگ چھند بھری کھتے ہیں
کوئی حور پدمنی کوئی کوئی شہہ پری کھتے ہیں
(حسن شوقی)

چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا
کہ اس بن نئیں ہمیں یک تل قرارا

(محمد قلی قطب شاہ)

نازک یوگت کے لٹکے میں اٹکیا ہے جیو مج
جھٹکا آنچل کوں دے کے چلی ہے یوجان کر

(شاہی)

بولیا میں کئی دنوں ص سیں تیری بندگی میں ہوں
بولی کہ خیر یونچہ کتک ماہ و سال بول

نصرتی)

دکنی غزل میں محبوب کا جوتصور ملتا ہے وہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے منفرد ہے۔ یہ محبوب نہ محض تخیل کی پر چھائیں ہے نہ روایت کی پیداوار اور نہ یہ کسی فلسفیانہ انداز نظر اور متصوفانہ تصور کی نمائندگی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا مادی اور مجازی محبوب ہے جو کمتر ایرانی اور زیادہ تر ہندوستانی معلوم ہوتا ہے۔ دکنی شعرا کے یہاں محبوب کا تصور حقیقت پسندانہ، بھر پور اور سچا محسوس ہوتا ہے۔ دکنی شعرا کی غزلوں میں محبوب کی ایک متحرک اور بولتی ہوئی تصویر نظر آتی ہے یہاں محبوب پیکر خیالی یا کسی ماورائی کیفیت کی علامت نہیں بلکہ ایک مادی حقیقت بن کر اپنی ساری ارضیت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ دکن کے غزل گوشعرا نے محبوب کے لب ورخسار اور زلف وابرو کی دلکشی اور سحر طرازی ہی کی تعریف نہیں کی ہے بلکہ وہ بڑی بیباکی اور صداقت کے ساتھ حسن کی ان تمام رعنائیوں کا جو انہیں مسحور کر دیتی ہیں ذکر کرتے ہیں۔ دکنی شعرا کا عشق جسم کی آنچ اور حسن کی تابناکی اور دلکشی سے اثر پذیری کا عشق ہے۔

اس دور کے دکنی شعرا کے تجربات عشق بھی ان کے عشق کی طرح سادہ اور فطری ہیں۔ سیدھی سادی، الھڑ بے داغ فطری محبت پیچیدہ خیالات اور جذبات کی بھول بھلیوں کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی محبت کے سیدھے سادے تجربات سادہ اور فطری انداز میں پیش کیے گئے ہیں جو دکنی غزل گوئی کا ایک اہم وصف ہے۔ بیجاپور اور گولکنڈے کے اکثر و بیشتر شعرا بالخصوص ابراہیم عادل شاہ ثانی علی عادل شاہ شاہی، محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ وغیرہ کی شاعری کی فضا پر ہندو دیو مالا کی گہری چھاپ ہے جس نے جنسی جذبے کو تقدس کے تصور سے بھی وابستہ کر دیا ہے۔

دکنی شعرا کے اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں صنف غزل کا ایک واضح تصور موجود تھا اور وہ اس کے فنی تقاضوں سے واقف بھی تھے۔ شعرائے گولکنڈہ و بیجاپور نے کہیں کہیں اس صنف کو اپنے مخصوص انداز میں ڈھالنے کی بھی کوشش کی ہے اور فارسی کے بندھے ٹکے فارمولوں سے انحراف کر کے اپنی جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے۔ بعض دکنی شعرا کی غزلیں مطلع اور مقطع کی قید سے بھی آزاد نظر آتی ہیں۔

دکن کے غزل گوشعرا نے مقامی عناصر اور ہندوستانی طرز فکر کو اپنی غزلوں میں جگہ دیتے ہوئے بھی فارسی کے اساتذہ فن کے کمال تغزل کی داد دی ہے اور کہیں کہیں شاعرانہ تعلّی کے انداز میں ان سے ہمسری کا دعویٰ بھی کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عجمی شاعروں کے شعری محاسن اور فن پر ان کی دسترس سے بے خبر نہیں تھے۔ فارسی غزل گوئی کے معیار اور ان کے بہترین نمونے ان کے سامنے موجود تھے۔ چناں چہ محمد قلی قطب شاہ کہتا ہے:

اگر محمود اور فیروز بے ہوش ہوئیں عجب کیا ہے
ہوئے تج وصف نا کر سک ظہیر ہور انوری بیہوش

اسی طرح حسن شوقی شاعرانہ تعلیٰ سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ جب شوقی ''عاشقاں کی صف'' میں غزل پڑھتا ہے تو اس کے اشعار پر لوگوں کو خسرو، ہلالی اور انوری کا گمان گذرتا ہے۔

جب عاشقاں کی صف میں شوقی غزل پڑے تو
کوئی خسروی ہلالی کوئی انوری کہتے ہیں

دکنی شعرا کے یہاں صنف غزل کا ایک مخصوص تصور ضرورت تھا وہ ندرت، جدت، تازگی فکر، خیال آفرینی، شیرینی اور گھلاوٹ کو تغزل کی پہچان تصور کرتے تھے چناں چہ ان شعرا نے بار بار اپنی غزلوں میں اس طرف اشارے کیے ہیں اور غزل کو اپنی دین پر روشنی ڈالی ہے چنانچہ غواصی کہتا ہے:

غواص جو یو غزل بولیا ہے سو اس کا
نوا ہے طرح نوا طرز ہور نوا قانون

محمد قلی نے بھی دعوی کیا ہے۔

قطب شہہ بنی صدقے جگ میں کیا ہے
کوئی طرح جگ میں بچن کو مرصع

غزل کی روایت کا ابتدائی عہد شعری زبان کی خام اور ناپختہ کیفیت اور بیان کے کھردرے پن کا زمانہ تھا اس کے باوجود دکن کے غزل گو شعرا کے یہاں شیرینی اور شگفتگی، روانی اور بیساختگی کی کمی کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان محاسن کو غزل گوئی کے لوازمات تصور کرتے تھے کلام کی شیرینی کے بارے میں حسن شوقی کہتا ہے۔

شوقی شکر غزل کی کھنڈیاں سوں بانٹتا ہے
طوطی طبع کو میرے یک من شکر نہ بھیجا

شاعری میں نازک خیالی پر زور دیتے ہوئے نصرتی کہتا ہے۔

بولیا کہ دیکھنے میں تیرے طبع تازہ ہوئے
اے نصرتی توں ایسے میں نازک خیال بول

غزل مسلسل بھی دکنی غزل کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ دکنی کے غزل گو شعرا کے کلام میں متعدد مسلسل غزلیں نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے محمد قلی قطب شاہ کا نام لیا جاسکتا ہے جس کے دیوان میں مسلسل غزلیں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ دکنی شعرا کی مسلسل غزلیں ایک ہی موڈ میں کہی گئی ہیں۔ ایسی مسلسل غزلوں کی مثالیں بیشتر شعرا کے کلام میں موجود ہیں۔ اردو غزل کے دور مابعد میں اس طرح کی مربوط غزلوں کی بڑی کمی نظر آتی ہے جو ایک ہی موڈ، ایک مخصوص کیفیت اور ایک خاص موضوع سے متعلق ہوں۔ دکنی شعرا نے غزل کی صنف سے مختلف کام لیے ہیں۔ بعض شاعروں نے مثنوی کے درمیان مسلسل غزلیں بھی پیش کی ہیں۔ طبعی نے ''بہرام وگل اندام'' میں مثنوی کے درمیان غزلیں کہی ہیں۔ یہ غزلیں مثنوی

کے قصے اور واقعات کے تاثر سے پوری طرح ہم آہنگ معلوم ہوتی ہیں اور ان کا مقصد مثنوی کے مسلسل اشعار کی یکسانیت میں تنوع پیدا کرنا اور ایک سرے پن کو رنگا رنگی سے مبدل کرنا معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح ''قطب مشتری'' میں وجہی نے غزل سے مثنوی میں یہی کام لیا ہے۔ اس نے مثنوی کے درمیان سات غزلیں شامل کی ہیں۔ محمد قلی شاہی، نصرتی اور عبداللہ قطب شاہ کی غزلوں میں نئی اور اچھوتی تشبیہات اور نادر استعارات قاری کی توجہ اسیر کر لیتے ہیں۔ ہندوستان کی فضا اور یہاں کی مخصوص سوسائٹی نے ایرانی خیالات، تشبیہات، علامات، کنایات اور استعارات کو نئی اٹھان بھی دی اور نیا مزاج، نیا کس بل اور نیا لب ولہجہ عطا کیا۔ خارجی زندگی کے تجربات فنکار کی شخصیت کی بھٹی میں تپ کر اور داخلیت کی کسک حاصل کر کے شعر کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں اس لیے گردوپیش کے حالات کا پرتو اور ماحول کے گوناگوں تجربات شاعر کے شعور کا جزو بن کر اظہار کے پیکروں اور تشبیہات واستعارات میں نفوذ کر جاتے ہیں۔ شعر میں تہذیبی زندگی کے عناصر اور ثقافتی میلانات تشبیہوں اور استعاروں، تلمیحات، علامات اور کنایوں کے سہارے مجسم ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ایک ایسے دور میں جسے ہم شعر وادب کا دور طفولیت کہہ سکتے ہیں شعرا سے زبان و بیان کی لطافتوں، تخیل کی بلند پروازی یا فنی باریکیوں اور طرز ادا کی نزاکتوں کی زیادہ توقع نہیں کر سکتے ہیں اس کے باوجود دکنی شعرا نے اپنی غزلوں میں عمدہ تشبیہات اور اچھوتے استعاروں کے ساتھ ساتھ صنائع بدائع کو اپنے مخصوص انداز میں استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دکنی شعرا مرصع کاری سے زیادہ سادگی کی طرف مائل ہیں اس کے باوجود وہ شعر میں زبان و بیان اور صوری حسن کی سحر آفرینی سے واقف تھے اور اس کا برمحل استعمال جانتے تھے۔

حسن کی قربت اور تجربات عشق کی حرارت نے ان شعرا کے جمالیاتی شعور احساس حسن اور جمالیاتی حس کو بیدار اور متحرک کر دیا تھا دکنی شاعری میں جو حسن کے جلووں کا ہجوم، رنگ و بو کے امنڈتے ہوئے طوفانوں کی جو تصویریں، چاہنے اور چاہے جانے کی جو رنگا رنگ کیفیات اور احساس جمال کی جو گھلاوٹ اور تابنا کی ہے وہ مفروضہ واقعات محبت کا نہیں بلکہ واردات قلب اور ذاتی تجربات کی گرمی کا احساس دلاتی ہے۔ دکنی شعرا کا جمالیاتی شعور خاصا رچا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حسن کی سحر طرازیوں اور صاعقہ پاشیوں سے ان کی آنکھیں چکا چوند نظر آتی ہیں۔

3.5 دکنی قصیدہ کی خصوصیات

قصیدہ عربی شاعری کی پیداوار ہے۔ یہ عربی سے اردو میں فارسی کے توسط سے آیا۔ ذیل میں دکنی قصیدے کی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو کی دوسری اصناف سخن کی طرح قصیدہ کے ابتدائی نقوش اور اولین نمونے بھی دکن ہی میں دستیاب ہوتے ہیں۔ بہمنی دور کے شعرا مشتاق اور لطفی کے کلام میں ہمیں اس صنف سخن کے نمونے ملتے ہیں۔ شاہ خلیل اللہ بت شکن کی مدح میں لکھا ہوا مشتاق کا قصیدہ اردو میں اس صنف کا پہلا نقش ہے۔ مشتاق ایک پختہ مشق قصیدہ نگار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اشعار سے اس کے زور بیان اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ مشتاق کے عہد تک پہنچتے پہنچتے یعنی بہمنی دور کی ابتدا میں قصیدے نے خاصی ترقی کر لی تھی۔ مشتاق کو قصیدہ گوئی پر اتنی دسترس ہے کہ وہ ایک مطلع پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ مطلع ثانی کہہ کر اپنے مطالب کا اظہار کرتا ہے:

مطلع ثانی کہوں شاہ جو ہے محترم
تخت ولایت اپر شاہ سلیماں حشم

اس دور کا دوسرا شاعر لطفی ہے جو مشتاق کا ہمعصر تھا اس نے خواجہ کرمانی کے مشہور قصیدے:

ترطہ زر چاک زد لعبت سمیں بدن

کے تتبع میں اسی زمین میں ایک قصیدہ کہا تھا:

صبح ہوا باصفارین کا کجلا کوا
چھوڑ چمن کی ہو غیب ہوا باز غن

زوال سلطنت بہمنیہ کے بعد دکن میں جو پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں گولکنڈہ و بیجاپور کی سرزمین قصیدہ کے لیے راس آئی۔ گولکنڈے کے پانچویں حکمراں محمد قلی قطب شاہ کے ضخیم کلیات میں بارہ قصائد موجود ہیں۔ محمد قلی کے قصیدوں کے موضوعات متنوع ہیں اس نے عیدوں' نوروز' بسنت اور باغ محمد شاہی کی تعریف میں قصائد اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ محمد قلی کے قصائد طویل نہیں اور ان میں اجزائے قصیدے کی مکمل پابندی نہیں کی گئی ہے۔ محمد قلی کے اکثر قصیدوں میں تشبیب اور گریز نہیں ہے۔ منقبت کے دو قصیدوں میں تشبیب جاندار اور فنی اعتبار سے قابل اعتنا ہے اور ان سے شاعر کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں محمد قلی نے ایک نیا اور انوکھا مضمون پیش کیا ہے۔ سورج اور چاند کے آمادہ جنگ ہونے کا اچھوتا مضمون منتخب کر کے محمد قلی نے تشبیب میں جدت طرازی سے کام لیا ہے۔ ایسے قصیدے کو جس کی تشبیب میں آسمان' چاند' سورج اور دوسرے ستاروں کا ذکر ہو چرخیہ قصیدہ کہتے ہیں۔ دکنی میں اس طرح کے قصائد مقبول تھے۔

دکن میں ''چرخیات'' کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکثر دکنی قصیدہ نگاروں نے فلکیات کی معلومات سے استفادہ کرتے ہوئے تشبیب میں انہیں پس منظر کے طور پر برتا ہے اور اسی کی مناسبت سے تشبیب کے مضامین باندھے ہیں اس کے بہترین نمونے نصرتی کی شاعری میں موجود ہیں۔ محمد قلی کے قصیدوں کی تشبیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکنی شعرا نے ابتدا ہی سے چرخیات کے موضوعات سے دلچسپی لی ہے۔ محمد قلی کے دو قصیدوں کی تشبیب میں چرخیات سے متعلق موضوعات سے کام لیا گیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے باغ محمد شاہی کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے وہ اپنے موضوع اور طرز ترسیل دونوں کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اسے ہم اردو ادب میں نیچرل شاعری کے اولین نمونوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ خوبصورت تشبیہات' برجستہ استعاروں اور شاداب و رنگین طرز ادا نے قصیدے کے حسن بیان میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ محمد قلی نے باغ محمد شاہی کے محل وقوع' اس کے اشجار' پھل پھول' باغ کی سیر' اس کی دلکشا فضا اور اس پورے فطری ماحول کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے۔

غواصی عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا شاعر ہے اس کے کلیات میں اکیس قصیدے موجود ہیں۔ قصائد میں مشکل ردیف و قوافی کا استعمال غواصی کی صنف قصیدہ پر عبور کی دلیل ہے۔ مناجات کے رنگ میں کہاں ہوا غواصی کا قصیدہ:

زباں چلاوں تیرے شکر سات اے باری
کہ ہر زباں پہ ترا شکر ہے سدا جاری

حسن بیان اور طرز ادا کے اعتبار سے ایک کامیابی قصیدہ ہے۔ اس میں شاعر نے نہایت عجز و انکساری کے ساتھ مکروہات دنیا میں اپنے ملوث ہونے اور اپنی عصیاں شعاری پر اظہار ندامت کرتے ہوئے خدا سے عفو و مغفرت کی درخواست کی ہے۔ قصائد غواصی کے مختلف اشعار میں اس

کے عہد کے سماجی اور ادبی حالات کی طرف بعض بلیغ اشارے بھی ملتے ہیں۔افضل نے عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ اپنی یادگار چھوڑا ہے جو مختصر ہے لیکن زور بیان' آمد اور بیساختگی کے اعتبار سے قابل توجہ ہے۔افضل نے اپنے ممدوح کے حسن سیرت اور حسن صورت دونوں کو سراہا ہے اور اس کی دانشمندی' بلند ہمتی خوش بختی اور جہاں بانی کی تعریف کی ہے۔

سلطان علی عادل شاہ شاہی ایک بلند پایہ سخنور اور اچھا قصیدہ نگار ہے۔اس کے کلیات میں دوسری اصناف کے علاوہ چھ قصیدے بھی موجود ہیں جن میں ایک قصیدہ حمد میں ہے' ایک نعت میں' دو منقبت میں ایک' علی دادمحل کی تعریف میں اور دوسرا قصیدہ حمل جمل ''در تعریف حوض وعلی داد محل و باغ'' ہے۔ایک قصیدہ ''چار در چار'' بھی ہے۔

شاہی کے قصائد میں اجزائے قصیدہ کا شعور موجود ہے دو قصیدوں سے قطع نظر شاہی کے قصائد میں تشبیب' گریز' مدح اور دعا کے اجزا بڑی برجستگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ صرف ہوئے ہیں۔شاہی کے قصائد مختصر نہیں لیکن کسی میں بھی پینسٹھ سے زیادہ اشعار موجود نہیں ہیں۔علی عادل شاہ ثانی ایک پختہ مشق قصیدہ نگار تھا اس نے مشکل قافیے بھی بڑے سلیقے اور چابکدستی کے ساتھ برتے ہیں اور اس میں استادانہ کمال بھی دکھایا ہے۔شاہی نے بہاریہ مضامین بھی بڑی خوش اسلوبی سے باندھے ہیں۔''قصیدہ درنعت'' کی بہاریہ تشبیب منفرد ہے اس میں دکنی شعرا کے مرغوب موضوع چرخیات سے دلچسپی کا پہلو نمایاں ہے۔

نصرتی دکن کا سب سے عظیم اور بلند پایہ قصیدہ نگار ہے وہ علی عادل شاہ ثانی کا ملک الشعرا تھا۔نصرتی اپنے ممدوح علی عادل شاہ ثانی کی مدح کا بہانہ ڈھونڈھتا ہے۔یہاں تک کہ ہجو یہ قصیدے میں بھی جہاں بادشاہ وقت کا ذکر بے محل تھا اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بادشاہ کی نظر کرم کی دین بتاتے ہوئے اس کی مدح کرتا ہے۔اس کی مثنوی علی نامہ میں (7) قصائد ہیں۔''علی نامہ'' کے درمیان قصیدے کہنے کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے ذریعے نصرتی نے اپنے ممدوح کے محاربات اور اس کی جنگوں اور شاندار فتوحات کو نظم کر کے قاری کی توجہ اس طرف بطور خاص منعطف کی ہے۔مثنوی کے درمیان میں قصائد شامل کرنے سے ایک تو مثنوی کی یکسانیت تنوع سے بدل گئی ہے دوسرے ہیرو کی شجاعت و بہادری' اس کی جودوسخا اور اوصاف حمیدہ کا نقش بھی اجاگر ہوا ہے۔''علی نامہ'' میں چونکہ تاریخی واقعات نظم کیے گئے ہیں اس لیے نصرتی کے ان قصائد میں حقیقت پسندی' تاریخی شعور اور واقعیت کا عنصر جلوہ گر نظر آتا ہے۔

نصرتی کے قصائد میں باغ اور محل کا تذکرہ' شہر کی رونق اور چہل پہل اور موسمی کیفیات کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔تخیل کی پرواز طرز ادا کی برجستگی اور معنی آفرینی نے نصرتی کے قصائد کو وقیع اور بلند پایہ بنا دیا ہے۔قصیدوں میں تخلیقی عمل کے ایسے گرانقدر نمونے موجود ہیں جو نصرتی کو دکن کا سب سے بڑا قصیدہ نگار ثابت کرتے ہیں۔نصرتی کے قصائد دوسرے دکنی قصائد کے مقابلے میں خاصے طویل ہیں۔علی نامہ کا آخری قصیدہ ''قصیدہ فتح ملناڑ'' دوسوبیس اشعار پر مشتمل ہے اور فنی محاسن کے اعتبار سے نصرتی کا شاہکار قصیدہ ہے۔الفاظ کی دروبست' لب ولہجے کی گونج پرشکوہ اور رعب دار طرز ابلاغ اور قوت بیان نے اس قصیدے کو اردو کا ایک قابل قدر شعری کارنامہ بنا دیا ہے۔نصرتی کا قصیدہ چرخیہ بھی طرز ادا کی دلکشی' رفعت تخیل اور روانی و بیساختگی کے اعتبار سے اہم ہے۔اس قصیدے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تشبیب میں تمام اصطلاحات اور لفظیات' چرخیات سے متعلق ہیں اور ان کے وسیلے سے شاعر نے اپنے مطالب کی ترسیل کی ہے۔

بعد کے دور میں ولی نے بھی قصیدے لکھے۔کلیات ولی میں چھ قصیدے ہیں۔ولی کے قصیدے ان کی مذہبی عقیدت کے ترجمان ہیں' حمد'

نعت، منقبت، بیت الحرام کی تعریف اور پیران طریقت کی مدح ان کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ایک قصیدے میں اس نے میراں محی الدین کی تعریف کرتے ہوئے ان کے حسن و جمال کو بھی بہت سراہا ہے۔اس میں زور بیان بھی ہے اور شگفتگی و بیساختگی بھی۔

جب ہم دکنی قصائد کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ قصیدے کی صنف کو بھی دکنی شعرا نے اپنے مخصوص انداز میں برتا ہے اور اس سلسلے میں بھی اپنے ادبی رویے کی انفرادیت کا اظہار کیا ہے۔دکنی قصیدہ نگاروں نے فارسی قصائد سے اجزائے ترکیبی مستعار لیے لیکن انہیں دکنی تہذیب وتمدن کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔دکنی شعرا نے کہیں اجزائے ترکیبی سے کام لیا ہے اور کہیں انہیں حسب ضرورت ترک بھی کردیا ہے۔ ترک واختیار کے اس عمل میں دکنی شعرا نے خاصی آزادانہ روش اختیار کی ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی شعرا نے عربی اور فارسی شاعروں کی کورانہ تقلید کو اپنا مطمحِ نظر نہیں بنایا تھا بلکہ وہ عرب وعجم سے مستعار لیے ہوئے سانچوں کو اپنی جدت فکر اور ندرت ادا سے مالا مال کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے اور اسے نیا نکھار اور نیا روپ عطا کرنا چاہتے تھے۔ان شعرا نے ایک نئی ادبی زبان کو گردوپیش کے فطری تقاضوں کے زیر اثر پروان چڑھایا اور اپنے ادب کو وہ نیا مزاج بخشا جس میں وطن کی سرزمین کی بھینی بھینی خوشبو موجود تھی۔

دکنی قصیدہ نگاروں کے سامنے فارسی اصناف سخن کی کسوٹیاں اور معیارات ضرور موجود تھے۔غواصی نے فارسی کے مشہور قصیدہ نگاروں کی زمین میں قصیدے کہے ہیں۔انوری، عرفی اور خاقانی کے مشہور قصائد کی زمینوں میں غواصی نے طبع آزمائی کی ہے۔لیکن ان قصائد میں مضامین کی پیش کشی، لب ولہجے یا انداز مداحی میں غواصی نے فارسی شعرا کا تتبع نہیں کیا ہے بلکہ ان زمینوں کی میں اپنی انفرادیت کے پھول کھلائے ہیں۔دکنی شعرا کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں، فطری اپج اور جودت طبع پر اعتماد ہے اس لیے وہ تقلید کے بجائے اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔

دکنی شعرا نے قصیدے کی شعری ہیئت سے زیادہ اس کی صنفی شناخت کے لیے اس کے موضوع کو اہمیت دی ہے۔چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دکنی شعرا نے مثنوی میں مدحیہ مضامین بطور قصیدہ باندھے ہیں۔دکنی مثنویوں میں بادشاہ وقت کی مدحت طرازی یا اپنے پیر طریقت کی مدح نے ایک مستقل عنوان کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ یہاں مثنوی کے ادبی سانچے میں قصیدے کے موضوعات پیش کیے جاتے تھے۔طبعی نے ''بہرام وگل اندام'' میں ''قصیدہ در مدح حضرت شاہ راجو حسینی قدس سرہٗ'' کے زیر عنوان اپنے روحانی رہبر کو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے اور کہتا ہے ؎

چل آیا شہہ تیرے گھر شاہ راجو ولی تو بڑا ہے لکر شاہ راجو

بہرحال مثنوی میں قصائد کہنے کی روایت دکنی ادب میں اسی طرح موجود ہے جس طرح کی مثنوی میں غزل یا رباعی کہنے کا رواج۔دکن کے قصیدہ نگاروں نے سودا اور پھر ذوق جیسے قصیدہ نگاروں کے لیے زمین ہموار کی۔محمد قلی، غواصی، شاہی اور نصرتی، دکن کے ایسے قصیدہ گو ہیں جنھوں نے اردو شاعری کے ابتدائی دور میں اس صنف کی نوک پلک درست کرنے اور اس کے خدوخال متعین کرنے کا اہم کام انجام دیا۔زبان کی قدامت کی وجہ سے ان کی شاعرانہ مساعی اور اختراعی واجتہادی صلاحیتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

3.6 دکنی مرثیے کی خصوصیات

اردو مرثیے کی ابتدا شاعری کے ابتدائی دور سے ہوئی اور دکن ہی اس کا گہوارہ رہا۔دکن میں عزاداری کی باقاعدہ تاریخ سلطنت بہمنیہ کے حکمرانوں کے عہد سے قلم بند کی جاسکتی ہے۔دکن کا پہلا مربوط عزائی شعری کارنامہ اشرف کی نوسر بار (909ھ/ 1503) ہے جس میں نو مختلف

ابواب میں واقعات کربلا نظم کیے گئے ہیں اس مثنوی کی فنی ترتیب' مربوط رثائیہ تاثرات' پیشکشی اور ربط بیان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نوسرہار سے پہلے بھی دکنی زبان میں واقعات کربلا نظم کیے جاتے رہے ہوں گے تاہم دستیاب شدہ عزائیہ کلام میں اشرف بیابانی کی نوسرہار کا نام تاریخی اعتبار سے سرفہرست ہے۔اشرف کی نوسرہار میں ادبیت کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔اس نے کہیں کہیں تشبیہات واستعارات اور سراپا نگاری سے اپنے عزائیہ کلام کو دلچسپ بنانے کی بھی کوشش کی ہے۔

عادل شاہی دور میں ہمیں سب سے پہلے جانم کے مرثیے دستیاب ہوتے ہیں۔ برہان الدین جانم نے اپنے والد میراں جی شمس العشاق کی وفات پر ایک مرثیہ کہا تھا خاصا طویل ہے۔ جانم کا یہ مرثیہ بہت اہم تصور کیا جاتا ہے۔اور یہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔اس کا موضوع کربلا سے متعلق نہیں ہے۔اور ہم اس کا شمار شخصی مرثیوں میں کرسکتے ہیں جس میں جانم نے اپنے باپ کی جدائی پر اپنے احساسات غم نظم کیے ہیں۔ یہ مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ ہر شعر کی ردیف جے کچ حکم الٰہی کا ہے۔ یہ بیجاپور کا پہلا دستیاب شدہ مرثیہ ہے۔

جانم کا دوسرا مرثیہ کربلائی ہے۔ یہ غزل کی ہیئت میں ردیف وقوافی کے التزام کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ یہ مرثیہ انیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مرثیے میں رثائیہ مضامین کی پیش کشی کے سلیقے روانی اور قدرت بیان کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اور مرثیے کہے ہوں گے تب ہی تو ان کی مرثیہ نگاری میں یہ صفائی اور ایسا ربط وضبط نظر آتا ہے۔ جانم کے اس مرثیے میں ان کے صوفیانہ مزاج اور عارفانہ روش کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔اپنے اس مرثیے میں انہوں نے ایک منفرد طرز اختیار کیا ہے اور صرف گریہ وبکا پر اکتفا کرنے کے بجائے اس ادبی صنف کے وسیلے سے فلسفہ شہادت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ عام دکنی روایت کے مطابق مرثیے کا آغاز ہلال محرم کی رویت کے ذکر سے ہوا ہے لیکن بہت جلد جانم کا عارفانہ مزاج اپنا اثر دکھانے لگتا ہے اور ان کا ذہن اپنے موضوع کے متصوفانہ پہلو کی طرف رجوع ہوجاتا ہے اور برہان الدین جانم تکوین عالم کی صوفیانہ نقطہ نظر سے تشریحیں پیش کرنے لگتے ہیں۔

اردو مرثیے کی تاریخ میں دور مابعد کے کسی شاعر نے حزنیہ عناصر کو متصوفانہ تشریحات سے ہم آمیز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ صوفیائے دکن کا مخصوص کارنامہ ہے۔ جانم کا یہ پورا مرثیہ متصوفانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور اردو مرثیے کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ملک خوشنود کی تربیت گولکنڈے کے اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں شیعیت کا بول بالا تھا۔خوشنود کے تین مرثیے جو غزل کی ہیئت میں ہیں اس کی یادگار ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دکنی شعرا نے مراثی کے لیے اکثر وبیشتر غزل کی ہیئت کا انتخاب کیا ہے۔مرثیے کے لیے کسی خاص ہیئت یا فارم کا التزام نہیں،موضوع کی قید ہے۔ضمیر خلیق انیس اور دبیر نے مسدس میں مرثیے کہے اور اس فارم کو اتنا مانجھا اور سنوارا کہ یہ سانچہ مرثیے سے مخصوص ہوگیا۔بیجاپور اور گولکنڈے کے مرثیہ گو شعرا نے مسدس کی ہیئت میں مرثیے نہیں کہے بلکہ غزل کی ہیئت ہی سے کام لیا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دکنی شعرا نے مرثیے میں مضامین کی ترتیب کے چند مخصوص اصول وضع کرلیے تھے مثال کے طور پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر دکنی مرثیہ نگار اپنے مرثیے کی ابتدا میں ہلال محرم کے نمودار ہونے کا ذکر ضرور کرتا ہے اور اس کے بعد مصائب نظم کیے جاتے ہیں اور آخر میں تخلص پر مرثیہ ختم ہوتا ہے۔آخری شعر میں اکثر مرثیہ نگاروں نے دعائیہ مضامین بھی باندھے ہیں۔

دکنی کے مشہور مرثیہ گو مرزا بیجاپوری نے صرف مرثیے لکھے کسی اور صنف سے سروکار نہیں رکھا ہے۔کہا جاتا ہے کہ مرزا نے حکمران وقت علی عادل شاہ ثانی شاہی کی خواہش پر بھی اس کی مدح میں قصیدہ نہیں لکھا۔اس کے بجائے اپنے ایک مرثیے میں بادشاہ کا تخلص ڈال کر وہ مرثیہ اسی کے نام

سے موسوم کر دیا تھا۔

مرزا نے طویل مرثیے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔حضرت قاسم کے احوال کا مرثیہ دوسوتیں اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں رخصت آمد رجز، جنگ اور شہادت، مرثیے کے تقریباً سب ہی اجزا موجود ہیں۔مرزا نے مرثیہ گوئی میں بڑا کمال پیدا کیا تھا۔اس کے مرثیوں کی مقبولیت کا راز ان کی اثر آفرینی اور دردمندی ہے۔ابراہیم زبیری نے بساتین السلاطین میں مرزا کی مرثیہ نگاری کو وہبی صلاحیت سے تعبیر کیا ہے۔

بیجاپور کے غیر معروف اور کم اہم مرثیہ نگاروں میں سرور مومن، حسینی، قادر، ندیم، قائم عبدی احمد سری اور غلامی ہیں۔بحری نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے تشبیہات واستعارات اور پرکشش طرز ادا سے مرثیے کو دلچسپ اور جاذب نظر بنا دیا ہے۔ان کے مراثی بہت کم تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہدائے کربلا سے عقیدت نے ان شعرا کے شوق مرثیہ نگاری کو مہمیز کیا تھا اور بیجاپور کی تہذیبی فضا جس نے عزاداری کی مختلف رسومات کو پروان چڑھایا تھا ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے مفید ثابت ہوئی۔

بہمنی اور عادل شاہی سلطنت کی طرح گولکنڈے میں بھی ایرانی عنصر تہذیبی رجحانات کا جزو لاینفک بن گیا تھا۔دکن میں ایرانیوں کا اقتدار اور رسوخ بڑھا تو یہاں کی معاشرتی زندگی پر ان کے مخصوص طرز فکر اور سماجی و مذہبی تصورات کا پرتو پڑنے لگا۔گولکنڈہ کے عوام وخواص بھی ان کے نظریہ حیات اور تصورات وافکار کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکے تھے یہاں کے معاشرے میں بھی عجمی عقائد نفوذ کر گئے اور عجمی طور طریق نے جگہ پالی تھی۔تہذیب کے تمام شعبے اسی سربرآوردہ طبقے کے تسلط میں تھے۔حب اہلبیت ،عزاداری اور محرم کی تقریبات کا انعقاد ان کی تہذیبی زندگی اور عقائد کا ایک اہم جزو تھا اس لیے گولکنڈے میں بھی عزاداری کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

1580 میں جب محمد قلی قطب شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو گولکنڈے کا مذہبی مسلک تبدیل ہوگیا۔بادشاہ محرم کے آغاز کے ساتھ شاہانہ لباس تبدیل کر کے ماتمی کسوت زیب تن کرتا اور جام وسبو اور چنگ ورباب کی محفلوں کو موقوف کر دیتا۔

محمد قلی کی شدید مذہبیت کا عکس اس کے مرثیوں میں دیکھا جا سکتا۔ہے جوش وخروش اور شدت جذبات نے محمد قلی کے مرثیوں کو حزینہ آہنگ عطا کیا ہے۔مرثیہ نگاری میں محمد قلی کا مقام اس کے ہم عصروں سے بلند ہے معیار اور محاسن شعری کے اعتبار سے محمد قلی کے مرثیے وقیع اور قابل قدر ہیں اس نے مرثیے میں روایتیں نظم کر کے اسے وسعت عطا کی اور حسن تعلیل کو بڑے سلیقے اور معنویت کے ساتھ اپنے مراثی میں استعمال کیا ہے۔

وجہی کی زبان بہت سلیس اور سادہ ہے لیکن اس کے مرثیوں میں محمد قلی کے مراثی کی طرح جذبات کی شدت اور جوش وخروش نظر نہیں آتا۔وجہی کا لہجہ دھیما اور متوازن ہے۔کہیں کہیں استعارے کا سہارا لیا ہے۔اپنے ایک مرثیے میں وجہی نے ایک ایسی عورت کا سراپا کھینچا ہے جو عزائے حسین میں مصروف ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وجہی کے شاعرانہ مزاج نے مرثیے کے سنجیدہ موضوع میں بھی حسن وشباب کے بیان کا موقعہ ڈھونڈ نکالا ہے۔

گولکنڈے کا نامور شاعر غواصی بھی مرثیہ نگار تھا اس کے چھ مرثیے دستیاب ہوئے ہیں۔اس کے اشعار شدت جذبات کے غماز ہیں۔غواصی کا طرز ادا سادہ موثر اور رثائیہ مضامین کے مزاج سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔غواصی کے مراثی کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس نے بینیہ اشعار موزوں کرنے کے بجائے خاندان رسالت سے اپنی مودت اور امام حسین سے اپنی عقیدت کا اظہار بار بار کیا ہے۔

مرثیہ گوئی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے مشرب ومسلک کا تقاضہ تھی۔عبداللہ قطب شاہ کے چار مرثیے اس کے کلیات میں موجود ہیں اور یہ

چاروں غزل کی ہیئت میں ہیں۔عبداللہ قطب شاہ کے مرثیے محرم میں ہر روز بادشاہی عاشور خانے کی مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔شاہ راجو کا مرید عابد شاہ اس دور کا ایک اچھا مرثیہ گو ہے اس کے گیارہ مرثیوں سے اس کے پختہ مشق شاعر ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔عابد نے بعض مرثیے مشکل زمینوں میں بھی کہے ہیں۔اس نے اپنے آٹھ مرثیوں میں قافیہ کا التزام رکھا ہے یہ مراثی امام حسین سے اس کی عقیدت کے غماز ہیں۔

عابد کے مرشد سید شاہ راجو قتال نے بھی مرثیہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے مریدوں میں طبعی اور عابد کے علاوہ خود بادشاہ وقت ابوالحسن تانا شاہ بھی تھا۔شاہ راجو کے مرثیے بھی دکنی مرثیہ گوئی کی روایت کے مطابق غزل کی ہیئت میں ہیں۔حسن تعلیل کے ذریعے شاہ راجو نے نہ صرف ساری دنیا کو حسین کے غم میں ملول ومحزون بتایا ہے بلکہ حاملان عرش کو بھی وہ حسین کا ماتم گسار بتاتے ہیں۔

شاہ قلی خان شاہی ابوالحسن تانا شاہ کی فوج میں ملازم تھا اور اپنی ذہانت اور غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا بادشاہ کا مصاحب بن گیا تھا۔ابوالحسن تانا شاہ کی فرمائش پر شاہ قلی نے مرثیے کہے تھے۔وہ اپنے عہد کا ایک مشہور ومقبول مرثیہ گو تھا اور اس کے اشعار زبان زد خاص وعام تھے چناں چہ اورنگ زیب کی فوج کے سپاہیوں نے اس کے اشعار از بر کر لیے تھے۔عام مرثیہ نگاروں کے موضوعات سے ہٹ کر شاہی نے اپنے ایک مرثیے میں حضرت زین العابدین کے مصائب نظم کیے ہیں اور شہادت حسین کے بعد اہل حرم کی پریشان حالی اور ان کی مظلومیت کا بڑا موثر مرقع کھینچا ہے۔

دکنی شعرا نے زیادہ تر غزل کی ہیئت میں مرثیے کہے ہیں بیجاپور میں جانم ملک خوشنود اور مقیمی کے مرثیے غزل کے فارم میں ہیں۔گولکنڈے کے کم وبیش تمام شعرا نے مرثیے کے لیے غزل کے سانچے کو منتخب کیا۔

دکنی مرثیے ایجاز واختصار کا عمدہ نمونہ تھے۔دکنی مرثیہ غزل کی ہیئت کا رہین منت ہے دکن میں مرثیہ نگاری بالعموم اسی ادبی روپ سے مختص رہی اور جب شمالی ہند میں مرثیہ نگاری کا رواج عام ہوا تو مرثیے نے نئے انداز نیا رنگ روپ اور نئے پیکر اختیار کیے۔طویل مرثیے کہنے کی روایت شمال کی مرثیہ گوئی کی خصوصیت ہے۔دکنی شعرا نے طویل مرثیے بہت کم لکھے ہیں۔

دکنی مرثیے نوحے کی طرح مختصر ہیں۔یہ مرثیے سینہ کوبی کے دوران بطور نوحہ پڑھے جاتے تھے۔ماتم کے اس طرز کی طرف دکنی مرثیہ نگاروں نے اشارے کیے ہیں مثلاً عبداللہ قطب شاہ کہتا ہے۔

گھر اس میں لوگاں شدے کھڑے کر، لے کوٹ اپنے سینے دریغا
الاوے کھود، آگ پھونک سلگا، کریں گے پھر پھرا گن میں ماتم

ملک خوشنود نے مرثیے کی مقررہ ہیئت میں ایک اور جدت سے کام لیا ہے۔اس نے ہر شعر کے دونوں مصرعوں کے درمیان لفظ 'آہ' زائد کر دیا ہے اور ہر مصرعے ثانی کے آخر میں لفظ 'اللہ' بڑھا دیا ہے جس کا مقصد لحن سے مرثیہ خوانی کے دوران ماتمی لے کو تیز کرنا اور اثر آفرینی اور سوز وگداز میں اضافہ کرنا ہے۔

عام روش کے برخلاف مرتضی کے کلام میں مرثیے کی شعری ہیئت میں تنوع پیدا کرنے کا رجحان نمایاں ہے اس نے مروجہ طرز سے انحراف کر کے ایک مرثیہ مثنوی کے طرز میں پیش کیا ہے اور دوسرا مرثیہ غزل کے سانچے میں۔لیکن اس میں یہ جدت پیدا کی گئی ہے کہ مطلعے کے سوا تمام اشعار میں ردیف وقوافی کا التزام رکھا ہے۔مرتضی کا تیسرا مرثیہ بھی اس اعتبار سے منفرد اور چونکا دینے والا ہے کہ اس کی ردیف ''یا علی موسی رضا'' اچھوتی ہے۔موضوع کے اعتبار سے شاعر نے یہ جدت دکھائی ہے کہ اس مرثیے میں امام موسی رضا کی منقبت پیش کی ہے۔

بعض دکنی شعرا نے رثائیہ کلام کے لیے غزل کی صنف کے بجائے دوسری ہیتوں کو بھی اپنایا ہے اور ان میں ہیئت کی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں اور خفیف سی ردو بدل کے ذریعہ مرثیہ نگاری کی یکسانیت کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ افضل نے حضرت قاسم کی شہادت کے موضوع پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں مخمس کی ہیئت کو برتا ہے۔ یہ مرثیہ اس نے مخمس ترجیع بند کی شکل میں لکھا ہے:

حسین کا دلبر و دلدار قاسم حسین کا مونس و غمخوار قاسم

سہے رنج و الم بسیار قاسم جہاں سوں دیدہ خوں بار قاسم

گیا از بدعت کفار قاسم

بیجاپور کے مشہور مرثیہ نگار مرزا نے طویل مرثیے کہے ہیں اور مربع کی ادبی شکل کو بھی اپنایا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا نے روایتی طرز سے انحراف کر کے ہیئت کے بعض نئے سانچے بھی استعمال کیے۔ حضرت حر کے احوال میں مثنوی کی طرح قافیے کی پابندی کا التزام کیا ہے۔ حضرت قاسم کے احوال کا مرثیہ جو دوسوتیئس اشعار پر مشتمل ہے اس کی ایک انفرادیت اور ندرت یہ ہے کہ اس میں رخصت آمد رجز جنگ اور شہادت جو مرثیے کے اجزا تصور کیے جاتے ہیں موجود ہیں۔

دکنی مرثیہ نگاروں نے مرثیے کے موضوعات کو بھی اپنے مخصوص انداز میں ڈھال لیا ہے اور یہ صنف جو صرف بکا اور بین کے لیے مخصوص ہے، بعض دکنی شعرا کے یہاں اصلاح نفس پند وموعظت اور اخلاق آموزی کا وسیلہ بن گئی ہے۔ غلام علی لطیف اپنے ایک مرثیے میں پہلے چند حزینہ اشعار کہنے کے بعد اس طرح درس اخلاق دینے لگتا ہے۔

سنیسار کے گھراں کوں بقا نئیں فنا ہے یو

تکیہ تم اس گھراں پونکو یوں بسر کر د

وجہی نے اپنے ایک مرثیے میں مصائب کربلا بیان کرنے کے بجائے ایک ایسی محبوبہ کا سراپا پیش کیا ہے جو ماتم حسین میں مصروف ہے۔ اس نے اس کے حسن کی جس انداز میں تصویر کشی کی ہے وہ مرثیہ جیسی پاکیزہ اور سنجیدہ صنف کے شایان شان نہیں ہے۔ غواصی نے اپنے ایک مرثیے میں شہادت کا احوال یا مصائب اہلبیت بیان کرنے کے بجائے پورے مرثیہ میں خانوادہ رسالت اور بالخصوص امام حسین سے اپنی والہانہ عقیدت و وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ یہ مرثیہ گیارہ اشعار پر مشتمل ہے اور موضوع کے اعتبار سے اس لیے اچھوتا ہے کہ اس میں منقبت مناجات اور مرثیے کے عناصر یکجا ہو گئے ہیں اور غزل کی داخلیت نے مزاج اور آہنگ کے اعتبار سے اس مرثیے کو ایک خاص انفرادیت عطا کی ہے۔

دکنی مرثیہ نگاروں نے حالات کربلا کا تذکرہ کرتے ہوئے امام حسین کی مظلومیت اور ان پر روا رکھے جانے والے ظلم وستم کی مذمت کی ہے۔

دکنی مرثیہ نگاروں کے یہاں صنف مرثیہ کے مزاج و آہنگ اور اس کے موضوعات کی نوعیت اور فنی لوازم کا ایک مخصوص تصور موجود تھا۔ وہ مرثیہ نگاری کے لیے سوز و گداز اثر آفرینی طبعی مناسبت اور عقیدت مندی کو ضروری سمجھتے تھے۔ دکنی شعرا کے یہاں یہ صنف رونے رلانے اور گریہ و بکا کے مذہبی مقصد کے تحت پیش کی جاتی تھی۔ شعری محاسن کے اظہار یا نمود فن اور استادانہ کمال کے مظاہرے کے لیے نہیں۔ دکنی شعرا مرثیہ نگاری کو ثواب دارین حاصل کرنے کا وسیلہ تصور کرتے ہیں اور خون جگر سے مرثیہ لکھنے کو اصل مرثیہ نگاری کا لوازمہ مانتے ہیں۔

دکنی مراثی میں بعض تہذیبی میلانات اور ثقافتی آثار کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ دکن میں تعزیہ داری کسی خاص طبقہ اور مذہب سے مخصوص نہیں تھی بلکہ امیر غریب ہندو مسلم تمام رعایا اور بادشاہ سب نے اسے ایک تہذیبی ورثے کے طور پر قبول کر لیا تھا۔

مختلف دکنی تاریخوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔غواصی دکن کی مشترکہ تہذیب اور عزاداری کی تقریبات میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کے باہم شیر وشکر ہونے کے بارے میں کہتا ہے۔

تج باج آج ہندو مسلمان کے لکھن   دستا اہے خراب یو سنسار یا حسین

بعض دکنی مرثیہ نگاروں نے مسلسل مرثیے بھی کہے ہیں لیکن ان کی مثالیں بہت کم دستیاب ہوتی ہیں۔محمد قلی قطب شاہ کے بعد افضل کے ایک مرثیے میں جس کی ردیف 'چندر آیا محرم کا' ہے بعض روایتوں کی طرف اشارے ہیں۔مثلاً افضل ہلال محرم سے متعلق مختلف معتقدات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کائنات کی تخلیق روز عاشور ہی ہوئی تھی اور قیامت بھی اسی روز آئے گی۔اس دن کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے افضل کہتا ہے کہ یونس پیغمبر اسی روز مچھلی کے شکم میں داخل ہوئے تھے اور روز عاشور طوفان نوح آیا تھا اسی دن آدم جنت سے نکالے گئے تھے۔مرثیوں میں روایتیں نظم کرنے کی مثالیں محمد قلی قطب شاہ اور افضل کے کلام میں موجود ہیں۔دکنی مرثیہ نگاری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں روایتیں نظم کرنے کا میلان نہ ہونے کے برابر ہے دور مابعد کے مرثیہ نگاروں اور بالخصوص دبیرؔ نے اس میں کمال حاصل کیا۔

مسلسل مرثیہ گوئی کی ایک کامیاب کوشش ہمیں احمد گجراتی کے کلام میں نظر آتی ہے۔احمد گجراتی کا مرثیہ اکثر دکنی شعرا کے مرثیوں کے برخلاف سرخی سے بھی مزین نظر آتا ہے اور اس کا عنوان ''قصہ حضرت علی اکبر'' تحریر کیا گیا۔احمد گجراتی کے مرثیے کے مطالعے سے اس خیال کی بھی تردید ہوتی ہے کہ چہرہ، سراپا، رخصت آمد، رجز، جنگ شہادت اور بین جو مرثیے کے اجزائے ترکیبی سمجھے جاتے ہیں، ضمیرؔ خلیقؔ اور انیسؔ اور دبیرؔ کے اضافے ہیں ان سے تین سو سال قبل ایک دکنی مرثیہ نگار نے اپنے محدود لفظی خزانے اور اظہار کے ناتراشیدہ وسیلوں کی مدد سے مرثیے کے ان تمام اجزائے ترکیبی کو بڑے سلیقے کے ساتھ پیش کیا ہے۔اردو مرثیے میں پہلی بار یہ اجزا احمد گجراتی کے رثائیہ کلام میں اپنے حقیقی خدوخال کے ساتھ ابھرتے نظر آتے ہیں۔اشرف کی نوسر ہار میں بھی ان اجزائے مرثیے کی دھندلی جھلک دیکھی جاسکتی ہے لیکن احمد گجراتی کے بینیہ کلام میں یہ اجزا زیادہ واضح ہوکر اجاگر ہوئے ہیں۔

صنف مرثیہ میں شعرائے دکن کے لب ولہجے اور آہنگ ولفظیات کے بارے میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ وہ مرثیے کے حزینہ تیوروں اور رثائیہ مزاج سے پوری طرح آشنا تھے۔وہ اپنے مرثیوں میں المیہ فضا کی تخلیق پر قادر نظر آتے ہیں اور مرثیے کے آخری شعر تک اس کو قائم رکھنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

3.7 دکنی رباعی کی خصوصیات

دکن میں جہاں مختلف اصناف سخن پروان چڑھیں ہیں وہیں رباعی کی داغ بیل بھی پڑی۔دکنی رباعیوں کے مضامین اور موضوعات میں خاصی وسعت نظر آتی ہے۔دکن کے رباعی گوشعرا نے زندگی کے گوناگوں تجربات کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ رباعی میں سمودیا ہے۔دکنی شاعری کے سرمایہ میں دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں رباعیاں کم ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اکثر دکنی شعرا کا غالب رجحان مسلسل اور طویل شعری کارناموں کی طرف تھا۔دکنی رباعیاں مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے آتی ہیں کبھی منفرد اکائی کے روپ میں اور کبھی کسی طویل کارنامے کے درمیان ایک کڑی بن کر جیسے وجہی نے ''قطب مشتری'' کا قصہ بیان کرتے ہوئے حسب ضرورت مثنوی میں رباعیاں چسپاں کردی ہیں۔

رباعی سے شعرا نے مختلف کام لیے ہیں۔وجہی نے مثنوی کے قصے کو آگے بڑھانے میں رباعی سے مدد لی ہے۔دکنی ادب میں رباعی کبھی

کسی مربوط اور مسلسل شعری تخلیق کے ارتباط کو برقرار رکھتی ہے تو کبھی قصے کی تکمیل کے لیے استعمال ہوتی ہے اور کبھی خیال کی موثر ترجمانی کے لیے۔ دکنی مثنویوں میں رباعی کا استعمال کبھی بطور عنوان یا سرخی کے بھی ہوا ہے۔ بعض وقت مثنوی میں رباعی خیال کی مزید وضاحت کے لیے بھی استعمال کی گئی ہے۔ مثنوی میں کبھی رباعی محض کلام کی رونق بڑھانے اور اس کے حسن و تزئین میں اضافے کے لیے بھی شامل کی جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مثنوی نگاروں نے محض کچھ تبدیلی کے لیے یا یکسانیت اور یک سرے پن کے احساس کو دور کرنے کے لیے یا شعری کارنامے کے صوری حسن میں اضافہ کرنے کی خاطر اس صنف کو استعمال کیا ہے۔

دکنی شعرا نے خصّی اور غیر خصّی (جن میں چاروں مصرعوں میں قافیے کی پابندی کی جاتی ہے) دونوں رباعیاں لکھی ہیں لیکن غیر خصی رباعیاں خال خال نظر آتی ہیں۔ دکنی شعرا نے رباعی کی ہیئت کو جوں کا توں برقرار رکھا ہے یعنی صوری اعتبار سے اس صنف میں کوئی جدت پیدا نہیں کی حالاں کہ معنوی اعتبار سے انھوں نے رباعی کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔

جب ہم دکن کے رباعی گو شعرا کے فن کا جائزہ لیتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ لسانی تنگ دامانی زبان کی خام کیفیت اور مثالی نمونوں کی عدم موجودگی کے باوجود، فنی لوازم کے نقطہ نظر سے ان شعرا نے کتنی کامیاب اور جامع رباعیاں کہی ہیں۔

دکنی شعرا نے اس صنف کے اصول و قوانین کو ہر وقت قابل اعتنا سمجھا ہے۔ انھوں نے چار مصرعوں میں خیال کی تدریجی نشو و نما اور اس کے ارتقائی مدارج کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے خوب صورت رباعیاں کہی ہیں۔ دکنی شاعری کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ فیروزی، محمد قلی قطب شاہ، احمد گجراتی، غواصی، میراں جی خدانما، وجہی، علی عادل شاہ ثانی، نصرتی، محمد حسینی معظم میراں یعقوب اور ولی وغیرہ سب نے رباعی کی صنف میں طبع آزمائی کی اور اس میں کامیاب رہے۔

دکنی رباعیاں فکر و احساس کا خوب صورت امتزاج ہیں۔ دکنی شعرا کی رباعیاں محض فکریہ نہیں ہیں خیال کی پیش کشی کے علاوہ انہوں نے اس صنف سخن سے جذبات کی عکاسی کا بھی کام لیا ہے جس کی وجہ سے دکنی رباعیوں میں زبان کی قدامت سے قطع نظر شگفتگی، شیرینی، نکھار، شادابی اور رنگینی پیدا ہوگئی ہے۔ دکنی رباعیاں فکر و احساس، سادگی و پرکاری، متانت و شگفتگی اور تفکر و تاثر کا خوب صورت نمونہ نظر آتی ہے۔ دکنی غزل اور دکنی رباعیوں کی زبان کا موازنہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ رباعیوں کی زبان نسبتاً رواں، سادہ، شستہ اور صاف ہے۔

دکنی شعرا کی رباعیوں میں ردیف کا استعمال بھی دکھائی دیتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ، شاہی اور میراں یعقوب وغیرہ کی اکثر رباعیوں میں ردیف کا التزام نظر آتا ہے۔ ردیف کی وجہ سے ان رباعیوں میں ایک خاص غنائیت پیدا ہوگئی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے جن رباعیوں میں عشقیہ جذبات کی عکاسی کی ہے ان میں اکثر ردیف کی جھنکار سے رباعی کی موسیقت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

دکنی رباعیوں کے مضامین اور موضوعات میں جیسی رنگا رنگی، تنوع وسعت اور ہمہ گیری نظر آتی ہے ویسی بوقلمونی دور مابعد کی اردو رباعیوں میں کم ملتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دکنی شعرا نے رباعی کے دامن کو وسیع کیا اور اس کو ہر قسم کے موضوعات و تصورات اور جذبات و احساسات کے قابل بنا دیا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے فارسی میں رباعی کی صنف زیادہ تر پند و موعظمت اور اخلاق و تصوف کے نکات کی ترجمانی کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ دکنی شعرا نے رباعی میں محبوب مجازی کی صد جلوہ گری کو شامل کر کے اس صنف میں ارضیت مادیت اور واقعیت کا اضافہ کیا اور عشقیہ و شبابیاتی رباعیاں پیش کیں۔ کبھی عمر خیام کی طرح شراب و مستی کے مضامین باندھے اور کبھی زندگی کے اعلیٰ و ارفع قدروں کی طرف بلیغ

اشارے کیے اور کبھی رباعی میں صوفی کے دل کا خلوص اور اس کی تڑپ سمودی۔ دکنی شعرا نے رباعی کی صنف میں بھی جو صرف فلسفیانہ اور اخلاقی موضوعات کے لیے مناسب سمجھی جاتی تھی، رثائی عنصر شامل کر دیا۔

فلسفہ اور تصوف رباعی کے خاص موضوع رہے ہیں فارسی شعرا کی طرح دکنی شاعروں نے بھی فلسفیانہ نکات کی پیشکشی کے لیے اکثر اس صنف کا انتخاب کیا ہے۔ دکنی شعرا نے زیادہ تر فلسفہ فنا' دنیا کی بے ثباتی' موجودات عالم کے بے اعتبار محض اور زوال پذیر ہونے کو اپنی رباعیوں کا موضوع بنایا۔

پند وموعظت اور اخلاق آموزی ابتدا ہی سے صنعت رباعی کے خمیر میں موجود ہے۔ اردو شاعری میں رباعیوں کا جو سرمایہ ہے اس کا معتدبہ حصہ اخلاقی رباعیوں پر مشتمل ہے۔ فارسی شعرا نے بھی پند وموعظت کی باتوں کو رباعی کے سانچے میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ڈھالا تھا۔ دکنی شعرا کے سامنے فارسی رباعی کے بہترین نمونے موجود تھے۔ ان شعرا نے رباعی کے پیکر میں اخلاقی نکات پیش کر کے زندگی کی اعلیٰ قدروں کی اہمیت واضح کی ہے اور مقاصد کی بلندی انسانی سیرت کی عظمت اور کردار کی اصلاح کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔ صبر وقناعت حلم و بردباری، استقلال، سخاوت، انکساری اور نیکی کی تلقین کی ہے۔

عشقیہ رباعیوں کی جیسی خوب صورت مثالیں دکنی ادب میں موجود ہیں ویسی دور مابعد کے شعری سرمایے میں کم نظر آتی ہیں۔ دکنی رباعیاں اپنے اندر ایک خاص مٹھاس اور جاذبیت رکھتی ہیں۔ دکنی ادب میں بکثرت عشقیہ رباعیاں موجود ہیں۔ دکنی شعرا نے جذبات وواردات عشق کی بڑی موثر تصویریں رباعیوں میں پیش کی ہیں عشق کی گوناگوں کیفیات کی دلفریب مصوری نے دکنی رباعیوں میں رنگینی، شادابی اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ دکنی رباعیوں میں ہجر کی تنہائیوں کی کسک بھی ہے اور قرب کا نشہ بھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دکنی رباعی غزل سے بڑی حد تک اثر پذیر ہوئی ہے۔ دکنی رباعیوں پر اکثر جگہ تغزل کی چھاپ گہری نظر آتی ہے۔

دکنی ادب کی تمام اصناف سخن میں تصوف کی جھلک موجود ہے۔ رباعی ایک ایسی صنف تھی جس میں فارسی شعرا نے ابتدا ہی سے بادہ وساغر کے پردے میں مشاہدہ حق کی گفتگو کی تھی۔ وحدت الوجود، تجلیات الٰہی کی بوقلمونی، نمود بے نمود، مشاہدہ الٰہی، طہارت نفس' ضبط نفس، تزکیہ قلب' مقامات سلوک' مراقبہ' مقام فنا وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ مضامین ایسے ہیں جن کے ذکر سے دکنی رباعیاں خالی نہیں ہیں۔ شعرا نے مدحیہ رباعیاں بھی کہی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ مدحیہ رباعیوں میں بادشاہ کی تعریف کی گئی ہے۔

دکنی شعرا نے رباعی میں حمد کے مضامین بھی باندھے۔ ان کی رباعیوں میں مناجاتی انداز بھی نظر آتا ہے مناجاتی رباعیوں میں شعرا نے خدا سے دعا مانگی ہے۔ مناجاتی رباعیاں ابتدائی دور سے لے کر آج تک کہی جاتی رہی ہیں۔ دکن کے رباعی گویوں نے کبھی ہدایت حاصل کرنے اور صراط مستقیم پر گامزن رکھنے کی التجا کی ہے تو کبھی افلاس ونکبت سے محفوظ رہنے اور کبھی اعلی روحانی درجوں تک پہنچنے کی دعا مانگی ہے۔

دکن کی مذہبی رباعیوں میں نعتیہ رباعیوں کا بھی پتہ چلتا ہے اس کے علاوہ منقبت کے انداز میں بھی بہت سی رباعیاں کہی گئی ہیں ان میں حضرت علی یا بزرگان دین مثلاً خواجہ بندہ نواز وغیرہ کی مدح کی گئی ہے۔ منقبت کے علاوہ دکنی شعرا نے غم حسین میں رثائیہ رباعیاں بھی موزوں کی ہیں۔ ہندی شاعری میں عورت جذبات عشق کا اظہار کرتی ہے اور اس کا مخاطب مرد ہوتا ہے۔ دکنی شعرا نے رباعیوں میں ہندی شاعروں کی طرح جذبات عشق کا اظہار عورت کی زبان سے کیا ہے اور صیغہ تانیث استعمال کیا ہے۔ رباعیوں میں اس انداز کی مثالیں دکنی شعرا کے سوا کہیں اور نہیں

ملتیں۔ محمد قلی قطب شاہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے رباعیوں میں عورت کی زبان سے روداد عشق سنائی ہے، محمد قلی کے بعد وجہی، غواصی اور بعض دوسرے شعرا نے اس روایت کی پیروی کی۔

3.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ دکنی شاعری اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے شمالی ہند کی شاعری سے مختلف ہے۔

☆ دکنی شاعری میں مقامی ماحول اور دیسی عناصر کی بہتات نظر آتی ہے۔

☆ دکنی شعرا نے دکنی تہذیب وثقافت، دکنی روایات اور دکنی آب ورنگ سے اپنی شاعری کا مواد اخذ کیا ہے۔

☆ دکنی شاعری میں اسلوب واظہار کی سادگی نظر آتی ہے۔ دکنی شعرا کی تشبیہات، استعارے وغیرہ مانوس اور زیادہ تر مقامی ماحول سے اخذ کردہ ہوتے ہیں۔ دکنی شعرا نے عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔

☆ شمالی ہند کی مثنویوں کے مقابلے میں دکنی مثنویوں میں موضوعات کا تنوع اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ دکنی میں بزمیہ، رزمیہ، تاریخی، سوانحی، مذہبی، صوفیانہ، اخلاقی ہر طرح کی مثنویاں لکھی گئیں ہیں۔

☆ دکنی شعرا نے ہندوستانی قصوں اور سنسکرت قصوں کے فارسی تراجم سے اخذ واستفادہ کیا۔

☆ دکنی غزل بھی شمالی ہند کی غزل سے مختلف ہے۔ دکنی غزل میں محبوب کی جنس واضح طور پر مونث ہے جب کہ شمالی ہند کی غزل میں اس کی جنس مبہم ہے یا اس کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ دکنی غزل میں مقامی عناصر اور دکنی روایات پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔

☆ دکنی قصائد میں بھی بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ بادشاہوں اور امرا کے علاوہ دکنی میں بزرگان دین کی منقبت شاہی محلات اور باغات کی تعریف میں قصیدے لکھے گئے ہیں۔

☆ دکنی قصائد کے اشعار میں ایک طرح کے تسلسل کا احساس ہوتا ہے اور یہ قصائد موضوعاتی نظم معلوم ہوتے ہیں۔

☆ دکنی میں کربلائی اور شخصی مرثیے لکھے گئے۔ دکنی مرثیوں میں روایات اور مناظر کے بیان سے زیادہ واقعہ شہادت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

☆ دکنی مرثیے مختصر ہوتے ہیں اور زیادہ تر غزل کی ہیئت میں ہیں۔ لیکن مربع اور مخمس کی ہیئت میں بھی مرثیے لکھے گئے۔

☆ دکنی رباعیات میں موضوعات کی رنگارنگی ملتی ہے۔ صوفیانہ، اخلاقی، عاشقانہ، خمریہ اور دیگر مسائل پر مبنی رباعیاں لکھی گئیں۔

3.9 کلیدی الفاظ

الفاظ		معنی
اجتناب	:	پرہیز کرنا، بچنا
مبتدی	:	شروع کرنے والا، ابتدا کرنے والا
منتہی	:	انتہا کو پہنچنے والا

خلوت	:	تنہائی، مکان کا غیر سے خالی ہونا
جلوت	:	خلوت کی ضد، ظاہر کرنا، لوگوں کے درمیان آنا
رزم	:	جنگ، لڑائی
اجتہاد	:	دل سے سوچ کر کوئی عمدہ بات نکالنا
عزا	:	ماتم کرنا، کسی کی وفات پر اظہارِ غم کرنا

3.10 نمونہ امتحانی سوالات

3.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ہندوستانی قصے پر مبنی اردو کی پہلی مثنوی کون سی ہے؟

2۔ کس شاعر نے اپنی مثنوی میں سنسکرت کے الفاظ کم سے کم استعمال کرنے کا دعویٰ کیا؟

3۔ ''دکن کا کیا شعر جوں فارسی'' یہ مصرع کس شاعر کا ہے؟

4۔ دکنی زبان کا پہلا قصیدہ گو شاعر کون ہے؟

5۔ دکنی میں پہلا شخصی مرثیہ کس نے لکھا؟

3.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دکنی شاعری کی دو اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ دکنی رباعی کے موضوعات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ دکنی مثنویوں کی انفرادیت واضح کیجیے۔

3.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دکنی غزل کی امتیازی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ دکنی مرثیوں کے خدوخال پر روشنی ڈالیے۔

3.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی
2۔	اردو مثنوی کا آغاز وارتقا	عبدالقادر سروری
3۔	تاریخ ادب اردو جلد اول	ڈاکٹر جمیل جالبی
4۔	دکنی رباعیاں	ڈاکٹر سیدہ جعفر
5۔	مجلّہ عثمانیہ دکنی ادب نمبر	
6۔	رسالہ فکر و تحقیق دہلی	تدریس دکنی ادب نمبر

اکائی 4: بہمنی سلطنت کا قیام

(دکنی شاعری کا آغاز)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 بہمنی دور کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر

4.2.1 بہمنی دور میں اردو کے فروغ کے اسباب

4.2.2 بہمنی سلطنت کا ابتدائی زمانہ

4.3 بہمنی دور کے علمی اور ادبی کارنامے

4.3.1 میراں جی شمس العشاق

4.3.2 سید شاہ اشرف بیابانی

4.3.3 دیگر شعرا

4.4 اکتسابی نتائج

4.5 کلیدی الفاظ

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

4.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

اُردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی۔ محمود غزنوی اور محمد غوری نے پنجاب میں اپنی حکومتیں قائم کیں تو اُردو کی ابتدا کے حالات پیدا ہوئے۔ محمد غوری نے دہلی پر قبضہ کر کے جب قطب الدین ایبک کو وہاں کا حاکم بنا دیا تو مستقل طور پر فارسی اور ترکی بولنے والے آباد ہو گئے۔ مقامی زبانیں الگ تھیں۔ مقامی زبانوں میں جب دوسری زبانوں یعنی فارسی اور کچھ عربی اور ترکی کے بعض الفاظ شامل ہونے لگے اور ایک نئی زبان کی صورت پیدا

ہوئی، اس کو ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ جس طرح حیدر آباد کی ہر چیز کو حیدر آبادی کہا جاتا ہے اور عرب کی ہر چیز کو عربی کہا جاتا ہے۔ ہند کی مناسبت سے ہندی یعنی ہندوستان کی ہر چیز کو ہندی کہا جاتا تھا اور اب بھی کہا جاتا ہے جیسے عرب میں ہندوستانیوں کو ''الہندی'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اُردو بھی مدتوں تک ہندی یا ہندوی کہلائی۔ دہلی میں جب یہ پھلنے پھولنے لگی تو ''زبان دہلوی'' کے نام سے یاد کی گئی۔ علاءالدین خلجی کی فوجوں کیساتھ جب گجرات پہنچی تو گجری کہلائی۔ خلجی اور تغلقی فوجیوں کی زبان پر چڑھ کر جب دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ ولی کی سخن وری کی داد دیتی ہوئی اس کے ساتھ جب دوبارہ دلی پہنچتی ہے تو ''ریختہ'' کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ قلعہ معلیٰ (لال قلعہ) میں بولی جانے لگی تو ''اُردوئے معلیٰ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ بہمنی دور میں وہ صرف بول چال کی زبان نہیں رہی بلکہ ادب کے اونچے درجے پر فائز ہوئی۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ بہمنی دور کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر کو بیان کر سکیں۔

☆ بہمنی دور میں اردو کے فروغ کے اسباب کو واضح کر سکیں۔

☆ بہمنی سلطنت کے ابتدائی زمانے سے واقف ہو سکیں۔

☆ بہمنی دور کے علمی اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ بہمنی دور کے شعرا کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔

4.2 بہمنی دور کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر

اُردو زبان کا آغاز شمالی ہند میں ہوا۔ وہاں دو تین سو سال تک نشو و نما پانے کے بعد اس نے دکن کا رخ کیا۔ سیاسی حالات و واقعات کی وجہ سے وہ دکن پہنچی۔ علاءالدین خلجی کی سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے اُردو زبان کو دکن میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ علاءالدین نے 1297ء میں گجرات کو فتح کر کے اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا۔ گجرات کوئی سو سال تک سلطنت دہلی کا حصہ بنا رہا۔ گجرات فتح کرنے کے بعد 1310ء میں علاءالدین نے دکن اور مالوہ پر حملہ کر کے انھیں بھی فتح کر لیا۔ چوں کہ یہ علاقے دہلی سے کافی دور تھے اس لیے یہاں موثر طور پر حکمرانی کرنے کے لیے گجرات، دکن اور مالوہ کے علاقوں کو علاءالدین نے سو سو مواضعات میں تقسیم کر دیا اور ہر موضع پر ایک ایک افسر مقرر کر دیا جو ''امیر صدہ'' کہلاتا تھا۔ امیرانِ صدہ یہاں کے بے تاج بادشاہ ہوا کرتے تھے۔ مال گزاری وصول کرنے سے لے کر یہاں کا ہر چھوٹا بڑا انتظام ان ہی کے سپرد ہوتا تھا۔ چوں کہ انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے انھیں مستقل طور پر یہیں رہنا تھا اس لیے وہ اپنے اہل و عیال اور متعلقین کو بھی ساتھ لے آئے تھے۔ دکن اور گجرات ہی کو انہوں نے اپنا وطن بنالیا تھا۔

امیران صدّہ دکن آنے سے پہلے شمالی ہند میں آباد تھے اور وہاں ان کے آباواجداد صدیوں سے بسے ہوئے تھے اور اس لیے دربار اور سرکار سے ہٹ کر اُردو یا ہندوی ہی سے اپنا کام نکالتے تھے۔ جب گجرات اور دکن میں انہوں نے سکونت اختیار کر لی تو اسی زبان سے اپنے روزمرہ کا کام نکالنے لگے۔ یہی زبان رابطے کی زبان بن گئی تھی۔ بعد کے حالات نے اس صورت حال کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ خلجی کے بعد محمد تغلق نے امیرانِ صدّہ کے اس نظام کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کو اور مضبوط بنانے کے لیے احکام صادر کیے۔ اس نظام کی جہ سے اُردو زبان کو جو فائدہ حاصل ہوا اس کے

بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''اس نظام کی وجہ سے شمال کے لیے دکن اور گجرات کے راستے کھلے رہے۔تجارت، لین دین اور دوسرے معاشرتی امور مضبوط تر ہوتے رہے اور ساتھ ساتھ اُردو زبان کا حلقۂ اثر بھی بڑھتا اور پھیلتا رہا اور ان علاقوں میں یہ زبان بین الاقوامی زبان کی حیثیت میں پھلتی پھولتی رہی۔وقت کے ساتھ ساتھ جب بول چال کی زبان سے گزر کر ادبی سطح پر استعمال میں آئی اور صوفیوں، شاعروں نے اسے اپنے اظہار مقصد کا ذریعہ بنایا تو گجرات میں اس کے ادبی روپ کو ''گجری'' نام دیا گیا اور دکن میں یہ دکنی کہلائی'' (تاریخ ادب اُردو۔صفحہ 13)

محمد تغلق کے ایک اور تاریخی اقدام نے اُردو کو دکن میں مستحکم کرنے میں بڑا اہم حصہ ادا کیا۔دہلی سے دکن کی دوری کا اندازہ خلجی کو بھی تھا، اسی وجہ سے اس نے امیران صدہ کو مقرر کیا تھا۔محمد تغلق انتہا پسند بادشاہ تھا۔اس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ خود امیرانِ صدہ بھی اس کے قابو سے نکل سکتے ہیں۔دکن پر اپنی گرفت کو زیادہ مضبوط بنانے کے لیے اس نے اپنے پایہ تخت ہی کو دہلی سے دولت آباد منتقل کر دیا۔اس طرح 1327ء میں دہلی کی ساری آبادی دولت آباد منتقل ہوگئی۔اس سارے عمل سے دکنی زبان کو اور قوت کے ساتھ پھلنے پھولنے اور فروغ پانے کا موقع مل گیا۔ بعد میں تغلق نے دولت آباد سے پھر دہلی کو پایہ تخت بنایا تو بے شمار لوگ دکن ہی میں رہ گئے۔اور امیرانِ صدہ کے زیر سایہ آ گئے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیران صدہ زیادہ طاقتور ہو گئے۔محمد تغلق کے آخری زمانے میں تمام امیران صدہ نے متحدہ ہو کر بغاوت کر دی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔اور اپنے میں سے ایک کو بادشاہ چن لیا۔یوں 1347ء میں عظیم الشان بہمنی سلطنت کی بنیاد پڑی۔بہمنی حکومت میں دکنی زبان کے فروغ اور دکنی کلچر کی ابتدا کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''اب دکن کی سلطنت شمال سے آئے ہوئے ان ترک خاندانوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو خود کو دکنی کہنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔دکنی ان کی زبان تھی جس پر انہوں نے دکنی قومیت اور کلچر کی بنیاد رکھی تھی۔بہمنی سلطنت کی زبان خافی خان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، ہندوی تھی'' (تاریخ ادب اُردو، صفحہ 14)

بہمنی خاندان کا پہلا بادشاہ علاء الدین حسن شاہ بہمنی تھا۔بہمنی عہدِ حکومت 1350ء سے شروع ہو کر 1525ء پر ختم ہوتا ہے۔

4.2.1 بہمنی دور میں اُردو کے فروغ کے اسباب:

بہمنی عہد میں اُردو زبان اور ادب کو جو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔اس کے کئی اسباب تھے۔قدیم اُردو یا دکنی جو رابطے کی زبان بنی اس کی سب سے اہم اور بڑی وجہ یہ تھی کہ دکن میں دراوڑی خاندان کی کئی زبانیں رائج تھیں جیسے تلگو، کنڑی، ملیالم اور تامل۔یہ زبانیں ہندآریائی زبانوں سے اتنی الگ اور مختلف تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی زبان عام رابطے کی زبان نہیں بن سکتی تھی۔اسی وجہ سے قدیم اُردو جس کو بولتے ہوئے خلجی اور تغلق کے زمانے میں شمال کے لوگ دکن آئے۔انہوں نے اسی کو رابطے کی زبان بنایا۔اس کے علاوہ قدیم اُردو یعنی دکنی کو جو سرکاری اور درباری سرپرستی حاصل ہوئی اس کا اہم سبب سیاسی تھا۔جب کبھی کوئی ملک اور قوم آزادی حاصل کرتی ہے اور خود مختار ہوتی ہے، اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ حاکم ملک اور حاکم قوم سے ہر لحاظ سے خود مختار ہو اور الگ ہو۔وہ ہر ممکن طریقے سے اپنی الگ پہچان اور شناخت بنانے کی کوشش کرتی ہے۔بالکل اسی طرح بہمنی سلطنت نے بھی اپنی شناخت بنانے کے لیے تغلقیہ سلطنت سے اپنے آپ کو الگ کیا۔تغلق سلطنت میں فارسی نہ صرف سرکاری اور درباری

زبان تھی بلکہ علمی اور ادبی اغراض کے لیے بھی صرف فارسی ہی استعمال ہوتی تھی۔بہمنی عہد میں قدیم اُردو یا دکنی پر زیادہ توجہ دی گئی اور کئی اہم دکنی شاعر اس دور میں ملتے ہیں۔

بہمنی دور میں جو''نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات'' قائم ہوئیں اس کے تعلق سے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''1347ء میں علاءالدین حسن بہمن شاہ نے خودمختار حکومت قائم کر لی۔پہلے پہل اس کا پایہ تخت دولت آباد تھا لیکن جلد ہی اس نے گلبرگہ پائے تخت بنایا اور اس کا نام حسن آباد رکھا۔بہمنی خاندان کے کل اٹھارہ حکمران ہوئے۔ان میں بڑے قابل اور علم دوست بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے دکن میں نئی تہذیبی روایات کو ترقی دی اور نئی ادبی اور لسانی روایات کی بنیاد رکھی۔'' (اُردو کی ادبی تاریخ صفحہ 68)

علاءالدین خلجی کے دکن فتح کرنے سے پہلے بھی کئی صوفیائے کرام دکن آئے تھے جنہوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ''نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات'' کو فروغ دینے میں بڑا حصہ ادا کیا۔دکن میں علاءالدین خلجی کے آنے سے پہلے جن بزرگوں کے نام ملتے ہیں ان میں حاجی رومی، سید شاہ مومن، بابا سید مظہر عالم، شاہ جلال الدین گنج رواں، سید احمد کبیر حیات قلندر، بابا شرف الدین، بابا شہاب الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔علاءالدین خلجی کی فتح دکن کے بعد جو بزرگ دکن آئے اور جنہوں نے ایک نئی زبان کو یہاں ترویج دینے میں اہم کام انجام دیا ان کے تعلق سے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''علاءالدین کی فتح دکن کے بعد روحانی پیشوائی کے اس سلسلے کو اور فروغ حاصل ہوا اور یہاں بھی پیر مقصود، پیر جمنا، شاہ منتجب الدین زرزری بخش پیر مٹھے حضرت گیسودراز کے والد سید یوسف شاہ راجو قتال، شاہ برہان الدین غریب، شیخ ضیاءالدین اور بہت سے دوسرے صوفیائے کرام دکن کے مختلف علاقوں میں سجادے بچھائے درستیٔ اخلاق و تبلیغ دین میں مصروف نظر آتے ہیں۔ان بزرگوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کے الفاظ شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولا تیار کیا جس سے اظہار کی مشکل حل ہوگئی۔اُردو زبان کی ابتدائی ترقی میں ان لوگوں کی نامعلوم کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔''

(تاریخ ادب اُردو، صفحہ 151)

بزرگان دین کے ملفوظات جو ہم تک پہنچے ہیں۔ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر ہندوستانی زبانوں کے مختلف اثرات پڑ رہے تھے۔ان کی زبان کو کسی ایک زبان تک محدود نہیں کہا جا سکتا۔جمیل جالبی نے شاہ برہان الدین غریب، زین الدین خلد آبادی، شاہ کو چک ولی کے ملفوظات کے بارے میں کہا ہے:

''یہ جملے نہ خالص پنجابی ہیں اور نہ خالص سندھی، سرائیکی یا اُردو، ہیں۔مختلف زبانوں کے اثرات ان میں ملے جلے نظر آرہے ہیں''۔ (تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص 120)

4.2.2 بہمنی سلطنت کا ابتدائی زمانہ:

بہمنی عہد کا ابتدائی زمانہ یعنی علاءالدین حسن بہمن شاہ کا زمانہ زیادہ تر نئی حکومت کو مستحکم بنانے میں گزرا۔لیکن اس کے باوجود اس کے زمانے میں کئی علما و فضلا کو پایۂ تخت میں مدعو کیا گیا۔علاءالدین کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ اول تخت نشین ہوا۔اس نے بہمنی سلطنت کو پرشکوہ بنانے میں

بڑا کام کیا۔ بہمنی دربار کی شان وشوکت اسی کے زمانے میں قائم ہوئی۔محمد شاہ کے زمانے میں کئی روحانی پیشوا' صوفیا اور بزرگ گلبرگہ میں تھے۔ وہ جس طرح عوام کی اصلاح کرتے تھے اور بادشاہ کو بھی راہ راست دکھاتے تھے اور اُردو زبان کی ترویج واشاعت کرتے تھے۔اس کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''(صوفیائے کرام) عوام حتیٰ کہ بادشاہوں کے اخلاق و عادات پر نظر رکھتے اور جب ضرورت پڑتی اس کی اصلاح کی کوشش کرتے۔حضرت زین الدین کے کہنے سے محمد شاہ نے شراب پینا چھوڑ دیا تھا اور حدود سلطنت میں شراب کی دکانیں بند کرادی تھیں۔حضرت زین الدین کا کام بھی عوام کو ارشاد و ہدایت کرنا تھا اور وہ دکن کے لوگوں کو پرانی اُردو ہی میں احکام دین سمجھاتے تھے۔'' (اُردو کی ادبی تاریخ صفحہ 70)

محمد شاہ کے زمانے میں حضرت عین الدین گنج العلم کا انتقال ہوا۔وہ بیجا پور چلے گئے تھے انہوں نے دکنی عوام کی ہدایت اور اصلاح کے لیے کچھ رسالے دکنی میں لکھے تھے،لیکن یہ اب دستیاب نہیں ہیں۔

محمد شاہ کے بعد اس کا بڑا بیٹا مجاہد شاہ اور اس کے بعد علاء الدین کا دوسرا بیٹا داؤ د شاہ تخت نشین ہوئے۔اس زمانے میں امرا کی کشمکش کی وجہ سے سلطنت کا سکون متاثر ہو گیا تھا۔بعد میں محمد شاہ ثانی جب تخت نشین ہوا تو شورشیں کم ہوگئیں اور سکون بحال ہوا۔محمد شاہ ثانی نے بھی علما اور شعرا کو اپنے دربار میں مدعو کیا۔فارسی کے شہرۂ آفاق شاعر حافظ شیرازی کو بھی محمد شاہ نے مدعو کیا تھا،لیکن وہ نہیں آئے۔محمد شاہ خود بھی فارسی کا شاعر تھا۔محمد شاہ کے انتقال کے بعد پھر سلطنت میں بے چینی پیدا ہوگئی اور اقتدار کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی،جس کی وجہ سے ایک سال کے اندر دو بادشاہ غیاث الدین اور شمس الدین تخت پر بٹھائے بھی گئے اور اتارے بھی گئے۔البتہ فیروز شاہ کی تخت نشینی کے بعد یہ ہنگامے ختم ہوگئے۔فیروز شاہ علم وادب کی دل سے قدر کرتا تھا اس لیے اس کے دربار میں علما وصوفیا جمع تھے۔فیروز شاہ کے عہد کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز گلبرگہ میں رونق افروز ہوئے۔آپ نے یہاں بھی رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔آپ فارسی کے ساتھ کبھی کبھی اُردو میں بھی درس دیا کرتے تھے۔آپ سے کئی تصانیف اُردو کی منسوب کی جاتی ہیں۔''معراج العاشقین'' بھی آپ سے منسوب کی جاتی تھی لیکن بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ آپ کی تصنیف نہیں ہے۔اس کے علاوہ ''شکار نامہ''۔''تمثیل نامہ''۔'' خلاصہ توحید'' اور'' تلاوت الوجود'' آپ کے نام سے منسوب ہیں،لیکن درحقیقت آپ کی تصانیف نہیں ہیں۔آپ نے عورتوں کے لیے بھی ایک چھوٹی سی نظم ''چکی نامہ'' لکھی تھی۔آپ کے بڑے فرزند جن کا انتقال آپ کی زندگی میں ہوگیا تھا' دکنی کے شاعر تھے۔ان کا نام محمد اکبر حسینی تھا۔کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک مختصر سا رسالہ دکنی میں لکھا تھا۔اس میں بھی وعظ اور نصیحت کی باتیں درج تھیں،لیکن یہ رسالہ بھی کسی محقق کو نہیں ملا۔

فیروز شاہ کے بعد احمد شاہ تخت نشیں ہوا۔اس کو بھی بزرگان دین پر اعتقاد تھا اور ان کے ساتھ بے حد عزت اور احترام سے پیش آتا تھا۔ فیروز شاہ کے بعد احمد خاں بہمنی سلطنت کے تاج وتخت کا وارث بنا۔اس نے اپنا پایۂ تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل کیا۔بیدر میں اس نے جو عالی شان محل اور عمارتیں بنوائیں وہ فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔اس کے زمانے میں کئی ایرانی شاعر بیدر کے دربار میں آئے۔فارسی کے شاعر آذری کو احمد شاہ نے ملک الشعرا بنایا تھا۔آذری دکنی میں بھی شاعری کرتا تھا،لیکن اس کا دکنی کلام اب دستیاب نہیں ہے۔اس نے ''بہمن نامہ'' کے نام سے فارسی میں بہمنی سلاطین کی منظوم تاریخ لکھی تھی۔

احمد شاہ کا جانشین علاء الدین ثانی تھا۔ اس کے عہد میں کئی علما اور فضلا موجود تھے۔ حضرت گیسو دراز کا اسی کے عہد میں انتقال ہوا۔ اس کے دور میں علمی اور فنی ترقی جاری رہی۔ اس نے قمار بازی اور مئے نوشی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ علاء الدین ثانی کے بعد ہمایوں شاہ جسے ظالم کا لقب ملا تھا تخت نشیں ہوا۔ جو علما ہمایوں کے تخت نشیں ہونے کے مخالف تھے جب ہمایوں تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ان کو چن چن کر قتل کرنے لگا۔ اس کے باوجود اس کے عہد میں کئی عالم اور شاعر تھے۔ شاہ طاہر استرا آبادی اور ملا محمد تقی نظیری اس کے زمانے کے فارسی کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ محمود گاواں تجارت کی غرض سے بیدر آیا۔ ہمایوں نے اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اسے اپنے لشکر کا سالار بنا دیا۔ ہمایوں کے بعد اس کا آٹھ سالہ بیٹا احمد شاہ ثالث تخت نشین ہوا۔ لیکن سلطنت کا کاروبار اس کی والدہ نے سنبھال لیا۔ اس خاتون نے بڑی قابلیت کے ساتھ سلطنت پر حکمرانی کی۔ احمد شاہ کے بعد محمد شاہ لشکری نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس کے عہد حکومت میں محمود گاواں نے بہت عروج حاصل کیا۔ اس نے علما و فضلا کی سرپرستی کی اور ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا جو آج بھی بیدر میں موجود ہے۔ اس مدرسہ کا ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا۔ محمد شاہ نے یوسف عادل خاں کو سپہ سالار بنا دیا تھا۔ جس نے بعد میں عادل شاہی حکومت قائم کی۔ بعد میں باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو آفاقی کہا جانے لگا۔ جب آفاقیوں اور دکنیوں میں جھگڑے شروع ہوئے تو ان جھگڑوں میں محمود گاواں کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد محمد شاہ لشکری کا انتقال ہوا۔ محمد شاہ بہمنی سلطنت کا آخری عظیم الشان بادشاہ تھا۔ محمد شاہ کے جانشینوں میں محمود شاہ، احمد شاہ رابع، علاء الدین، ولی اللہ اور کلیم اللہ کا زمانہ بڑا ہی پر آشوب رہا ہے۔ محمود شاہ نے گو چھبیس سال تک حکومت کی لیکن آپسی نا چاقی اور دکنیوں اور آفاقیوں کے جھگڑوں نے سلطنت کی چول چول ڈھیلی کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہمنی دور کے صوبے داروں نے ایک کے بعد ایک خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بہمنی سلطنت پانچ سلطنتوں میں بٹ گئی۔ اور یہ عظیم سلطنت جو 1347ء میں قائم ہوئی تھی 1525ء میں ختم ہو گئی۔

4.3 بہمنی دور کے علمی اور ادبی کارنامے

اب تک کی تحقیق کے مطابق دکنی اُردو کی قدیم ترین مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے۔ ایک زمانے تک ''معراج العاشقین'' کو اُردو کی پہلی تصنیف سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کی جاتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ''معراج العاشقین کا مصنف'' کے عنوان سے جو کتاب لکھی ہے اس میں مدلل انداز میں انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ''معراج العاشقین'' نہ تو حضرت گیسو دراز کی تصنیف ہے نہ ان کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ بلکہ ان کے زمانے کے تقریباً دوسو سال کے بعد مخدوم شاہ حسینی نے اس کو لکھا ہے۔ اس طرح ''معراج العاشقین'' کو اُردوئے قدیم یا دکنی کی پہلی تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔

مذکورہ تحقیق کے بعد فخر دین نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' اُردو کی قدیم ترین تصنیف قرار پاتی ہے۔ یہ مثنوی احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں لکھی گئی ہے۔

احمد شاہ کا زمانہ 825-838ھ م 1421-1434ء رہا ہے۔ احمد شاہ کے دور کی تصنیف ہونے کی داخلی شہادت خود مثنوی میں موجود ہے۔ نظامی نے لکھا ہے:

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار   پرت پال سینسار ' کردار ادھار
دھنیں تاج کا کون راجا ابھنگ   کنور شاہ کا شاہ احمد بھجنگ

مثنوی میں بار بار مصنف نے اپنا نام ''فخر دین نظامی'' لکھا ہے۔مثنوی کا نام کیا تھا اس کا پتا نہیں چلتا کیوں کہ اس مثنوی کا جو واحد مخطوطہ ملتا ہے اس کا ابتدائی ورق اور بیچ کے کئی اوراق غائب ہیں اور آخر کے حصہ میں اس مثنوی کا نام نہیں ملتا۔چوں کہ مثنوی کی کہانی کدم راؤ اور پدم راؤ کے کرداروں پر استوار ہوئی ہے۔اس لیے مولوی نصیرالدین ہاشمی نے اس مثنوی کا نام کدم راؤ پدم راؤ رکھ دیا ہے۔ بعد میں جمیل جالبی نے اسے مرتب کیا اور اسی نام سے شائع بھی کر دیا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا قصہ کسی مشہور ہندوستانی کہانی سے ماخوذ ہے۔اس مثنوی کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ کدم راؤ راجہ ہے اور اس کا وزیر پدم راؤ ہے۔کدم راؤ ایک دن اعلیٰ ذات کی ناگنی کو ایک کم ذات کے سانپ کے ساتھ میل کھاتا دیکھ لیتا ہے۔وہ تلوار نکال کر کم ذات کے سانپ کو فوراً ہی قتل کر دیتا ہے اور ناگنی کو بھی مارتا ہے لیکن اس کی دم کٹ جاتی ہے اور وہ جھاڑیوں میں چھپ جاتی ہے۔راجہ کدم راؤ کو عورت کی بے وفائی کا یقین ہو جاتا ہے اور وہ اداس رہنے لگتا ہے۔رانی سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ پدم راؤ وزیر بھی سمجھاتا ہے لیکن کدم راؤ دنیا سے بیزار ہو کر جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت میں رہنے لگتا ہے۔وہ اکھر ناتھ نامی جوگی سے بے حد متاثر ہوتا ہے' کیوں کہ وہ اپنی روح کو اپنے بدن سے نکال کر دوسرے بدن میں منتقل کرنے کا منتر جانتا تھا۔وہ کدم راؤ کو بھی یہ منتر سکھاتا ہے لیکن ایک دن دھوکے سے راجہ کو طوطی بنا دیتا ہے اور خود راجہ بن بیٹھتا ہے۔ایک دن وہ پدم راؤ سے ایک ''فرمائش نامعقول'' کرتا ہے۔ جب پدم راؤ اسے پورا کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو اس پر بہت برہم ہوتا ہے تو ادھر کدم راؤ طوطی کے روپ میں اڑتے اڑتے اپنے محل پہنچتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اصل کدم راؤ وہی ہے۔پچھلی باتیں جب وہ سناتا ہے تو پدم راؤ کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہی کدم راؤ راجہ ہے۔ پدم راؤ موقع پا کر جب اکھر ناتھ گہری نیند میں رہتا ہے اسے ختم کر دیتا ہے۔کدم راؤ منتر کے زور سے پھر اپنی اصلی حالت میں آ جاتا ہے اور محل میں واپس آ کر ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔

مثنوی ''کدم راؤ اور پدم راؤ'' کی زبان بے حد مشکل ہے اور اس کو سمجھنا بھی بہت مشکل ہے۔اس مثنوی کی قدامت کے باوجود اس میں جو خوبیاں ملتی ہیں اس کے تعلق سے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' ساڑھے پانچ سو سال سے زیادہ پرانی تصنیف ہے اور اُردو ادب کی اولین روایت کی نمائندہ ہے۔جس کثرت سے اس میں ضرب الامثال اور محاورے استعمال ہوئے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ زبان صدیوں پرانی ہے جو سینکڑوں سال کی مسافت طے کر کے' اپنے ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزر کر ادبی سطح پر استعمال میں آنے کے لائق بنی ہے۔سنسکرتی الفاظ کے استعمال کے علاوہ جہاں تک بیان کی چستی اور رچاوٹ کا تعلق ہے وہ ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں موجود ہے۔ یہاں بیان میں بے جا پھیلاؤ کا بھی احساس نہیں ہوتا بلکہ بات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کا عمل ملتا ہے۔مثنوی میں استعمال ہونے والی ضرب الامثال میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جو آج بھی اُردو زبان کے سرمائے میں شامل نہ ہو''۔(تاریخ ادب اُردو صفحہ 166)

4.3.1 میراں جی شمس العشاق:

میراں جی عین جوانی میں دنیوی تعلقات ترک کر کے راہ خدا میں نکل گئے تھے۔وہ بیت اللہ میں قیام کے بعد مدینہ منورہ میں کوئی بارہ سال رہے۔وہ ایسے خاندان کے بانی تھے جس نے صدیوں تک ارض دکن میں رشد و ہدایت کا کام انجام دیا۔میراں جی کا زمانہ 1496ء کا ہے۔یہ وہ

زمانہ تھا جب بہمنی سلطنت طوائف الملوکی کی شکار ہوچکی تھی۔ وہ روبہ زوال تھی۔ 1490ء میں عادل شاہی حکومت اپنی آزادی اور خودمختاری کا اعلان کر چکی تھی۔ اس سے قبل 1487ء میں بیدر کی برید شاہی سلطنت بھی آزادی کا اعلان کر چکی تھی۔ اسی سال برار میں عماد شاہی حکومت بھی قائم ہوچکی تھی۔ 1490ء میں احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت بھی الگ ہوگئی تھی۔ قطب شاہی سلطنت نے البتہ (1512ء) میں خودمختاری کا اعلان کیا۔ ان حالات میں ہر طرف بے اطمینانی تھی۔ میراں جی کی تصانیف اسی زمانے میں سامنے آئیں اور اللہ کی طرف رجوع ہو کر سکون پانے کا طریقہ بتاتی رہیں۔ اسی وجہ سے ان کی تمام تصانیف کا موضوع تصوف اور اخلاقی تعلیم ہے۔ ان کی چار کتابیں ملتی ہیں (1) خوش نامہ (2) خوش نغز (3) شہادت التحقیق (4) مغز مرغوب۔

''خوش نامہ'' ایک سو ستر اشعار پر مشتمل نظم ہے۔ اس میں ایک نیک سیرت لڑکی ''خوش'' کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کی بہترین صفات کی وجہ سے سب ہی اس سے محبت کرتے تھے اور عزت بھی کرتے تھے۔ لیکن وہ صرف سترہ سال کی ہوئی تھی کہ اللہ نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ اتنی کم عمری میں خوش کا مرجانا افسوس کی بات ہے لیکن اللہ کی مرضی یہی تھی۔ اس کی موت سے میراں جی اخلاقی نتائج اخذ کر کے روحانی مسائل کی تشریح کرتے ہیں۔

دوسری نظم ''خوش نغز'' ہے۔ یہ صرف بہتّر (72) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں سوال اور جواب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ خوش' مختلف روحانی مسائل پر سوالات کرتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے ہیں جیسے عقل اور عشق' کرامات' مراقبہ' عرفان روح وغیرہ۔ میراں جی کی نظموں میں مختلف بولیوں جیسے برج بھاشا' پنجابی اور مراٹھی کے اثرات ملتے ہیں۔

''شہادت التحقیق'' میراں جی کی ایک طویل نظم ہے جو پانچ سو تر سٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں شریعت اور طریقت کے مسائل قرآن اور حدیث کے ذریعے سمجھائے گئے ہیں۔ اس میں بھی سوال و جواب کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ ''طالب'' سوال کرتا ہے ''مرشد'' جواب دیتے ہیں۔ اس میں بھی شریعت اور طریقت کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ سوچ سمجھ کر شریعت اور طریقت پر چلنا چاہیے جو ایسا نہیں کرتے وہ اپنی عمر ضائع کرتے ہیں۔

''ہور پھوکٹ عمر کھووے''

مغز مرغوب شمس العشاق کی چوتھی اور آخری نظم ہے۔ اس میں بھی فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

میراں جی کی زبان مشکل ہے اور اس کو سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اُردو زبان کی خدمت میراں جی اور ان سے پہلے اور بعد کے ادیبوں نے جس طرح کی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کھودا جا رہا ہے اور ہزار دشواریوں سے راستہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی محنت اور صلاحیت سے زبان کے دریا کو بیان کے راستے پر ڈالا۔ آج وہ ہمیں مشکل' ناموس اور بے معنی نظر آتے ہیں۔۔۔ اگر یہ لوگ اس دور میں زبان و بیان کے نئے نئے تجربے (اور یہ سب حقیقت میں تجربے ہیں) نہ کرتے تو سرسوتی کی طرح اس زبان کا دریا بھی راستے ہی میں خشک ہو جاتا۔ یہ اُردو زبان کے وہ نمونے ہیں جو نویں صدی ہجری کی زبان پر نہ صرف روشنی ڈالتے ہیں بلکہ نقوش راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم اس سرمائے سے مختلف تہذیبی دھاروں اور اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کس کس اثر نے ہماری فکر' ہمارے اظہار کو متاثر کیا ہے اور وہ

کون سے اثرات تھے جو اٹھے، بڑھے اور غالب ہوگئے۔جس طرح کسی جہاز کی پرواز کو بہت دور تک دیکھنے کے لیے اسے مسلسل ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا پڑتا ہے، اسی طرح اُردو کی روایت کو دور تک دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ان لوگوں کی زبان وبیان کی پرواز کو بھی مسلسل دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے''۔ (تاریخ ادب اُردو، صفحہ 174)

4.3.2 سید اشاہ شرف بیابانی:

سید شاہ اشرف بیابانی (1459ء تا 1528ء) سید احمد کبیر رفاعی کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے ''نوسر ہار'' کے نام سے 1503ء میں ایک مثنوی لکھی۔اس مثنوی کا نام ''نوسر ہار'' اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں نو باب ہیں، جو ہار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ہار گویا ہیروں کا ہے۔ادبی لحاظ سے بھی یہ مثنوی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔اشرف نے فخر یہ طور پر کہا ہے کہ اس مثنوی میں اس نے ہیرے موتی جڑے ہیں۔ان کو سونے کے تار میں پرویا ہے۔ ہر ہر مصرعے میں نگینے جڑے ہوئے ہیں۔اس مثنوی کے نو باب نہیں ہیں بلکہ ''نوسر ہار'' ہیں جن کی قیمت ہزاروں اور لاکھوں ہے:

سونے کی جیو کھونٹی گھڑ ہیرے مانک موتی جڑ
ایک ایک بول مانک مول سیم ترازو سیں تھیں تول
بند پرائی سونے تار سچیں ہوا او ''نوسر ہار''
ہر ہر مصرعے باندے لڑ رتن پدارت مانک جڑ
اے نو باباں نو سرہار قیمت اس کی لاکھ ہزار

مثنوی کا موضوع واقعۂ کربلا یعنی شہادت حسین ہے جس کو ہندوی زبان میں لکھا گیا ہے۔

بازاں کیتا ہندوی میں قصۂ مقتل شاہ حسین

ہر باب کا عنوان فارسی میں ہے۔ یہ مثنوی شاید مجلسوں میں سنانے کے لیے لکھی گئی ہے۔اس کی زبان بول چال کی زبان سے قریب ہے۔جو محاورے اس مثنوی میں ملتے ہیں وہ آج بھی ہماری زبان کا جزو ہیں جیسے وقت آنا (موت آنا)، اٹھ جانا (مرجانا)، غم کھانا (فکر و تردد میں مبتلا رہا) ہات آنا (حاصل ہونا) ہات ملنا (افسوس کرنا) پھل پانا (اچھا نتیجہ حاصل ہونا) آسماں ٹوٹ پڑنا (سخت مصیبت پڑنا) قول کرنا (وعدہ کرنا) وغیرہ ۔اشرف کی اس مثنوی میں رزمیہ انداز بھی ملتا ہے۔ میدان جنگ کا نقشہ بھی اس نے اچھی طرح کھینچا ہے۔اسی طرح جذبات اور احساسات کی پیش کشی بھی بہت اچھی ہے۔ یہ مثنوی اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ یہ اس دور میں لکھی گئی جب اُردو زبان ابتدائی شکل میں تھی اور اس زبان کو اُردو تو دور کی بات ہے دکھنی کے نام سے بھی ابھی پکارا نہیں گیا تھا۔جمیل جالبی کے کہنے کے مطابق:

''میراں جی کی طرح اشرفؔ بھی اپنی زبان کو ہندوی کہتا ہے۔شاہ باجن بھی اپنی زبان کو ہندی یا دہلوی کہتے ہیں۔ابھی اس کے لیے ''گجری'' یا ''دکنی'' کا لفظ استعمال نہیں ہوا''۔(تاریخ ادب اُردو، صفحہ 178)

بہمنی دور نے اُردو کی سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ اس زبان کو دکن کے چپے چپے تک پہنچا دیا۔بہمنی سلطنت ایک عظیم سلطنت تھی جب یہ ٹوٹی تو پانچ بڑی بڑی سلطنتیں وجود میں آئیں۔بہمنیوں نے ایک مشترکہ زبان اور ایک مشترکہ تہذیب اپنے جانشینوں کو دی، جس سے وہ اپنی الگ

شناخت اور پہچان بنا سکے۔بہمنی دور ہی میں زبان و بیان کو اتنا نکھارا اور سنوارا گیا تھا کہ وہ ادبی اغراض کے لیے استعمال کے قابل ہوگئی تھی اور اس میں ہر قسم کے موضوعات بیان کرنے کی وسعت پیدا ہو چکی تھی۔بہمنی دور کے مصنفین نے اُردو زبان کی خدمت جس طرح کی ہے اس پر جمیل جالبی یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کو اُردو زبان کے مزاج و خون میں شامل کر کے اسے آگے بڑھایا ہے۔اگر یہ لوگ ایسا نہ کرتے اور اس زبان کو اپنے اپنے انداز میں' اپنی اپنی ضرورت کے مطابق' استعمال نہ کرتے تو یہ زبان وقت کی قبر میں کبھی کی دفن ہو چکی ہوتی۔طویل نظم لکھنا' اور وہ بھی ایسے دور میں جب خود زبان و بیان ہر سطح پر گھٹنوں پر چل رہی تھی۔کوئی آسان کام نہیں تھا۔ان لوگوں نے زبان کو مختلف موضوعات سے آشنا کر کے اسے جلد ہی کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔قدیم اُردو مصنفین کا ہم پر یہی احسان ہے۔'' (تاریخ ادب اُردو' جلد اول' 179)

بہمنی عہد جب ختم ہوا تو دکن کا علاقہ پانچ سلطنتوں میں بٹ گیا لیکن بہمنی دور نے ایسی مضبوط لسانی اور تہذیبی روایت قائم کی تھی جس پر یہ تمام ریاستیں تادم آخر چلتی رہیں۔ان میں سے عادل شاہی اور قطب شاہی دور ادبی لحاظ سے بھی پرشکوہ اور شاندار رہا ہے جس پر اُردو زبان و ادب جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔یہ اُردو ادب و تہذیب کا بھی سنہری دور ہے۔

4.3.3 دیگر شعرا:

بہمنی دور کے دیگر شعرا میں فیروز' لطفی اور مشتاق کے نام قابل ذکر ہیں۔

فیروز بیدری:

فیروز کا پورا نام قطب دین قادری اور تخلص فیروز ہے۔وہ بیدر کا متوطن تھا جیسا کہ اس نے درج ذیل شعر میں اپنے نام تخلص اور وطن کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مجھے ناؤں ہے قطب دیں قادری
تخلص سو فیروز ہے بیدری

فیروز نے ایک مثنوی ''پرت نامہ'' جس کا دوسرا نام ''توصیف نامہ میراں محی الدین'' بھی ہے کے علاوہ چند غزلیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔''پرت نامہ'' کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مرتب کر کے شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ کے مجلّہ ''قدیم اُردو'' (جلد اول) 1965ء میں شائع کر دیا ہے۔

مثنوی ''پرت نامہ'' فیروز نے اپنے پیر و مرشد اور مذہبی رہنما حضرت مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم (متوفی 1564ء) کی مدح میں لکھی ہے۔وہ کہتا ہے میں نے خواب میں حضرت غوث اعظم دستگیر کو دیکھا اور جب نیند سے بیدار ہوا تو میرے سامنے حضرت مخدوم جی انھیں کے ہم شکل دکھائی دیے۔اسی لیے وہ اپنے مرشد کو محی الدین ثانی بھی کہتا ہے۔''پرت نامہ'' از اول تا آخر حضرت غوث اعظم اور فیروز کے مرشد حضرت مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم کی مدح و توصیف میں ہے۔

مخدوم جی اپنے دور کے ایک مشہور عالم تھے۔ان کی شہرت دکن کے علاقے میں بہت جلد پھیل گئی۔یہی وجہ ہے کہ گولکنڈے کے تیسرے حکمران ابراہیم قطب شاہ نے انھیں گولکنڈہ آنے کی دعوت دی تھی۔مخدوم جی خود تو گولکنڈہ نہیں آئے لیکن اپنے مرید فیروز کو اپنے بجائے گولکنڈہ روانہ

کیا۔ جہاں فیروز کو بحیثیت شاعر غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ گولکنڈے کے شعراوجہیؔ محمد قلی اور ابن نشاطی نے اپنے کلام میں فیروز کا ذکر عزت و احترام سے کیا ہے۔ فیروز کی گولکنڈہ میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ ولی کا سفر دہلی۔ ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

''گولکنڈہ میں فیروز کو ایک باکمال شاعر اور استاد سخن کی حیثیت سے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ گولکنڈہ کے نوعمر شاعروں نے فیروز کے آگے زانوے ادب تہہ کیا۔ گولکنڈہ میں اُردو شاعری کی شمع روشن کرنے کا سہرا فیروز ہی کے سر ہے۔ (دکنی غزل کی نشو و نما ص54)

ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنی کتاب ''دکنی غزل کی نشو و نما'' میں فیروز کی 5 نو دریافت غزلیں یکجا کی ہیں۔ اس کی غزل گوئی کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

فیروز کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت اظہار بیان کی سادگی اور روانی ہے۔ اس کا تصور محبوب مادی اور مجازی ہے اور وہ غزل کو عورتوں سے باتیں کرنے اور عورتوں کی باتیں کرنے کا ذریعہ اظہار سمجھتا ہے۔ اس کے ہاں محبوب کی جنس واضح ہے۔ وہ اپنے محبوب کو نار، سودھن، استری، شہپری، سانولی، سکھی کے نام سے یاد کرتا ہے۔''

(دکنی غزل کی نشو و نما۔ ص60)

نمونہ کلام:

سنگار بن کا سرو ہے سو قد ترا اے شہ پری
مکھ پھول تے نازک دسے توں حور ہے یا استری
سودھن کہے فیروزیا اپسیں دیوانہ کی کیا
تجھ کار نے تپیا ہیا جیو تو اَہے مجھ یاوری
گوریاں سہیلیاں میئں سب جگ کیاں بساریا
جب سانولی سکھی سوں مائل ہوا دکھن میں

مشتاق بیدری:

مشتاق کا پورا نام اور اس کے واقعاتِ حیات پردۂ گمنامی میں ہیں۔ اس کی چند غزلوں اور ایک قصیدے کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''مشتاق سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی (متوفی 1482ء) کے آخری زمانہ کا ایک شاعر تھا جس نے غالباً سلطان محمود شاہ بہمنی (متوفی 1518ء) کے دور میں شہرت حاصل کی اس نے سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ بت شکن کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا وہ اب تک محفوظ ہے۔'' (دکنی ادب کی تاریخ ص15)

ڈاکٹر زور نے ''دکنی ادب کی تاریخ'' میں مشتاق کی دو غزلوں کے چند اشعار نمونتاً پیش کیے ہیں مولوی نصیر الدین ہاشمی نے بھی ''دکن میں اُردو'' میں مشتاق کی غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار درج کیے ہیں۔ ان کے علاوہ مولوی سخاوت مرزا نے اپنے ایک تحقیقی مضمون ''قدیم اُردو کی ایک نایاب بیاض'' مشمولہ رسالہ اُردو کراچی (اکتوبر 1950ء) میں مشتاق کا ایک قصیدہ اور غزلیں شائع کی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار

نہیں کہ مشتاق ایک باکمال غزل گو اور بے مثال قصیدہ گو بھی تھا۔ نمونہ کلام:

او کسوت کیسری کر تن چمن میانے چلی ہے آ
رہے کھلنے کوں تیوں دستی او چنے کی کلی ہے آ
صفا اس گال کوں دیکھت نظر سوجا گا گر پڑتی
مکھی کے پر میں کاں طاقت سورج لگ جا گزر آوے

لطفی:

مشتاق کی طرح لطفی کا پورا نام اور اس کے حالات زندگی نا معلوم ہیں۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر زورؔ ''دکنی ادب کی تاریخ'' میں لکھتے ہیں:

''لطفی بھی اسی (بہمنی) دور کا شاعر تھا اور مشتاق کا ہم عصر۔ اس نے بھی مشتاق کی طرح شاہ محمد کی مدح کی ہے جو خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں تھے۔'' (دکنی ادب کی تاریخ ص 16)

لطفی کی اب تک صرف ایک ہی غزل کے چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں جنہیں ڈاکٹر زور نے ''دکنی ادب کی تاریخ'' میں نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اُردو'' میں درج کیے ہیں۔ یہ غزل دراصل ریختی ہے جس میں لطفی نے خود کو عورت تصور کر کے عورتوں کے جذبات کی ترجمانی انھیں کی زبان میں کی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

خلوت منے سجن کے میں موم کی بتی ہوں
یک پاؤں پر کھڑی ہوں جلنے پرت تپی ہوں
شہہ کے ملن کی ماتی ہر نس جلن کوں آتی
سب قد کھڑا جلاتی پن آہ نئیں کتی ہوں
رسیا چتر رسیلے بھوگی سو شاہ محمد
مندر منے سجن کے نس جاگتی رہتی ہوں

مشتاق اور لطفی کی غزل گوئی کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

''مشتاق اور لطفی کے کلام کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ وہ اپنے زمانے کے اساتذۂ سخن رہے ہوں گے۔۔۔ یہ قدیم اُردو غزل کے اولین نمونے نہیں ہو سکتے بلکہ ان کے پیش رو شعرا نے بھی صنف غزل پر طبع آزمائی کی ہوگی ورنہ غزل کے ان اولین نقوش میں اس درجہ پختگی اور روانی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔'' (دکنی غزل کی نشو و نما ص 51)

4.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ اُردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی۔ لیکن دکن میں وہ نہ صرف پلی بڑھی بلکہ ادبی اغراض کے لیے استعمال ہونے لگی۔ شمال سے دکن وہ سیاسی

وجوہات کی بنا پر پہنچی۔

☆ امیر خسرو نے اسے ہندی یا ہندوی کہا۔ دہلی میں وہ ''زبان دہلوی'' کہلائی۔ علاء الدین خلجی نے دکن کا پورا علاقہ فتح کرلیا، جس میں گجرات اور مالوہ بھی شامل تھے۔ اس پورے علاقے کو اس نے ایک سو علاقوں میں تقسیم کر دیا اور ہر حصہ پر اپنا ایک امیر یا حاکم مقرر کیا جس کو وہ ''امیر صدّہ'' کہتے تھے۔

☆ امیرانِ صدّہ نے دکن ہی کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ وہ اپنے تمام متعلقین کے ساتھ دکن آئے۔ امیران صدّہ کے نظام کو بعد میں تغلق نے بھی قائم رکھا۔ تغلق نے جب پائے تخت دہلی کی بجائے دولت آباد منتقل کیا تو دہلی کی ساری آبادی دکن منتقل ہوگئی۔ لیکن جب دوبارہ دہلی کو پائے تخت بنایا گیا تو بے شمار لوگ دکن ہی میں رہ گئے۔

☆ اُردو پہلے گجرات پہنچی اور گجری کہلائی' بعد میں دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ مختلف سیاسی حالات کی وجہ سے اُردو کو دکن میں پھلنے پھولنے کا زبردست موقع مل گیا۔ بعد میں جب تغلق کی حکومت کمزور پڑ گئی تو امیرانِ صدّہ نے متحدہ طور پر بغاوت کردی اور اپنی آزادی کا اعلان کردیا۔

☆ اس نئی سلطنت کا بانی علاء الدین شاہ بہمن تھا۔ بہمن کی مناسبت سے عظیم الشان بہمنی سلطنت قائم ہوئی۔ چوں کہ ہر سلطنت جب آزاد ہوتی ہے تو ہر بات میں اپنی شناخت بناتی ہے اسی طرح بہمنی سلطنت نے بھی ہر بات میں شمالی ہند سے الگ طور پر اپنی شناخت قائم کی۔

☆ لسانی طور پر بھی چوں کہ شمالی ہند میں فارسی کا بول بالا تھا اس لیے اور پھر اس وجہ سے بھی کہ ان کے رابطے کی زبان شروع ہی سے اُردو تھی انہوں نے اُردو ہی کو اپنایا' اور ہر ممکن طرح سے اُردو کی سرپرستی کی۔ بڑی مدت تک اُردو کو اُردو نہیں کہا گیا۔ وہ ہندی اور ہندوی کہلاتی تھی۔ بعد میں وہ ''دکنی'' کہلائی۔

☆ اُردو کی ترویج واشاعت میں صوفیائے کرام کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ دکن میں بھی کئی صوفیا آئے جنھوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی انہوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو کو بھی رشد وہدایت کے لیے استعمال کیا۔

☆ فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو بھی دکن تشریف لائے۔ ان بزرگان دین کی وجہ سے بھی دکنی اُردو کی ترویج ہوئی۔ وہ فارسی کے ساتھ اُردو میں بھی رشد وہدایت کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ دکنی میں ہی تصنیف وتالیف بھی کیا کرتے تھے۔

☆ بہمنی عہد کوئی دوسو سال تک چلتا رہا۔ اس پورے دور میں دکنی اُردو ہی رابطے کی زبان تھی اور علمی ادبی اور مذہبی اغراض کے لیے دکنی ہی استعمال کی جاتی تھی۔ اس کے برخلاف شمالی ہند میں ہر سطح پر فارسی ہی کا بول بالا رہا۔

☆ بہمنی دور نے دکنی اُردو کو ایسی مضبوط بنیادیں فراہم کردیں تھیں جس پر بعد کی ریاستیں خاص طور پر عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتیں دکنی ادب کی عالی شان اور پائیدار عمارتیں بنا سکے۔ 1525ء میں جب عظیم الشان بہمنی سلطنت ختم ہوئی اور پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں تو ان سب میں دکنی کو پھلنے پھولنے اور ممکنہ ترقی پانے کا موقع ملا۔

☆ بہمنی سلطنت میں دکنی زبان کو علمی اور ادبی اغراض کے لیے جس کمال کے ساتھ استعمال کیا وہ بہمنی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں پوری شان اور آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہے۔

☆ دکنی کا موجودہ تحقیق کی بنا پر قدیم ترین شاعر فخر دین نظامی ہے۔ اس کی مثنوی کا صرف ایک ہی نسخہ ساری دنیا میں ملتا ہے۔ یہ نسخہ بھی بہت ہی

خستہ حالت میں ہے۔اس کا ابتدائی حصہ بھی چوں کہ تلف ہوگیا ہے اس لیے مثنوی کا نام کیا تھا یہ معلوم نہیں ہوتا۔

☆ مثنوی کے دو اہم کردار کدم راؤ اور پدم راؤ ہیں۔اسی وجہ سے مثنوی کو ''کدم راؤ'' پدم راؤ'' کا نام دیا گیا۔اس مثنوی کی زبان کو سمجھنا بے حد مشکل ہے۔اس مثنوی میں ایک مقبول ہندوستانی قصے کو پیش کیا گیا ہے۔

☆ اس زمانے میں جب کہ زبان ابتدائی حالت میں تھی اتنی طویل مثنوی لکھنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ادبی اغراض کے لیے بھی یہ زبان کافی مدت سے استعمال ہورہی تھی۔دوسری بات یہ کہ اس مثنوی کا لکھنے والا قادرالکلام شاعر تھا۔

☆ اس مثنوی میں جو محاورے استعمال کیے ہیں ان سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔بہر حال یہ مثنوی دکنی ادب کا قدیم ترین اور قابل قدر نمونہ ہے۔

☆ میراں جی شمس العشاق بہمنی عہد کے ایک اہم شاعر اور بزرگ ہیں۔ان کی چار کتابیں ملتی ہیں:

(1) خوش نامہ (2) خوش نغز (3) شہادت التحقیق (4) مغز مرغوب

☆ ''خوش نامہ'' میں ایک 17 سالہ لڑکی جو حد درجہ نیک اور پاکیزہ صفات رکھتی تھی، وہ نوعمری میں اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے۔اس کی موت سے میراں جی نے اصلاحی نتائج اخذ کیے ہیں اور روحانی مسائل کی تشریح کی ہے۔

☆ دوسری نظم ''خوش نغز'' ہے۔یہ 72 اشعار والی مختصر نظم سوال اور جواب کی صورت میں لکھی گئی ہے۔اس نظم کا مرکزی کردار ''خوش'' ہے۔وہ میراں جی سے روحانی مسائل کے بارے میں سوالات کرتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے ہیں۔

☆ تیسری نظم ''شہادت التحقیق'' ہے یہ ایک طویل نظم ہے جو پانچ سو تر سٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں شریعت اور طریقت کے مسائل، قرآن شریف اور احادیث کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں۔

☆ میراں جی کی ایک اور مختصر نظم ''مغز مرغوب'' ہے۔اس میں صوفیانہ اور فلسفیانہ مسائل کی تشریح کی گئی ہے۔میراں جی کی زبان قدیم ہونے کی وجہ سے بہت مشکل معلوم ہوتی ہے۔

☆ سید شاہ اشرف بیابانی، میراں جی شمس العشاق کے کم عمر ہم عصر ہیں۔جنھوں نے ''نوسر ہار'' کے نام سے ایک مثنوی یادگار چھوڑی ہے۔

☆ ''نوسر ہار'' میں ''واقعہ کربلا'' کو پیش کیا گیا ہے چوں کہ مثنوی کے نو باب ہیں اس لیے اسے ''نوسر ہار'' کہا گیا ہے۔اس کی زبان با محاورہ ہے۔جذبات و احساسات کی عکاسی بھی اچھی کی گئی ہے۔ان تمام خوبیوں کی وجہ سے ادبی لحاظ سے بھی یہ مثنوی اچھی ہے۔

☆ اس دور کے دیگر شعرا میں فیروز بیدردی، لطفی اور مشتاق کے نام قابل ذکر ہیں۔اول الذکر نے ایک مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ چند غزلیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور آخر الذکر شاعروں کی چند غزلیں اور قصائد ملتے ہیں۔

4.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ریختہ	:	ریختن کے معنی ٹپکانا، ملنا۔اردو کو ریختہ اس لیے کہا گیا کہ دوسری زبانوں کے الفاظ اس میں ملتے ہیں۔
رزم	:	جنگ و جدل رزمیہ، ایسی شاعری جس میں جنگ و جدل کے حالات و واقعات ہوں۔

طریقت	:	باطنی طور پر نیکی کے اصولوں کو اپنانا، بے ریائی کے ساتھ نیک عمل اور اصولوں پر کاربند رہنا۔
مبتدی	:	شروع کرنے والا، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والا
ملفوظات	:	کہے ہوئے الفاظ، بولی ہوئی بات، ارشادات
اردوئے معلیٰ	:	شاہی لشکر اعلیٰ، اردو زباں
رشد	:	راہ راستی کی تعلیم، ہدایت
شریعت	:	اسلامی اصول وقوانین
قمار بازی	:	جوا کھیلنا
پلیتی	:	گندگی

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

4.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اردو کی پہلی مثنوی کون سی ہے؟

2۔ خوش نامہ اور خوش نغز کس کی تصانیف ہیں؟

3۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کس بادشاہ کے زمانے میں گلبرگہ تشریف لائے؟

4۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں راجا کو دھوکہ دینے والے جوگی کا نام کیا ہے؟

5۔ مثنوی نوسر ہار کا موضوع کیا ہے؟

6۔ میراں جی شمس العشاق کس کے مرید اور خلیفہ تھے؟

7۔ مثنوی ''نوسر ہار'' کس کی تصنیف ہے؟

8۔ ''شہادت التحقیق'' کا دوسرا نام کیا ہے؟

9۔ مثنوی ''پرت نامہ'' کا مصنف کون ہے؟

10۔ محمد اکبر حسینی اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ میں کیا رشتہ تھا؟

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا خلاصہ بیان کیجیے۔

2۔ بہمنی دور کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ اشرف بیابانی کی مثنوی نوسر ہار پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

4۔ میراں جی شمس العشاق کی تصانیف پر اظہار خیال کیجیے۔

5۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

4.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ بہمنی دور کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر بیان کیجیے۔

2۔ بہمنی دور کے علمی اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

3۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے کرداروں میں سب سے فعال کردار کونسا ہے اور کیوں؟ بیان کیجیے۔

4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	پروفیسر مسعود حسین خاں
2۔	تاریخ اردو ادب (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
3۔	دکن میں اردو	ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی
4۔	تاریخ ادب اردو 1700ء تک (جلد اول)	پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین
5۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین قادری زور

بلاک II: دکنی ادب کا ارتقا

اکائی 5: قطب شاہی دور میں دکنی شعر و ادب کا ارتقا

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 قطب شاہی دور کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر

5.3 قطب شاہی دور کے اولین شعرا

5.3.1 محمد قلی قطب شاہ

5.3.2 اسد اللہ وجہی

5.3.3 ملک الشعرا غواصی

5.3.4 ابن نشاطی

5.4 قطب شاہی دور کے دیگر شعرا اور نثر نگار

5.5 اکتسابی نتائج

5.6 کلیدی الفاظ

5.7 نمونہ امتحانی سوالات

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

تاریخ ادب اُردو میں قطب شاہی دور کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس سلطنت کے تمام حکمران علم دوست شعر و ادب کے دل دادہ اور شاعروں اور فنکاروں کے قدر دان تھے۔ اور بیش تر سلاطین جیسے جمشید قلی، محمد قلی، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ خود بھی شعر کہتے تھے۔

قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں فیروزؔ، سید محمودؔ اور ملا خیالیؔ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تینوں شعرا گولکنڈے کے چوتھے حکمران ابراہیم قطب شاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا دورِ حکومت دکنی اُردو ادب کے عہدِ زرین کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود بادشاہ وقت ایک پرگو اور قادرالکلام شاعر تھا اس کا ضخیم کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس دور کے دوسرے اہم شعرا میں ملک الشعرا وجہیؔ احمدؔ گجراتی اور غواصی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کے بعد عہدِ محمد قطب شاہ، عبداللہ شاہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ میں بھی متعدد باکمال شعرا اور نثر نگار پیدا ہوئے جن میں ابن نشاطیؔ، جنیدیؔ، طبعیؔ، فائزؔ، میراں جی خدانما، میراں یعقوبؔ، عابد شاہ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ قطب شاہی دور کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر کو بیان کر سکیں۔
- ☆ قطب شاہی دور کے اولین شعرا سے واقف ہو سکیں۔
- ☆ قطب شاہی دور کے دیگر اہم شعرا اور نثر نگاروں سے واقف ہو سکیں گے۔

5.2 قطب شاہی دور کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر

قطب شاہی حکمرانوں کے عہد میں گولکنڈے میں جس ثقافت اور تمدن کو فروغ ہوا وہ حقیقتاً صرف ایک تسلسل تھا ان سماجی اقدار اور ثقافتی روایات کا جن کی آبیاری سرزمین دکن میں پہلی بار بہمنی حکمرانوں نے کی تھی۔ سیاسی سطح پر بہمنی سلاطین کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے دکن کی چھوٹی ریاستوں کو جو ہر وقت برسرِ پیکار رہتی تھیں، ایک انتظامی وحدت میں منسلک کیا، جس کی وجہ سے جنوبی ہند میں امن و امان اور خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

گولکنڈے کے پہلے فرماں روا سلطان قلی قطب الملک کا عہد (1518ء۔1543ء) اس نوعمر سلطنت کے استحکام کا زمانہ ہے۔ سلطان قلی اس علاقے کے لیے کوئی نیا حکمران نہیں تھا۔ گولکنڈہ کی خودمختاری سے قبل اس نے تلنگانہ کے علاقے میں 24 سال تک گورنر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ بہمنی دربار میں اس کا شمار ایسے سپہ سالاروں میں ہوتا تھا جو بیک وقت صاحبِ علم و فضل بھی تھے اور میدانِ کارزار کے سورما بھی یہی سبب تھا کہ محمود شاہ بہمنی نے اسے صاحبِ سیف و قلم کے خطاب سے نوازا تھا۔

سلطان قلی کے بعد اس کا تیسرا فرزند جمشید قلی (1543ء۔1550ء) گولگنڈے کے تخت پر متمکن ہوا۔ جمشید نے سیاسی اعتبار سے مملکت کو مستحکم بنانے میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ تاہم اپنے سات سالہ عہدِ حکومت میں وہ گولکنڈے کے عوام میں مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ کیوں کہ عام روایات کے مطابق اپنے بوڑھے باپ کو قتل کروانے میں جمشید کا ہاتھ تھا۔ لیکن شعر و ادب سے جمشید کی دلچسپی ثابت ہے۔ وہ فارسی میں فی البدیہہ شعر کہتا تھا۔

جمشید کے انتقال کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے سبحان قلی کو سات سال کی عمر میں تخت نشین کیا گیا۔ سبحان قلی کی کم سنی کی وجہ سے اربابِ سیاست کا ایک گروہ اس کی حکومت کے خلاف ہو گیا اور سلطان قلی کے سب سے چھوٹے بیٹے ابراہیم قلی نے 1550ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔

ابراہیم قلی کی تخت نشینی کے بعد گولکنڈے کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ جس ثقافت اور تمدن کو مورخین آج قطب شاہی تہذیب وثقافت سے موسوم کرتے ہیں وہ اپنے نمایاں خدوخال میں ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ابراہیم قطب شاہ نے ایک طرف تو سیاسی اعتبار سے اپنی سلطنت کے استحکام اور توسیع کے لیے کامیاب جدوجہد کی تو دوسری طرف اپنی مملکت میں بسنے والے مختلف طبقات کے مابین اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کی ارادی کوشش کا آغاز کیا۔وہ علم وادب کا اس قدر دل دادہ تھا کہ سفر وحضر میں علماوفضلا کے علاوہ کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔قطب شاہی خاندان میں ابراہیم قطب شاہ تلگو زبان کا سب سے پہلا سر پرست اور قدردان تھا ۔ اس زمانے کے متعدد تلگو شاعروں نے اپنے کلام میں ابراہیم کی سرپرستی کی تفصیلات پیش کی ہیں۔دکنی اُردو کے اولین شعرا' فیروز' محمود اور خیالی' ابراہیم قطب شاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا چوتھا فرزند محمد قلی قطب شاہ (1580ء 1611ء) گولکنڈہ کا پانچواں حکمران بنا۔محمد قلی کو خوش قسمتی سے ایک مستحکم اور طاقتور حکومت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔اس کا دورحکومت بڑی حد تک امن وامان میں گزرا۔اردو شعروادب کا فروغ اور شہر حیدرآباد کا قیام محمد قلی کے عہد کے اہم کارنامے ہیں۔وہ نہ صرف علوم وفنون کا قدردان اور سر پرست تھا بلکہ خود بھی شعرگوئی میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔اسے اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے ۔سماجی اور تمدنی نقطۂ نظر سے محمد قلی کا عہد حکومت دکن کی تاریخ میں ایک یادگار دور سمجھا جاتا ہے۔محمد قلی نے اس بات کی خاص طور پر کوشش کی کہ اس مملکت میں بسنے والے مختلف طبقوں کے درمیان یگانگت' میل جول اور بھائی چارگی کے جذبات نشوونما پائیں۔اس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ مملکت میں بسنے والے سارے طبقات کو مذہبی آزادی حاصل رہے۔

محمد قلی کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ 1611ء میں گولکنڈے کے تخت پر متمکن ہوا۔سلطان محمد بھی اپنے آباو اجداد کی طرح ایک علم دوست بادشاہ تھا۔وہ اپنی علم دوستی پاکیزہ اخلاق' اعلیٰ کردار اور مذہب پرستی کی بدولت بڑی شہرت رکھتا تھا۔اسے کتابیں جمع کرنے اور ان پر اپنی رائے تحریر کرنے یا دستخط ثبت کرنے کا شوق تھا۔اس نے اپنے چچا محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کو مرتب کر کے اس پر ایک منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد کو اُردو سے زیادہ فارسی اور عربی زبان سے دلچسپی تھی۔شاید اسی لیے اس دور میں عربی اور فارسی کے متعدد علما وفضلا کی سرپرستی کی گئی۔اس کے برعکس دکنی اُردو کے نامور شعرا وجہی اور غواصی گم نامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا فرزند عبداللہ قطب شاہ 1626ء میں حکمران ہوا۔اس بادشاہ کا عہد حکومت (1626ء۔1672ء) سب سے طویل تھا۔اس نے 48 سال تک حکومت کی۔سلطان عبداللہ اپنے نانا محمد قلی کی طرح علم دوست عیش پسند اور رقص وموسیقی کا رسیا تھا۔وہ خود بھی صاحب دیوان شاعر تھا اور اس کے دور میں وجہی' غواصی ابن نشاطی جیسے بلند پایہ شعرا موجود تھے۔اسی دور میں غواصی کو ملک الشعرا کے مرتبے تک پہنچنے کا موقع ملا۔

سلطان عبداللہ کے انتقال کے بعد 1672ء میں مملکت گولکنڈہ کا آخری حکمران ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا' وہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا۔اس کے عہد حکومت میں مرہٹوں اور مغلوں کی یورش کی وجہ سے گولکنڈے میں بے اطمینانی اور انتشار پیدا ہو گیا تھا۔دکن کی سیاسی تاریخ کے ایسے نازک ترین دور میں شاہ ابوالحسن نے اپنی حکمت عملی اور تدبر سے ملک کے داخلی اور خارجی حالات پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کی ۔دیگر قطب

شاہی سلاطین کی طرح سلطان ابوالحسن بھی ایک اچھا شاعر اور علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کا دیوان تو ابھی تک دریافت نہیں ہوا لیکن تذکروں میں اس کی دو ایک غزلوں کا پتہ چلتا ہے اس دور کے اہم شاعروں میں فائز اور طبعی کے نام قابل ذکر ہیں۔

5.3 قطب شاہی دور کے اولین شعرا

قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں فیروزؔ، سید محمودؔ اور ملا خیالیؔ کے نام ملتے ہیں۔ یہ تینوں شاعر چوتھے قطب شاہی حکمران ابراہیم قطب شاہ کے دور (1550ء۔1580ء) سے تعلق رکھتے ہیں۔

فیروز:

فیروز کا نام قطب الدین قادری تھا۔ وہ دراصل بیدر کا باشندہ تھا جو ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ چلا آیا۔ اس کی تصانیف میں ایک مختصر مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ چند غزلوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مثنوی فیروزؔ نے اپنے پیرو مرشد شیخ محمد ابراہیم مخدوم جی (متوفی 1173ھ/1565ء) کی مدح میں لکھی ہے۔ گولکنڈہ پہنچنے کے بعد فیروز کو استادِ سخن کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ گولکنڈے کے بلند پایہ شعرا محمد قلی، وجہیؔ اور ابن نشاطیؔ نے اپنے کلام میں جس انداز سے فیروز کا تذکرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان شاعروں نے فیروز کے آگے زانوے ادب تہہ کیا تھا۔ فیروز کی گولکنڈے میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے کہ بعد کے زمانے میں ولیؔ کے سفر دہلی کی۔

سید محمود:

فیروز کی طرح سید محمود کا بھی قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ زمانہ مابعد کے بلند پایہ شاعروں میں وجہیؔ، محمد قلی اور ابن نشاطیؔ نے محمود کو قطب شاہی دور کے ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔ محمودؔ کے کلام کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے دکنی اُردو کے علاوہ پنجابی اور افغانی میں بھی شعر موزوں کیے ہیں۔ لیکن صرف اُردو شاعری کی وجہ سے اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ محمود بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر ہے۔ سادگی، روانی، برجستگی اور نغمگی و موسیقیت اس کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اُردو'' (جلد اول) میں محمود کی چند غزلیں اور بعض غزلوں کے منتخب اشعار شائع کیے ہیں۔

ملا خیالی:

خیالیؔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا ایک ممتاز شاعر ہے۔ غالباً اس کا تعلق دربار شاہی سے تھا۔ اس نے 1665ء میں اپنے نام سے ایک دو منزلہ مسجد تعمیر کروائی تھی۔ قلعہ گولکنڈہ کے شمال مشرق کی جانب فصیل سے متصل نئے قلعہ میں ہتھیان کے درخت کے قریب ملا خیالی کی یہ خوبصورت مسجد اور اس کا کتبہ آج تک موجود ہے۔ ابن نشاطیؔ اور سید اعظم نے اپنے کلام میں جس انداز سے خیالیؔ کا تذکرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ اور پُرگو شاعر تھا لیکن افسوس کہ ملا خیالی کی صرف ایک ہی غزل دستیاب ہوئی ہے۔

5.3.1 محمد قلی قطب شاہ:

(ولادت 973ھ تخت نشین 988ھ وفات 1020ھ) محمد قلی قطب شاہ، مملکت گولکنڈہ کا پانچواں فرمارواں اور دکنی اُردو کا ایک قادر

الکلام شاعر تھا۔ محمد قلی سے قبل اگر چہ فیروزؔ ۔ سید محمود اور ملا خیالی جیسے اساتذۂ سخن گزرے ہیں لیکن کسی کا بھی کلام مرتبہ دیوان کی شکل میں دستیاب نہ ہو سکا۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں محمد قلی ہی اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے جس کا دیوان عہد قدیم ہی میں مرتب و مدون ہو چکا تھا۔ محمد قلی کی کلیات کو اس کے بھتیجے اور داماد سلطان محمد قطب شاہ نے مرتب کر کے اس پر ایک منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔ سلطان محمد کی اطلاع کے مطابق محمد قلی کا ضخیم کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، مرثیے، نظمیں، رباعیاں سبھی اصناف سخن موجود ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کا شاعر ہے۔ یہاں تک کہ اس کی وہ تخلیقات بھی جنھیں تسلسل بیان کی وجہ سے عنوانات قائم کر کے نظم قرار دیا گیا ہے دراصل غزلیں ہی ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کو خوش قسمتی سے ایک مستحکم اور طاقتور حکومت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی اور اس کا دورِ حکومت مجموعی طور پر امن و امان میں گزرا۔ اس کے دور میں ایران کے مشہور عالم اور مدبر میر مومن حیدرآباد ہوئے تھے جنھیں بادشاہ نے اپنا مشیر مقرر کیا تھا۔ سلطنت کے بیش تر کاروبار کی نگرانی میر مومن کی سپرد تھی۔ یہی وجہ ہے کہ محمد قلی کو سیاسی اور انتظامی الجھنوں سے آزاد رہ کر بڑی حد تک عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔

شہر حیدرآباد کی تاسیس اور اس شہر میں بسنے والے مختلف طبقوں کے مابین خلوص اور بھائی چارگی کے جذبات کی ترویج، محمد قلی کے دور کے یادگار کارنامے ہیں۔ محمد قلی کی تعلیم و تربیت اس کے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں ادھوری اور ناقص ہوئی تھی لیکن فن شاعری میں وہ مہارت تامہؔ رکھتا تھا۔ فارسی کے بلند پایہ شاعروں خصوصاً حافظ شیرازی، خاقانی، ظہیر فاریابی اور انوری کا اس نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ حافظ شیرازی کی متعدد غزلوں کا اس نے دکنی اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔

محمد قلی کی قادر الکلامی کا یہ حال تھا کہ وہ روزانہ اسی طرح شعر کہنے پر قادر تھا جس طرح روز دریا میں موجیں اٹھتی ہیں لیکن اس کی روانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ محمد قلی کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت انداز بیان کی سادگی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات زندگی اور جذبات و محسوسات کو سیدھے سادے اسلوب اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کا عادی ہے۔ محمد قلی ایک کثیر المحبوب شاعر بھی ہے اور اس کے کلام میں موضوعات اور مضامین کا تنوع بھی۔ اس نے اپنی متعدد محبوباؤں جیسے گوری، سانولی، چھبیلی، لٹھنی، پیاری وغیرہ کے حسن و جمال کی تعریف بھی کی ہے اور مختلف النوع موضوعات جیسے حمد و مناجات، نعت و منقبت، عید و تہوار، بسنت، نوروز سالگرہ (برس گانٹھ) برسات (مرگ) ٹھنڈ کالا، خداداد محل، باغ محمد شاہی، شاہی ہاتھی، چوگان، پھوکڑی پھو، کھمڈی وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ محمد قلی نے ایک ایسے دور میں صنف غزل پر باقاعدہ اور خصوصی طور پر توجہ کی جب کہ دبستان دکن میں مثنوی کا سکہ چل رہا تھا۔

محمد قلی کی شاعری میں اپنے عہد اور ماحول کی بھر پور ترجمانی ملتی ہیں۔ اس کے کلام کے مطالعے سے اس دور کی سماجی زندگی کے بارے میں بہت کچھ مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شادی بیاہ کے رسوم، رہن سہن کے طور طریقے، مختلف موسموں، عیدوں، تہواروں، کھیلوں وغیرہ کی تفصیلات کے دلچسپ مرقعے اس کی شاعری میں جا بہ جا بکھرے ہوئے ہیں۔ محمد قلی کی شاعری نہ صرف اس کی منظوم سوانح حیات ہے بلکہ اپنے دور کی ایک مستند تاریخ بھی ہے۔ جس میں چار سو سال پہلے کی زندگی کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔

محمد قلی نے اپنے کلام میں عشقیہ موضوعات کے ساتھ ساتھ مذہبی رنگ کو بھی اپنایا ہے۔ جس میں اس نے اپنے اعتقادات سے والہانہ وابستگی اور جوش و عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محمد قلی مذہب پر بھر پور عقیدہ رکھتا ہے اور مذہبی رسوم پر بھی چلتا ہے۔ لیکن مذہب کی حقیقی روح سے اس کی شخصیت اور شاعری دونوں عاری ہیں۔ اس کو مذہب کے صرف تہذیبی پہلوؤں سے دلچسپی ہے۔ ستم ظریفی ہے کہ وہ اپنی عیش

کوشی کوبھی ''نبی کا صدقہ''اور''بارہ اماموں کا کرم'' قرار دیتا ہے۔

نبی صدقے بارہ اماماں کرم تھے
کرو عیش جم بارہ پیاریاں سو پیارے

بعض نقادوں نے محمد قلی کی شاعری کو الہامی قرار دیا ہے لیکن محمد قلی کے ہاں نہ تو مضامین غیب سے آتے ہیں اور نہ وہ عرش سے ادھر کی باتیں کرتا ہے۔ وہ تو اسی عالم رنگ و بو کا پرستار ہے۔ ایک وسیع وعریض اور عظیم الشان مملکت کے ایک مطلق العنان بادشاہ ہونے کے ناطے اس نے کبھی کسی محبوبہ کا انتظار نہیں کیا بلکہ متعدد محبوبائیں ہمیشہ اس کے درشن کی منتظر رہتی تھی اپنی پیاریوں کے جھرمٹ میں رہ کر اس نے انھیں کے عشوہ و جمال، خدوخال اور رفتار و گفتار کی داد دی ہے۔ وہ ایک پر گو، خوش بیان اور اُردو کا اولین صاحب دیوان شاعر ہے اُردو زبان کی تاریخ میں یہ اعزاز اس کے نام اور کلام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

5.3.2 اسداللہ وجہی:

ملک الشعرا اسداللہ وجہی، قطب شاہی دور کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور باکمال نثر نگار ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کا ایک بلند پایہ عالم فلسفی اور حکیم بھی تھا۔ دکنی اُردو کے دوسرے شعرا کی طرح وجہی کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ غالباً وہ گولکنڈے کے چوتھے حکمراں ابراہیم قطب شاہ کے عہد (1550ء۔1580ء) میں پیدا ہوا اور پھر اس نے مزید تین قطب شاہی سلاطین محمد قلی قطب شاہ (1580ء۔1611ء) محمد قطب شاہ (1611ء۔1626ء) اور عبداللہ قطب شاہ (1626ء۔1674ء) کا زمانہ بھی دیکھا۔

وجہی اپنے دور کا ایک بلند پایہ شاعر و ادیب تھا۔ اس لیے فطری طور پر اس کے ہم عصر اور زمانۂ مابعد کے شاعروں نے اس کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے۔ طبعی اپنی مثنوی ''بہرام وگل اندام'' کی تصنیف کے دوران وجہی کو بالکل اسی طرح خواب میں دیکھتا ہے جس طرح خود وجہی نے فیروز کو خواب میں دیکھا تھا اور اس سے اپنی مثنوی کی تعریف سنی تھی۔ طبعی کے اشعار ہیں۔

لگیا میں جو یو مثنوی بولنے　　　　یو موتیاں نچھل ڈھال تیوں رولنے
یو وجہی مرے خواب میں آے کر　　　　مکھ اپنا سورج ناد دکھلائے کر
سراسر سنیا جو مری مثنوی　　　　کہیا بات طبعی ہے تیری نوی

شاہ افضل قادری (مصنف محی الدین نامہ) نے اپنے ایک قصیدے میں عبداللہ قطب شاہ کی مدح کے دوران وجہی کی فنکارانہ صلاحیتوں کی داد دی ہے اور اس کو''گیانی''(عالم)''گن بھر''(صاحب اوصاف)''عاقل''اور''کامل'' جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

تجھ ایسے شاہ کوں ہونا سو وجہی سار کا شاعر　　　　نپٹ عاقل نپٹ کامل، نپٹ گیانی، نپٹ گن بھر

وجہی کے ہم عصر اور زمانۂ مابعد کے شعرا کے کلام کے حوالوں سے اس کے سنہ وفات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ابن نشاطی نے اپنی مثنوی ''پھول بن'' (1066ھ) میں اس دور کے مرحوم شعرا کو یاد کیا ہے۔ جن میں وجہی کا نام شامل نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1066ھ تک وجہی بقید حیات تھا۔ البتہ طبعی اپنی مثنوی ''بہرام وگل اندام'' (سنہ تصنیف 1088ھ) میں وجہی کو مرحوم شاعر کی حیثیت سے خواب میں دیکھتا ہے۔ ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ وجہی نے 1066ھ/1655 اور 1088ھ/1677ء کے درمیانی زمانے میں وفات پائی۔ ''سب رس'' کے ایک قلمی نسخے کے ترقیمے سے پتہ چلتا ہے کہ وجہی سلسلۂ چشتیہ کے ایک صوفی بزرگ حضرت شاہ علی متقی کا مرید تھا۔ وجہی نے مثنوی ''قطب مشتری''، ''تاج

الحقائق''۔ ''سب رس'' اور فارسی دیوان کے علاوہ چند دکنی غزلیں اور مرثیے بھی اپنے یادگار چھوڑے ہیں ۔ وجہی کی دکنی غزلوں اور فارسی کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد (1611۔1626ء) میں کسی وقت اس پر شاہی عتاب نازل ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کو تنگ دستی، مفلسی اور فاقہ کشی کے دن بھی دیکھنے پڑے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے وجہی کو اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا تھا۔ اس دور میں وجہی کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ بادشاہ وقت کا دست راست بن گیا تھا۔ اسی دور میں اس نے اپنی شاہکار مثنوی ''قطب مشتری'' لکھی یہ وجہی کی طبع زاد مثنوی ہے۔ جو 1018ھ میں صرف 12 دن کے عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس دور کی دیگر مثنویوں کی طرح اس مثنوی کا آغاز بھی حمد و مناجات اور نعت و منقبت سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد مدح بادشاہ ہے اور پھر وجہی نے ''در شرح شعر خود گوید'' کی سرخی کے تحت شاعری سے متعلق اپنے نظریات اختصار کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

قطب مشتری ایک معرکۃ آلارا مثنوی ہے جس میں وجہی نے بادشاہ وقت سلطان محمد قلی قطب شاہ کو قصے کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یہ قصہ گویا محمد قلی کی شہزادگی کے زمانے سے متعلق ہے۔ نوجوانی کے زمانے میں شاہزادہ ''قطب'' کو بنگالہ کی شہزادی ''مشتری'' سے عشق ہو جاتا ہے جس کی شکل اس نے خواب میں دیکھی تھی۔ پھر وہ شہزادی کے تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور عہد متوسط کے دوسرے قصے کہانیوں کی طرح مختلف خطرناک مہمات سر کر کے بالآخر بنگالہ پہنچتا ہے اور شہزادی سے بیاہ کر کے گولکنڈہ واپس آتا ہے۔ یہ صرف ایک فرضی داستان ہے جس میں قدیم زمانے کے قصوں کی طرح دیوؤں اور پریوں کا ذکر اور محیر العقول واقعات بھی ملتے ہیں۔ تاہم اس مثنوی کے مطالعے سے محمد قلی کے مزاج و کردار پر روشنی ضرور پڑتی ہے اور اس کے عالم شباب کی مصروفیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس مثنوی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے کم و بیش تمام کرداروں کے نام محمد قلی قطب شاہ کے خاندانی نام ''قطب'' کی مناسبت سے ستاروں کے نام پر رکھے گئے ہیں جیسے مشتری، عطارد، زہرہ، مہتاب، مریخ وغیرہ۔ وجہی کو زبان و بیان پر غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ اس مثنوی میں اس نے انسانی جذبات کی تصویر کشی، کردار نگاری اور منظر نگاری کے بڑے دلکش مرقع پیش کیے ہیں۔

وجہی اپنے دور کا ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ بلند پایہ نثر نگار بھی تھا اس نے ''تاج الحقائق'' اور ''سب رس'' جیسی اہم نثری تصانیف بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ''تاج الحقائق'' تصوف کے موضوع پر ایک نثری رسالہ ہے جس کا تذکرہ سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے ''سب رس'' کے مقدمے میں کیا تھا۔ اس کتاب میں سلوک اور معرفت کے مسائل کو عام فہم لیکن دل نشین اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید وشسشٹ ''تاج الحقائق'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''تصوف کا یہ نثری رسالہ وجہی کا نقش اول ہے اور سب رس نقش ثانی۔ سب رس کے نقطۂ عروج تک پہنچنے کے لیے وجہی کو تاج الحقائق کی منزل سے گزرنا لازمی تھا۔''

وجہی کی دوسری نثری تصنیف ''سب رس'' ہے اس کتاب کو وجہی نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1045ھ مطابق 1635ء میں لکھا تھا۔ ''سب رس'' کا قصہ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی نثری تصنیف ''قصہ حسن و دل'' سے ماخوذ ہے۔ تاہم وجہی نے اپنی بے پناہ علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروے کار لاتے ہوئے اس کتاب کو ایک تخلیقی تصنیف کا درجہ دے دیا ہے۔ وجہی نے پیچیدہ اور خشک فلسفیانہ مسائل کو ادبی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ''سب رس'' کا شمار اُردو نثر کی دو یا تین منتخب کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کا اسلوب مقفیٰ ہوتے ہوئے بھی سادہ و پرکار

ہے۔بعض مقامات پر وجہی نے حقائق حیات کے متعلق فلسفیانہ اور حکیمانہ نکات پیش کیے ہیں۔جس کی وجہ سے یہ کتاب اُردو نثر کے لازوال نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔

سب رس قدیم طرز کی ایک داستان ہے،جس میں انسانی جذبات واحساسات اور انسانی صلاحیتوں اور قوتوں جیسے عشق،عقل،حسن،غمزہ،عشوہ،ناز،ناموس،ہمت،دل،نظر،خیال،وہم،صبر،طمع،وفا وغیرہ کو کرداروں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔سب رس کا قصہ ایک تمثیلی داستان کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے سارے کردار تمثیلی ہیں۔اس کا قصہ دو سطحوں پر آگے بڑھتا ہے۔ایک سطح ظاہری کہانی کا انداز لیے ہوئے ہے اور دوسری سطح علم باطنی سے متعلق ہے۔گویا سب رس کے قصے میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کا بیان ایک ساتھ پہلو بہ پہلو ہوا ہے۔

''سب رس'' میں ایک طرف عربی آیات واحادیث،فارسی اشعار اور مقولے ملتے ہیں تو دوسری طرف روزمرہ،محاورے اور ضرب الامثال بھی کثرت سے ملتے ہیں۔''سب رس'' کی زبان مقفیٰ ہے۔یعنی چھوٹے چھوٹے جملوں میں قوافی کا اہتمام کیا گیا ہے۔تاہم ان قافیوں کو وجہی نے اس قدر مہارت اور ہنرمندی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ کہیں تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔وجہی نے نظم اور نثر کے امتزاج سے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے۔چناں چہ وہ کہتا ہے:

''آج لگن اس جہان میں ہندوستان میں،ہندی زبان سوں،اس لطافت،اس چھنداں سوں،نظم ہور نثر ملاکر،کلاکر نئیں بولیا۔اس بات کوں اس نبات کوں یوں کوئی آب حیات میں نئیں گھولیا۔یوں غیب کا علم نئیں بولیا۔''

5.3.3 ملک الشعرا غواصی:

غواصی قطب شاہی دور کا ایک عظیم المرتبت اور بلند قامت شاعر ہے۔اس کی تاریخ پیدائش،تعلیم وتربیت،سنہ وفات اور خاص طور پر آخری زمانے کے حالات پردۂ تاریکی میں ہیں۔اس کے کلام کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوا۔محمد قلی قطب شاہ کے دور میں اس نے شعر گوئی کا آغاز کیا۔اور پھر اس نے محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔سلطان عبداللہ قطب شاہ کا دورِ حکومت غواصی کی شاعری کا عہد زرین ہے۔اس بادشاہ نے نہ صرف غواصی کی سرپرستی کی اور اس کو اپنے دربار کا ملک الشعرا بنایا بلکہ قطب شاہی سفیر کی حیثیت سے اس کو بیجاپور روانہ کیا اور ''فصاحت آثار'' کے خطاب سے بھی نوازا۔غواصی میراں سید شاہ حیدر ولی اللہ (متوفی 1033ھ) کا مرید تھا۔جن کی مدح میں اس نے متعدد اشعار لکھے ہیں۔

غواصی کی چار مثنویوں ''میناست ونتی''،''سیف الملوک و بدیع الجمال''،''طوطی نامہ'' اور ''مثنوی طریقت'' کے علاوہ غزلوں،نظموں،قصیدوں،مرثیوں اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی منظر عام پر آیا ہے۔جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے غواصی دبستان دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے۔اس کے کلام میں بھرتی کے شعر یا ایسے اشعار بہت کم ملتے ہیں جن میں گہرا تاثر نہیں پایا جاتا۔اظہار بیان کی سادگی غواصی کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔تاثر کی فراوانی،نغمگی وموسیقیت،سوز وگداز اور حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے اس کی غزلیں اُردو غزل کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔

مثنوی نگاری کے میدان میں بھی غواصی کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔''میناست ونتی''،غواصی کی پہلی مثنوی ہے۔اس مثنوی کی تاریخ تصنیف کا علم نہیں۔اس میں شاعر نے اپنے آپ کو اہل علم کے سامنے ایک نو وارد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔''میناست ونتی'' کا قصہ ہندوستانی اصل

کی ایک عشقیہ کہانی سے ماخوذ ہے۔لیکن غواصی کا بیان ہے کہ اس نے ایک فارسی رسالے کو دکنی اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔اس وقت تک اس قبیل کے صرف ایک ہی قصے ''عصمت نامہ'' کا پتہ چلتا ہے جو حمیدیؔ کی تصنیف ہے۔اس لیے گمان غالب ہے کہ ''عصمت نامہ'' ہی مینا ست ونتی کے قصے کا ماخذ ہے۔اس میں ''بالا کنور'' نامی ایک راجہ کی حسین بیٹی ''چندا'' کے ایک شادی شدہ چرواہے ''لورک'' پر فریفتہ ہونے اور اس کے ساتھ راہ فرار اختیار کرنے کی داستان بیان کی گئی ہے۔لورک کی بیوی کا نام ''مینا'' ہے جو ایک ہندوستانی باعصمت عورت ہے۔وہ شوہر پرست بھی ہے اور وفا شعار بھی ''بالا کنور'' اپنی بیٹی کا بدلہ لینے کی غرض سے ''مینا'' کو اپنے محل کی زینت بنانا چاہتا ہے اس کام کے لیے ایک چالاک دلالہ مقرر کی جاتی ہے جو مینا کو برائی کا راستہ اپنانے کے لیے طرح طرح سے ورغلاتی ہے۔لیکن مینا دلالہ کے جال میں گرفتار نہیں ہوتی۔غواصی نے اس مثنوی میں مینا اور دلالہ کی گفتگو کے درمیان اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں اور قادرالبیانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس عہد کی نسوانی زبان،روزمرہ،محاورے اور ضرب الامثال کو محفوظ کردیا ہے۔

مثنوی ''سیف الملوک اور بدیع الجمال'' کا قصہ الف لیلیٰ کے ایک فارسی نثری ترجمے پر مبنی ہے۔جس میں مصر کے شہزادے ''سیف الملوک'' اور جنوں کی شہزادی ''بدیع الجمال'' کی عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔یہ مثنوی صرف غواصیؔ کی ہی ایک بے نظیر مثنوی نہیں بلکہ دکنی اُردو کی شاہ کار مثنویوں میں بھی شمار کی جاتی ہے۔سیف الملوک و بدیع الجمال میں غواصی نے جذبات نگاری،سراپا نگاری،رزم نگاری اور منظر نگاری کے بڑے خوب صورت نمونے پیش کیے ہیں۔یہ مثنوی 1035ھ کی تصنیف ہے جسے غواصی نے صرف تیس دن (ایک ماہ) میں مکمل کیا تھا۔

مثنوی ''طوطی نامہ'' سنہ 1049 ھ کی تصنیف ہے جس کا قصہ سنسکرت کی مشہور تصنیف ''شکاسپ تتی'' (طوطے کی کہی ہوئی ستر 70 کہانیاں) کے فارسی ترجمے پر مبنی ہے۔''شکاسپ تتی'' کو مولانا ضیاالدین نخشبی نے فارسی میں منتقل کیا تھا اورانہوں نے ستر کہانیوں میں سے باون 52 کا انتخاب کیا۔غواصی کے ''طوطی نامہ'' کا ماخذ نخشبی کا طوطی نامہ ہی ہے۔غواصی نے بھی اختصار سے کام لیتے ہوئے باون کہانیوں میں سے صرف پینتالیس 45 کو اپنی مثنوی کے لیے منتخب کیا ہے۔''طوطی نامہ'' کا قصہ اگرچہ غواصی کا طبع زاد نہیں ہے۔لیکن قصے کی جزئیات،انسانی نفسیات کی مرقع کشی اور مناظر فطرت کے بیان میں غواصیؔ نے اپنے شاعرانہ کمال کا اس درجہ مظاہرہ کیا ہے کہ قدیم اُردو کا یہ عظیم فن پارہ محض سنسکرت یا فارسی کا ترجمہ ہی نہیں رہ جاتا بلکہ ایک اچھی تصنیف کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔''مثنوئ طریقت'' کے نام سے غواصی کی ایک اور مثنوی کا پتہ چلتا ہے،جو غیر مطبوعہ ہے۔

غواصی دبستان دکن کا ایک باکمال غزل گو اور مثنوی نگار ہی نہیں تھا بلکہ بلند پایہ قصیدہ گو،بے نظیر رباعی نگار اور کامیاب مرثیہ گو بھی تھا۔اس پر مستزاد اس کی نظمیں ہیں۔نظم نگاری کے میدان میں وہ محمد قلی کے بعد دکنی اُردو کا دوسرا اہم شاعر ہے۔

5.3.4 ابن نشاطی:

قطب شاہی دور کے اہم اور بلند پایہ شاعروں میں ایک اور نام ابن نشاطی کا ہے،جس کی مثنوی ''پھول بن'' دکنی اُردو کی چند منتخب مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ابن نشاطی کا پورا نام شیخ محمد مظہرالدین شیخ فخرالدین ابن نشاطی ہے۔وہ بنیادی طور پر ایک انشاپرداز تھا لیکن اس کی انشاپردازی کا کوئی نمونہ منظر عام پر نہیں آیا۔''پھول بن'' سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں 1066ھ میں صرف تین ماہ میں لکھی گئی۔ابن نشاطی فارسی اور دکنی کا بہت بڑا عالم فاضل اور ماہر عروض و بلاغت بھی تھا۔اسے فن شاعری میں مہارت تامہ حاصل تھی خصوصاً صنائع بدائع کے استعمال میں وہ ید طولیٰ رکھتا تھا۔پھول بن کی زبان سلیس وسادہ ہے۔اس مثنوی کے مطالعے سے شاعر کی قادرالکلامی اور کمال فن کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ مثنوی اگرچہ فارسی تصنیف

''بساتین الانس'' کے قصے پر مبنی ہے لیکن ابن نشاطی نے اصل قصے میں بہت کچھ تبدیلیاں کی ہیں اور اسے متعدد ابواب میں تقسیم کر کے ہر باب کا آغاز ایک ایسے شعر سے کیا ہے جس میں اس باب کا خلاصہ آجاتا ہے اور اگر تمام ابواب کے صرف عنوانی اشعار کو یکجا کر دیا جائے تو پوری مثنوی کا لب لباب پیش نظر آجاتا ہے۔ پھول بن کی کہانی قصہ در قصہ آگے بڑھتی ہے اور اس میں تین قصے اور چند ذیلی کہانیاں شامل ہیں۔1744 اشعار پر مشتمل اس مثنوی میں ابن نشاطی نے جذبات نگاری، کردار نگاری اور منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔

5.4 قطب شاہی دور کے دیگر شعرا اور نثر نگار

گذشتہ صفحات میں ہم نے قطب شاہی عہد کے چند اہم شعرا اور نثر نگاروں کا مطالعہ کیا۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دور میں صرف اتنے ہی شعرا اور نثر نگار گزرے ہیں۔ بلکہ محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے عہد حکومت میں چند اور شاعروں اور ادیبوں نے دکنی اُردو میں تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا ہے جن کا درج ذیل سطور میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

احمد گجراتی:

شیخ احمد دراصل گجرات کا باشندہ تھا۔محمد قلی قطب شاہ نے اسے گولکنڈہ آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ وجہیؔ اور غواصیؔ کا ہم عصر تھا۔اس کی دو مثنویوں ''لیلیٰ مجنوں''، اور مصیبت اہل بیت'' کا پتہ چلتا ہے۔اول الذکر مثنوی کے چند منتشر اوراق پروفیسر محمود شیرانی کو دستیاب ہوئے تھے۔جن کا تفصیلی ذکر انہوں نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' میں کیا ہے۔حال ہی میں ڈاکٹر جمیل جالبی کو کتب خانۂ انجمن ترقی اُردو کراچی میں احمد کی ایک اور مثنوی ''یوسف زلیخا'' کا پتا چلا ہے جس کا تعارف انہوں نے ''تاریخ ادب اُردو'' کی پہلی جلد میں کرایا ہے۔اس مثنوی کو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔موجودہ معلومات کی روشنی میں ''یوسف زلیخا'' دبستان گولکنڈہ کی پہلی مثنوی ہے۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ:

مملکت گولکنڈہ کا چھٹا فرماں روا سلطان عبداللہ دکنی اُردو کا ایک باکمال شاعر تھا۔اس کا کلیات ہنوز دریافت نہیں ہوا۔تاہم اس کے نامکمل دیوان میں ردیف ''ش'' تک کی 97 غزلیں ہیں۔جن کے مطالعے سے اس کی قادرالکلامی کا پتا چلتا ہے۔سلطان عبداللہ نے چند مرثیے اور گیت بھی اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔لیکن بنیادی طور پر وہ ایک غزل گو شاعر ہے۔سادگی بیان اور نغمگی و موسیقیت عبداللہ قطب شاہ کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔عبداللہ قطب شاہ کا دیوان دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

احمد جنیدی:

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور کا ایک مہدوی شاعر ہے۔اس نے ''ماہ پیکر'' کے عنوان سے 1064 ھ میں ایک مثنوی تصنیف کی تھی۔''ماہ'' اس مثنوی کی ہیروئن کا نام ہے اور ''پیکر'' ہیرو کا۔اسی مناسبت سے جنیدیؔ نے اپنی مثنوی کا نام ''ماہ پیکر'' رکھا۔دو ہزار سات سو پینتیس ابیات (2735) پر مشتمل اس مثنوی کو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے مرتب کر کے 1986ء میں جامعہ عثمانیہ کے تحقیقی مجلّے ''قدیم اُردو'' میں شائع کر دیا ہے۔

قطب رازی:

قطب رازی نے اسی دور میں اپنے مرشد شاہ ابوالحسن کی فرمائش پر خواجہ بندہ نواز کے والد حضرت یوسف شاہ راجو کی مشہور زمانہ فارسی تصنیف ''تحفتہ النصائح'' کا دکنی اُردو میں منظوم ترجمہ کیا۔دکنی تحفتہ النصائح قصیدے کی ہئیت میں ایک طویل نظم ہے جو 786 اشعار پر مشتمل

ہے۔اس میں شریعت،تصوف اوراخلاق کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔

میراں جی حسن خدانما:

عبداللہ قطب شاہ کے دور کے صاحب تصنیف صوفیا میں شمار ہوتے ہیں۔خدا نما حضرت خواجہ بندہ نواز کے سلسلۂ فیض سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ بیجاپور کے صوفی سید شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید وخلیفہ تھے۔خدانمانے اپنے مریدوں اور معتقدوں کی تعلیم وتفہیم کے لیے دکنی نظم ونثر میں چندرسالے تصنیف کیے تھے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

حصہ نثر: 1)شرح شرح تمہیدات عین القضات 2)رسالہ وجودیہ 3)شرح مرغوب القلوب

حصہ نظم: 1)بشارت الانوار 2)دومختصر مثنویاں 3)دوغزلیں

جہاں تک میراں جی خدا نما کی نثر نگاری کا تعلق ہے۔ان کے تینوں رسالوں میں تصوف کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔''تمہیدات ہمدانی'' دراصل عبداللہ بن محمد عین القضات ہمدانی کی فارسی تصنیف ہے جس کی شرح خواجہ بندہ نواز نے فارسی میں لکھی تھی۔اس شرح کا ترجمہ خدانما نے دکنی نثر میں ''شرح تمہیدات عین القضات'' کے عنوان سے کیا تھا۔اس کتاب میں سلوک ومعرفت کے مسائل کی قرآن وحدیث کی روشنی میں تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔''رسالہ وجودیہ''اور''مرغوب القلوب'' بھی دومختصر نثری تصانیف ہیں جن کا موضوع تصوف ہے۔

میراں یعقوب:

حضرت میراں جی خدانما کے مریداورخلیفہ تھے۔وہ بیک وقت شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔انہوں نے حضرت برہان الدین غریب کے خلیفہ حضرت رکن الدین عماد کی فارسی تصنیف''شمائل الاتقیا'' کا اسی نام سے دکنی نثر میں ترجمہ کیا۔یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔جو 1200 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔''شمائل الاتقیا'' میں تصوف کے مسائل نہایت سیدھی سادی زبان اور دل چسپ انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔میراں یعقوب نے تصوف کے مسائل کی وضاحت کے سلسلے میں تشبیہوں اور تمثیلوں سے بھی کام لیا ہے۔

حضرت شاہ راجو حسینی:

قطب شاہی دور کے ایک صاحب کرامت بزرگ اور نامور صوفی تھے۔ان کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ بندہ نواز سے ملتا ہے۔شاہ راجو نے اپنے مریدوں' معتقدوں اور خصوصاً گھریلو خواتین کی تلقین وہدایت کے سلسلے میں دکنی اُردو میں''سہاگن نامہ'' کے علاوہ بعض دیگر رسائل بھی تصنیف کیے۔سہاگن نامہ میں شاہ راجو نے گھریلو کام کاج میں مصروف خواتین کی تعلیم وتفہیم کے لیے تصوف کے مسائل اور مذہبی احکام کو سیدھی سادی زبان اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ان تصانیف کا مقصد'مذہب اور اخلاق کی تعلیم دینا اور برائیوں سے بچنے اور نیکی کے راستے کو اپنانے کی تلقین کرنا ہے۔

عابد شاہ:

عہد قطب شاہی کے دور آخر کے ایک صاحب تصنیف صوفی تھے۔ان کا نام نواب الدین اور عابد تخلص تھا۔وہ حضرت شاہ راجو کے مرید تھے۔عابد شاہ بیک وقت نثر نگار بھی تھے اور شاعر بھی۔انہوں نے''مراۃ السالکین''، ''گلزار السالکین''اور''کنزالمومنین'' کے نام سے تین کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

عہد قطب شاہی کے دور آخر کے دو قابل ذکر شعرا طبعی اور فائز ہیں۔اول الذکر کرنے 1084ھ میں ''بہرام وگل اندام'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جسے ڈاکٹر نورالسعید اختر نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔آخر الذکر نے 1094ھ میں ''رضوان شاہ و روح افزا'' کے عنوان سے ایک دلچسپ مثنوی تصنیف کی تھی جسے پروفیسر سید محمد نے مرتب کر کے منظر عام پر لایا ہے۔اس دور کی دیگر مثنویوں میں سید بلاقی کی معراج نامہ (1056ھ) عبداللطیف کی ''وفات نامہ'' (1074ھ) مختار کی ''معراج نامہ'' (1094ھ) ضعیفی کی ''ہدایات ہندی'' خواصؔ کی ''قصہ حسینی'' قدرتی کی ''قصص الانبیا'' سیوک کی ''جنگ نامہ'' (1092ھ) اولیا کی ''قصہ ابوشحمہ'' (1090ھ) کے نام قابل ذکر ہیں۔یہ سب کی سب مثنویاں ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

5.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی تھا، جس نے 1518ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تھا۔اس کے بعد یکے بعد دیگرے مزید سات سلاطین نے سرزمین گولکنڈہ پر 169 سال تک حکمرانی کی۔

☆ کم و بیش تمام قطب شاہی سلاطین نہ صرف علم دوست اور شعرا و ادبا کے سرپرست و قدردان تھے بلکہ ان میں سے بیشتر خود بھی شعر کہتے تھے۔خصوصاً محمد قلی اور سلطان عبداللہ تو دکنی اُردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔

☆ محمد قلی قطب شاہ کو اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔محمد قلی بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔تاہم اس نے قصیدہ‘ نظم اور رباعی پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

☆ محمد قلی کے علاوہ اس دور کے دوسرے بلند قامت شعرا میں اسداللہ وجہیؔ‘ ملک الشعرا غواصی اور ابن نشاطی کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔جنھوں نے ''قطب مشتری''، ''میناست ونتی''، ''سیف الملوک و بدیع الجمال''، ''طوطی نامہ'' اور ''پھول بن'' جیسی لازوال مثنویاں لکھی ہیں۔

☆ غواصی نے مثنویوں کے علاوہ غزلیں‘ قصیدے‘ نظمیں اور رباعیاں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔وجہی اس دور کا ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کا نثر نگار بھی تھا۔اس کی تصنیف ''سب رس'' صرف دکنی نثر کا لازوال کارنامہ نہیں بلکہ اُردو نثر کی تاریخ میں بھی ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆ وجہیؔ کے علاوہ قطب شاہی دور کے دوسرے نثر نگاروں میں میراں جی خدانما‘ میراں یعقوب اور عابد شاہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔اسی طرح اس دور کے دیگر مثنوی نگاروں میں احمدؔ گجراتی‘ جنیدیؔ‘ طبعیؔ‘ فائزؔ اور غزل گو شعرا میں سلطان عبداللہؔ قطب شاہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

☆ بہ حیثیت مجموعی قطب شاہی دور کو مثنویوں کے دور سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔مثنوی کے بعد اس دور میں غزل کی صنف کو بہت فروغ ہوا۔ساتھ ہی ساتھ قصیدہ‘ مرثیہ اور رباعی کی صنف پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔

5.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مفصل	:	تفصیل سے

مطلق العنان	:	خودمختار، خودسر
برسرپیکار رہنا	:	مصروف جنگ رہنا
الف لیلیٰ	:	ہزار راتیں، ایک داستان کا نام
تامہ	:	مکمل، بھرپور
بہ نظر غائر	:	گہری نظر سے باریک بینی
گیانی	:	عالم
نچھل	:	صاف، شفاف
سنیا	:	سنا
سار	:	مانند
آبیاری	:	پانی دینا، ترقی دینا
تمثیل	:	تشبیہ دینا، مماثلت، مطابقت
محیرالعقول	:	عقل کو حیرت میں ڈالنے والے
میدان کارزار	:	میدان جنگ
عاری	:	خالی، قاصر
توضیح	:	وضاحت
کہیا	:	کہا
نپٹ	:	مکمل
جم	:	ہمیشہ
فی البدیہہ	:	بغیر سوچے سمجھے، فی الفور
ورغلانا	:	ترغیب وتحریک دینا

5.7 نمونہ امتحانی سوالات

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ قطب شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

2۔ وجہی نے کون کون سے بادشاہوں کا زمانہ دیکھا؟

3۔ ''سب رس'' کب لکھی گئی؟

4۔ مثنوی 'مینا ستونتی' کے چند کرداروں کے نام لکھیے۔

5۔ ''طوطی نامہ'' کس کی تصنیف ہے؟

6۔ ملا وجہی نے ''سب رس'' کس کی فرمائش پر لکھی؟

7۔ ''قطب مشتری'' کس کی تصنیف ہے؟

8۔ ''پھول بن'' کس کی مثنوی ہے؟

9۔ غواصی کی پہلی مثنوی کون سی ہے؟

10۔ گولکنڈہ کے پانچویں حکمران کا کیا نام تھا؟

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ قطب شاہی دور کے سیاسی اور سماجی پس منظر کا جائزہ لیجیے۔

2۔ محمد قلی قطب شاہ کی حیات اور ادبی خدمات بیان کیجیے۔

3۔ احمد گجراتی کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

4۔ ابن نشاطی کے بارے آپ کیا جانتے ہیں لکھیے۔

5۔ کسی دو پر نوٹ لکھیے۔

I۔ سب رس II۔ سیف الملوک و بدیع الجمال III۔ مینا ستونتی IV۔ پھول بن

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ قطب شاہی دور کی ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

2۔ غواصی کے ادبی کارنامے بیان کیجیے۔

3۔ وجہی کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
2۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین قادری زور
3۔	تاریخ ادب اردو 1700ء تک (جلد سوم، چہارم)	پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین
4۔	دکنی نثر کا انتخاب	پروفیسر سیدہ جعفر
5۔	دبستان گولکنڈہ ادب اور کلچر	پروفیسر محمد علی اثر
6۔	اردو کی اہم مثنویاں	ڈاکٹر احمد علی شکیل

اکائی 6: عادل شاہی دور میں دکنی شعروادب کا ارتقا

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.3 بیجاپور کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر

6.4 عادل شاہی سلطنت کے ابتدائی دور کے شعرا و ادبا

6.4.1 میراں جی شمس العشاق

6.4.2 شاہ برہان الدین جانم

6.4.3 ابراہیم عادل شاہ ثانی

6.4.4 عبدل

6.5 عادل شاہی سلطنت کے درمیانی دور کے شعرا و ادبا

6.5.1 مقیمی

6.5.2 صنعتی

6.5.3 ملک خوشنود

6.5.4 رستمی

6.5.5 حسن شوقی

6.6 عادل شاہی سلطنت کے آخری دور کے شعرا و ادبا

6.6.1 شاہی

6.6.2 نصرتی

6.6.3 امین الدین اعلیٰ

6.6.4 شاہ معظم

6.6.5 مرزا

6.6.6 ہاشمی

6.6.7 بحری

6.7 اکتسابی نتائج
6.8 کلیدی الفاظ
6.9 نمونہ امتحانی سوالات
6.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
6.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
6.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

بیجا پور کی عادل شاہی حکومت دکن کی ایک عظیم الشان، مستحکم اور خوش حال حکومت تھی۔ اس کا قیام 1490ء میں عمل میں آیا تھا۔ عادل شاہی خاندان کے نو بادشاہوں نے تقریباً دو سو سال تک سلطنت بیجا پور پر نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ 1686ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

عادل شاہی حکمران علوم وفنون کے دل دادہ تھے۔ انہوں نے علما وفضلا، ادبا وشعرا اور دیگر ارباب کمال کی بڑی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی۔ ان کی فیاضی اور داد و دہش کی شہرت سن کر عرب وعجم کے علما اور اہل ہنر اپنے وطن کو چھوڑ کر بیجا پور چلے آئے تھے۔ عادل شاہی حکمرانوں نے ان کی قدردانی کی اور انہیں انعام واکرام سے مالا مال کیا۔ عادل شاہی سلاطین کے عہد میں بیجا پور علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا مرکز بن گیا تھا۔ ان حکمرانوں کو تعمیرات اور فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی چناں چہ انہوں نے بیجا پور میں عالی شان محلات، خوب صورت مساجد، گنبد اور مقبرے تعمیر کروائے جن کے آثار آج بھی باقی ہیں اور بیجا پور کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔

عادل شاہی خاندان کے پیش رو بہمنی خاندان کے حکمرانوں نے شمال کے مقابلے میں اپنے تشخص اور انفرادیت کو باقی رکھنے کے لیے دکن میں نئی تہذیبی روایات کو ترقی دی اور نئی ادبی اور لسانی روایات کی بنیاد بھی رکھی۔ بہمنی سلاطین نے شمال کے مقابلے میں دکنیت کو فروغ دیا۔ دیسی تہذیب، رسم ورواج اور طور طریقوں کو اہمیت دی تاکہ دکن ایک علاحدہ سیاسی اور تہذیبی اکائی بن سکے۔ اس رجحان کے تحت انہوں نے دکنی زبان کی بھی سرپرستی کی۔ عادل شاہی سلاطین نے بہمنیوں کی لسانی اور تہذیبی روایات کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ ان روایتوں کو بہت کچھ فروغ بھی دیا۔ بالخصوص دورِ عادل شاہی کی دوسری صدی دکنی زبان اور شعروادب کی ترقی کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس دور میں شاعری درباری رنگ سے آشنا ہوئی۔ اصنافِ سخن کی باقاعدہ تقسیم ہوئی۔ مثنویوں کے علاوہ غزلیں اور قصائد بھی لکھے گئے۔ شاعری میں فکر واسلوب کی پختگی پیدا ہوئی۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ بیجا پور کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو بیان کرسکیں۔
- ☆ عادل شاہی دور کے ابتدائی شعرا وادبا سے واقف ہوسکیں۔

☆ عادل شاہی دور کے درمیانی شعرا وادبا کے بارے میں معلومات فراہم کرسکیں۔

☆ عادل شاہی عہد کے آخری دور کے شعرا وادبا سے واقف ہوسکیں۔

6.3 بیجاپور کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں جو حکومتیں قائم ہوئیں ان میں بیجاپور کی عادل شاہی حکومت تہذیبی و تمدنی اعتبار سے ایک ممتاز مقام کی حامل ہے۔اس سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ اصلاً ساوہ (ترکستان) کا باشندہ تھا۔وہ نوجوانی میں بیدر آیا اور سلطنت بہمنیہ کے مشہور وزیر محمود گاواں کی مدد سے ترقی کرتا ہوا بیجاپور کا صوبے دار مقرر ہوا۔1490ء میں اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔یوسف عادل شاہ نہایت بہادر اور لائق حکمران تھا۔وہ علما اور فضلا کا بڑا قدر دان تھا۔اس نے ایران، توران، عربستان اور روم جیسے دور دراز مقامات سے اہل کمال کو دعوت نامے بھیج کر بیجاپور بلایا۔وہ خود فارسی کا اچھا شاعر تھا۔اس نے بیجاپور میں بہت سی خوب صورت عمارتیں تعمیر کروائیں جن میں فرخ محل اور آنند محل قابل ذکر ہیں۔ 1510ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ تخت نشین ہوا۔یہ بھی بڑا علم پرور حکمراں تھا۔وہ فارسی میں شعر کہتا تھا۔اس کا تخلص وفائی تھا۔اس نے چنداپور کے نام سے ایک شہر اور چمپا محل کے نام سے ایک عالی شان محل تعمیر کروایا۔1534ء میں اسمٰعیل عادل شاہ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کے تخت پر بیٹھا۔ابراہیم کو علم وادب کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔وہ اہل علم کی دل کھول کر قدر کرتا تھا۔ چناں چہ جب مولانا شہیدی قمی گجرات سے بیجاپور آئے تو ابراہیم نے ان کی بڑی قدر ومنزلت کی اور انہیں پچاس ہزار ہُن عطا کیے۔اس کے دور میں بیجاپور علم وادب، موسیقی اور صناعی کا مرکز بن گیا تھا۔ابراہیم عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ اول 1558ء میں اس کا جانشین ہوا۔ وہ ملا فتح اللہ شیرازی جیسے جیّد عالم کا شاگرد تھا۔اس کے عہد میں عادل شاہی سلطنت بہت وسیع ہوگئی تھی کیوں کہ جنگِ تالی کوٹ کے بعد جنوبی کرناٹک کے بہت سے علاقے اس میں شامل ہوگئے تھے۔علی عادل شاہ اول نہایت اعلیٰ علمی ذوق کا مالک تھا۔اس نے ایک بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا تھا جس میں متعدد کاتب، خوش نویس، نقاش اور جلد ساز کام کرتے تھے۔منتخب کتابوں کے صندوق سفر اور قیام میں اس کے ساتھ رہتے تھے۔اسے تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔ بیجاپور اور شاہ پور کی فصیلیں، نل درگ کا قلعہ، پریا محل، گگن محل، جامع مسجد، چاند باولی اور اپنا ذاتی مقبرہ (آنند محل) اسی کے تعمیر کروائے ہوئے ہیں۔علی عادل شاہ کے بعد اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی 1580ء میں اس کا جانشین ہوا۔اس کے عہد میں بیجاپور صحیح معنی میں اُردو ادب کا مرکز بن گیا۔ابراہیم عادل شاہ ثانی کا شمار جلیل القدر حکمرانوں میں ہوتا ہے۔وہ مغل شہنشاہ اکبر اور گولکنڈہ کے پانچویں حکمراں محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔وہ نہ صرف علما اور شعرا کا سرپرست تھا بلکہ خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا۔اپنے علم وفضل کی بدولت وہ ''جگت گرو'' کے نام سے مشہور تھا۔اس کے عہد میں جب گجرات اور احمد نگر کی سلطنتوں کو زوال ہوا تو اس نے وہاں کے علما اور اصحاب کمال کو بیجاپور آنے کی دعوت دی۔ملا ظہوری (مصنف سہ نثر ظہوری) حکیم ابوالقاسم فرشتہ (مصنف تاریخ فرشتہ) اور ملا رفیع الدین شیرازی (مصنف تذکرۃ الملوک) اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو ہندوستانی موسیقی میں کمال حاصل تھا۔اس نے راگ راگنیوں پر مشتمل گیت لکھے اور کتاب ''نورس'' کے نام سے ان کا مجموعہ تیار کیا۔بیجاپور کی مغربی سمت میں اس نے ایک نیا شہر تعمیر کروایا جس کا نام نورس پور رکھا۔بیجاپور کا سات منزلہ محل، دلکشا محل، حیدر برج اور مسجد ملکہ جہاں وغیرہ بھی اسی کے عہد کی تعمیرات ہیں۔ابراہیم عادل شاہ ثانی نے 1627ء میں وفات پائی۔اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد عادل شاہ بیجاپور کا حکمران ہوا۔یہ نہایت فیاض اور رحم دل بادشاہ تھا۔خود شاعر نہ تھا لیکن علم وادب کا شیدا اور شاعروں کا سرپرست تھا۔اس کی ملکہ خدیجہ سلطان گولکنڈہ

کے فرماں رو امحمد قطب شاہ کی بیٹی تھی۔ اس نے فارسی خاورنامے کا اُردو ترجمہ کرنے پر بیش بہا انعام کا اعلان کیا تھا۔ رستمی نے یہ ترجمہ کر کے انعام حاصل کیا تھا۔ محمد عادل شاہ اور ملکہ خدیجہ سلطان کی اُردو نوازی کی وجہ سے بیجا پور میں اُردو ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ بیجا پور کا مشہور زمانہ گول گنبد اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ 1067ھ میں محمد عادل شاہ کا انتقال ہوا۔

محمد عادل شاہ کے بعد اس کے بیٹے علی عادل شاہ ثانی نے 1656ء میں عنانِ حکومت سنبھالی۔ علی عادل شاہ ثانی کو زندگی بھر سرکش امرا کی بغاوتوں اور مرہٹوں و مغلوں کی یورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر جب بھی ان سے فراغت ملتی وہ ادب اور فنون لطیفہ کی طرف متوجہ ہوتا۔ وہ خود ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کے عہد میں دکنی زبان اور شعر و ادب کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ علی عادل شاہ ثانی کی تعمیر کی ہوئی عمارتوں میں حسینی محل، علی محل، عرش محل اور حسینی مسجد وغیرہ اہم ہیں۔ 1672ء میں صرف پینتیس سال کی عمر میں علی عادل شاہ ثانی کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا کم سن لڑکا سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ ایک کمزور حکمران تھا۔ اس کے عہد میں امرا کی آپسی ناچاقیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ آئے دن مرہٹے تاخت کرتے رہتے تھے۔ مغلوں کی یورش کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ آخر کار 1686ء میں اورنگ زیب نے بیجا پور کو فتح کر لیا اور سکندر عادل شاہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اس طرح سلطنت بیجا پور کا خاتمہ ہو گیا۔

بیجا پور کا علاقہ بہت زرخیز تھا۔ سلطنت میں مرفہ الحالی تھی۔ عادل شاہی حکمرانوں کو رعایا کی فلاح و بہبود کا بڑا خیال تھا۔ انہوں نے اپنی سلطنت میں بے شمار سرائیں، خانقاہیں، پل اور کنویں بنوائے۔ غربا و مساکین کے لیے لنگر خانے قائم کیے۔ عام لوگوں کو تیار غذا دی جاتی تھی، مشائخ اور علما کو وظائف اور انعامات ملتے تھے۔ شہر کے دروازوں پر واقعہ نویس، معتبر خبر گو اور چند سوار موجود رہتے تھے۔ دیہاتوں کی سالانہ جمع بندی کی جاتی تھی۔ بادشاہ کے اوقات کار مقرر تھے۔ وہ اہم امور میں وزرا سے مشورہ لینے کے علاوہ خود تنہائی میں بھی فیصلوں پر غور کرتا تھا۔ بادشاہ کا عادل اور منصف مزاج ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ عیدین، شبِ برات اور سالگرہ پر شہر آراستہ کیا جاتا اور جشن منائے جاتے تھے۔ نوروز کے موقعے پر نو دن تک نہایت تزک و احتشام کے ساتھ شہر سے دور کسی پر فضا مقام پر جشن منایا جاتا تھا۔ الغرض عادل شاہی سلاطین کے عہد حکومت میں ملک پر امن اور رعایا خوشحال تھی۔ اس دور میں موسیقی، مصوری، نقاشی، خطاطی، تعمیرات، صنعت و حرفت، شعر و ادب اور دیگر علوم و فنون کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ آئندہ صفحات میں عادل شاہی دور میں اُردو شعر و ادب کی نشو و نما کا جائزہ لیا جائے گا۔ سہولت کی خاطر اس عہد کے شعرا کو چار زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے (1) اولین دور کے شعرا و ادبا (2) وسطی دور کے شعرا و ادبا (3) آخری دور کے شعرا و ادبا (4) متفرق شعرا و ادبا۔

6.4 عادل شاہی سلطنت کے ابتدائی دور کے شعرا و ادبا

6.4.1 میراں جی شمس العشاق:

میراں جی شمس العشاق دراصل بہمنی عہد کے دور آخر کے صوفی شاعر ہیں۔ عادل شاہی دور میں بھی وہ بیجا پور میں موجود تھے ان کا مفصل تذکرہ بہمنی دور سے متعلق گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔

6.4.2 شاہ برہان الدین جانمؔ:

برہان الدین جانمؔ، شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ انہوں نے علوم ظاہری و باطنی کا اکتساب اپنے والد سے کیا تھا۔ اپنے دور کے بڑے عارف اور صوفی تھے۔ لوگوں کو ان سے بہت فیض پہنچا۔ انہوں نے دکنی زبان میں تصوف اور سلوک کے موضوع پر متعدد رسالے

تحریر فرمائے۔ ان رسالوں کے ذریعے جانمؔ نے طریقت اور معرفت کی تعلیمات کو ان مریدوں اور معتقدوں تک پہنچانے کی کوشش کی جو عربی اور فارسی سے ناواقف تھے۔ جانمؔ نے 1007ھ میں انتقال کیا اور اپنے والد کے مقبرے میں دفن ہوئے۔ جانمؔ نے مختلف نظموں کے علاوہ دوہرے خیال اور مختلف راگ راگنیوں پر مبنی گیت لکھے جنھیں ''حقیقت گیت'' کہا جاتا ہے۔ دکنی ادب کی تاریخ میں جانمؔ کی اہمیت اس لیے ہے کہ دکن کے شعرا واد با میں انہوں نے پہلی مرتبہ نثر کو وسیلۂ اظہار بنایا اور نثری رسالے لکھے۔ ذیل میں برہان الدین جانمؔ کی اہم تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

وصیت الہادی: یہ ایک عارفانہ نظم ہے جس میں ذکر جلی، ذکر خفی، ذکر قلبی، ذکر سری اور اسی طرح کے دیگر مسائل سلوک کا ذکر ہے۔ مزید یہ کہ اس نظم میں روح کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ نظم کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے اس کے بعد شریعت پر عمل کرنے اور شرک سے اجتناب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

بشارت الذکر: یہ ساٹھ اشعار پر مشتمل ایک مختصر نظم ہے۔ اس کی ابتدا میں مختصر حمد و نعت ہے اس کے بعد پانچ ابواب ہیں۔ ہر باب کے تحت ذکر جلی، قلبی، روحی، سری اور خفی، پانچ اذکار کا ایک ایک کر کے ذکر کیا گیا ہے۔ اس نظم کی بحر فارسی ہے۔ اس کے انداز بیان اور اسلوب پر بھی فارسی اسلوب کا اثر نمایاں ہے۔

سکھ سہیلا: جانمؔ کی یہ نظم دراصل ایک صوفیانہ گیت ہے جس میں 28 بند ہیں۔ ہر بند میں تین مصرعوں کے بعد چوتھے مصرے کی تکرار کی گئی ہے۔

منفعت الایمان: یہ بھی ایک عارفانہ نظم ہے جو 120 اشعار پر مشتمل ہے۔ نظم کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے اس کے بعد ''در بیان اعتقاد ملحداں'' کے عنوان سے ملحدوں کے عقائد بیان کیے گئے ہیں اور پھر ''در بیان نصیحت گوید'' کے زیر عنوان گمراہ کن عقائد سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس نظم میں خدا کی توحید اور اس کی عظمت کا بیان بھی موجود ہے۔

نسیم الکلام: یہ 45 اشعار کی ایک مختصر نظم ہے جس میں جانمؔ نے قرآن مجید کی آیات کے ذریعے جبر و قدر کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ آیت کے ساتھ کہیں کہیں حدیث بھی لکھ دی ہے۔

حجتہ البقا: یہ جانمؔ کی ایک طویل نظم ہے جو 805 اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک ایسے طالب یا مرید کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جسے اپنے علم پر غرور تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ کسی جگہ ایک مرشد کامل رہتے ہیں تو وہ انہیں دیکھنے اور ان سے گفتگو کرنے کی غرض سے ان کے ہاں پہنچا۔ اس نے مرشد سے مختلف مسائل پر سوالات کیے۔ مرشد نے ان کے تسلی بخش جوابات دیے۔ اس نظم میں دونوں کی بحث اور سوال و جواب پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں طالب قائل ہو جاتا ہے اور مرشد سے بیعت کر لیتا ہے۔

ارشاد نامہ: ارشاد نامہ کا سنہ تصنیف 990ھ ہے۔ یہ برہان الدین جانمؔ کی سب سے بڑی نظم ہے اس میں تقریباً ڈھائی ہزار اشعار ہیں۔ نظم کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے، پھر اپنے پیر اور والد میراں جی شمس العشاق کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد وجہ تالیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

وجہ تالیف کے بعد کتاب کے موضوعات کا ذکر کیا ہے کہ اس میں شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ان تمہیدی بیانات کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو سوال و جواب کی شکل میں ہے۔ سوال طالب یعنی مرید کی طرف سے اور جواب مرشد کی جانب سے۔ اکبر الدین صدیقی نے 1971ء میں جانم کے ''ارشاد نامہ'' کو مرتب کر کے شائع کیا۔ برہان الدین جانم کثیر التصانیف بزرگ گزرے

ہیں۔ مذکورہ بالا نظموں کے علاوہ ''رموز الواصلین''۔ ''نکتہ واحد''۔ ''مسافرت خان میاں و بیان خلاصہ'' اور لعبتہ جانم بھی ان کی نظمیں ہیں۔ نظموں کے ساتھ انہوں نے مرثیے' گیت' دوہرے اور خیال بھی لکھے۔ جانم کا ایک خاص کارنامہ ''رسالہ کلمتہ الحقائق'' ہے جو نثر میں ہے۔ ذیل میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

کلمتہ الحقائق:

دکنی کا یہ ایک اہم رسالہ ہے۔ ایک طویل مدت تک اسے اُردو کا سب سے پہلا نثری رسالہ سمجھا جاتا رہا لیکن بعد میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق کر کے بتایا کہ اُردو کا پہلا نثری رسالہ ''خیر البیان'' ہے جو صوبۂ سرحد (پاکستان) کے ایک بزرگ پیر روشان بایزید انصاری کی تصنیف ہے۔

برہان الدین جانم کا رسالہ ''کلمتہ الحقائق'' ایک ضخیم رسالہ ہے۔ اس میں تصوف و عرفان کے دقیق مسائل سوال و جواب کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں۔ کلمتہ الحقائق کی عبارت میں دکنی نثر کے ساتھ ساتھ فارسی بھی شامل ہے۔ کہیں کہیں پورا جملہ فارسی کا ہے۔ ''کلمتہ الحقائق'' اس حیثیت سے اہم ہے کہ یہ دکنی کا اولین نثری کارنامہ ہے۔ جانم کی دوسری تصانیف کی طرح ''کلمتہ الحقائق'' کا موضوع بھی تصوف و عرفان ہے۔

6.4.3 ابراہیم عادل شاہ ثانی:

ابراہیم عادل شاہ ثانی' طہماسپ شاہ کا بیٹا اور علی عادل شاہ کا بھتیجا تھا۔ چوں کہ علی عادل شاہ کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس کے انتقال کے بعد ابراہیم تخت نشین ہوا۔ یہ عادل شاہی خاندان کا چھٹا بادشاہ تھا جس نے 1580ء سے 1627ء تک حکومت کی۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی گولکنڈہ کے پانچویں حکمراں محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر اور کئی باتوں میں اس کا ہم مشرب تھا۔ اسے فنون لطیفہ اور تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے علم و فضل کی وجہ سے لوگ اسے ''جگت گرو'' کہتے تھے۔ اس نے بیجاپور کے مغرب میں ایک نیا شہر بسایا جس کا نام نورس پور تھا۔ وہ فارسی اور دکنی میں شاعری کرتا تھا۔ اس کا کچھ فارسی کلام دستیاب ہوا ہے۔ دکنی میں گیتوں کا ایک مجموعہ جس کا نام ''کتاب نورس'' ہے محفوظ ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو موسیقی سے بڑی رغبت تھی۔ ''کتاب نورس'' سے اس کے شاعری و موسیقی کے ذوق کا اظہار ہے۔ کتاب نورس کے سنہ تصنیف کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں کہ اس کی تکمیل 1004ھ اور 1008ھ کے درمیان ہوئی ہوگی۔ (مقدمۂ کتاب نورس۔ طبع ثانی۔ صفحہ 21) ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کا سنہ تصنیف 1006ھ/ 1597ء متعین کیا ہے۔ (تاریخ ادب اُردو۔ جلد اول۔ صفحہ 214)

''کتاب نورس'' فن موسیقی پر کوئی کتاب نہیں ہے۔ البتہ اس میں مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق الگ الگ گیت ترتیب دیے گئے ہیں۔ اس میں سترہ راگوں کے تحت 59 گیت اور سترہ دوہرے لکھے گئے ہیں۔ ہر گیت سے پہلے راگ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی زبان و بیان' تلمیحات و اشارات' ہندو دیومالا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ 1955ء میں ڈاکٹر نذیر احمد نے ''کتاب نورس'' کو مرتب کر کے شائع کیا۔

6.4.4 عبدل:

عبدلؔ کا پورا نام اور حالاتِ زندگی نامعلوم ہیں۔ یہ جگت گرو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار سے وابستہ تھا۔ ڈاکٹر زورؔ نے قیاس کیا ہے کہ شائد اس کا نام عبدالغنی تھا۔ (بحوالہ تذکرہ اُردو مخطوطات' جلد اول' مرتبہ ڈاکٹر زور' ترمیم و اضافہ ڈاکٹر محمد علی اثر صفحہ 440) قرائن سے پتا چلتا ہے کہ عبدل کا تعلق دہلی سے تھا۔ ممکن ہے اس کا خاندان دہلی سے ترکِ وطن کر کے دکن میں آ کر آباد ہو گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود ابراہیم عادل شاہ ثانی کی علم پروری اور فیاضی کے چرچے سن کر دہلی سے بیجاپور آیا ہو۔ عبدل نے 1012ھ میں ابراہیم کی فرمائش پر ''ابراہیم نامہ'' کے نام سے ایک

طویل مثنوی لکھی جس میں اس نے اپنے مربی اور آقا ابراہیم عادل شاہ ثانی کے حالات نظم کیے ہیں۔ ''ابراہیم نامہ'' دبستان بیجاپور کا پہلا ادبی نقش ہے۔ اس سے پہلے جو نظمیں لکھی گئیں وہ مذہبی یا صوفیانہ تھیں۔ یہ مثنوی 712 ابیات پر مشتمل ہے۔ مثنوی کی عام روایت کے مطابق عبدل نے بھی اس مثنوی کو مختلف عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدا میں حمد، نعت، مدحِ چار یار اور منقبت حضرت گیسو دراز ہے۔ اس کے بعد سبب تالیف کی وضاحت کی گئی ہے۔ پھر تعریف سخن اور تعریف قلم کے ابواب ہیں اس کے بعد اصل مثنوی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مثنوی میں عبدلؔ نے نہ صرف ابراہیم عادل شاہ ثانی کی خانگی زندگی کے واقعات محفوظ کر دیے ہیں بلکہ اس زمانے کے رسم و رواج، آدابِ دربار، عمارات، زیورات، سیر و شکار اور موسیقی وغیرہ پر قابل قدر مواد پیش کیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے 1955ء میں اس مثنوی کو مرتب کر کے شائع کیا ہے جس کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں: ''دراصل ابراہیم نامہ''، ''شاہ استاذ'' (یعنی ابراہیم عادل شاہ ثانی) کی شان میں ایک طویل قصیدہ ہے جو بہ شکل مثنوی لکھا گیا ہے۔ اس کا موضوع خود شاہِ دکن کی ذات گرامی ہے۔ اس کا شہر، اس کا قلعہ، اس کا لشکر، اس کا عدل، اس کی سخاوت، اس کی ادب نوازی اور اس کی بزم آرائی۔ یہ کوئی تاریخی مثنوی نہیں ہے لیکن اس میں ابراہیم کی شخصیت کا جو نقش ابھرتا ہے اس میں تاریخی صداقتیں جلوہ گر ہیں۔''

(مسعود حسین خاں۔ مرتب ابراہیم نامہ، طبع ثانی، مقدمہ صفحہ 18)

6.5 عادل شاہی سلطنت کے درمیانی دور کے شعرا و ادبا

6.5.1 مقیمیؔ:

یہ سلطان محمد عادل شاہ (1037ھ سے 1067ھ) کے عہد کا ایک اہم شاعر ہے۔ اس نے ''چندر بدن و مہیار'' کے نام سے دکنی زبان میں ایک مثنوی لکھی جس میں کسی بادشاہ کی تعریف نہیں ہے۔ ''چندر بدن و مہیار'' بیجاپور کی پہلی عشقیہ مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں ایک ہندو راجکماری چندر بدن اور ایک مسلمان تاجر زادہ محی الدین (مہیار) کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ قصہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصوں کی طرح دکن میں مشہور تھا۔ مقیمی نے مثنوی کے سبب تالیف میں گولکنڈہ کے ملک الشعرا ملّا غواصی سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ مقیمیؔ نے اسی کے تتبع میں یہ مثنوی لکھی۔ مقیمی نے اس مثنوی میں سنہ تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بعض شواہد کی بنیاد پر ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ یہ مثنوی 1035ھ اور 1050ھ کے درمیان لکھی گئی۔

مقیمی کی مثنوی ''چندر بدن و مہیار'' دکن کی چند اہم مثنویوں میں سے ایک ہے۔ مقیمی کا اسلوب بیان بہت زیادہ دلچسپ اور شاندار نہیں ہے مگر وہ اس بات پر نازاں ہے کہ اس نے یہ کہانی کہیں سے چرا کر نقل نہیں کی۔ یہ مثنوی اتنی مقبول ہوئی کہ بعد کے کئی شاعروں نے اس قصے کو نظم کیا۔ میرؔ کی مثنوی ''دریائے عشق'' کا پلاٹ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ اکبر الدین صدیقی نے اس مثنوی کو مرتب کر کے 1951ء میں مجلس دکنی مخطوطات حیدرآباد دکن کی جانب سے شائع کیا۔

6.5.2 صنعتیؔ:

صنعتی کا پورا نام سید حسین شاہ محی الدین اور اس کے والد کا نام مرتضٰی قادری عرف شاہ حضرت تھا (پروفیسر سیدہ جعفر، تاریخ ادب اُردو 1700ء تک صفحہ 475) صنعتی خواجہ بندہ نواز کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ صنعتیؔ کے والد ابراہیم عادل شاہ کے مرشد تھے۔ صنعتی نے 1055ھ میں ''قصہ بے نظیر'' کے نام سے ایک طویل مثنوی لکھی جس میں حضرت تمیم انصاری صحابیؓ کے عجیب و غریب اور حیرت انگیز واقعات کو قصے کی شکل میں

پیش کیا ہے۔مثنوی میں اصل قصے سے قبل حمد'نعت' منقبت اور تعریف سخن کے علاوہ سلطان محمد عادل شاہ کی مدح ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے دربار سے وابستہ تھا۔مثنوی ''قصہ بے نظیر'' ایک ہزار چھے سو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں ہر باب کو' مقام' سے موسوم کیا گیا ہے۔کل بارہ مقامات ہیں۔علاوہ ازیں کئی تمہیدی ابواب بھی ہیں۔شعر کی تعریف میں جوابیات لکھی گئی ہیں ان سے صنعتی کے ادبی نظریات اور تنقیدی خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔عبدالقادر سروری نے صنعتی کی اس مثنوی کو مرتب کیا اور یہ سلسلۂ یوسفیہ کے تحت 1938ء میں شائع ہوئی۔

صنعتی کی ایک اور مثنوی ''گلدستہ'' بھی ہے۔اس میں ایک مصری شہزادہ بلعم کی فراست کا قصہ ہے جو چین کے بادشاہ فغفور شاہ کی دختر حظامی کے سوالات کا صحیح جواب دے کر اس سے بیاہ رچاتا ہے۔ابتدا میں حمد و نعت ہے۔اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ایجاز و اختصار اس مثنوی کی خاص خصوصیت ہے۔پروفیسر سیدہ جعفر نے صنعتی کی اس مثنوی کو مرتب کیا جو 2003ء میں شائع ہوئی۔

6.5.3 ملک خوشنود:

یہ گولکنڈے کا ایک حبشی غلام تھا۔ جسے شہزادی خدیجہ سلطان کی شادی کے موقعے پر جہیز اور ساز و سامان کے ساتھ بیجاپور روانہ کیا گیا۔بیجاپور میں ملک خوشنود نے بڑی ترقی کی وہ نہ صرف شاعر تھا بلکہ ایک اچھا منتظم اور سیاست داں بھی تھا۔1045ھ میں سلطان محمد عادل شاہ نے ملک خوشنود کو اپنا سفیر بنا کر گولکنڈہ روانہ کیا۔گولکنڈہ میں ملک خوشنود کا نہایت شاندار استقبال ہوا۔خوشنود نے قصائد'غزلیں اور مرثیے بھی لکھے اور ایک ہجو بھی لکھی لیکن دکنی ادب کی تاریخ میں خوشنود کی اہمیت اس کی مثنوی ''جنت سنگار'' کے سبب ہے۔یہ مثنوی اس نے 1056ھ میں سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش پر لکھی۔اس مثنوی میں ملک خوشنود نے امیر خسرو کی مشہور فارسی مثنوی ''ہشت بہشت'' کو دکنی کا جامہ پہنایا ہے۔یہ مثنوی تین ہزار دو سو پچاس ابیات پر مشتمل ہے۔جنت سنگار میں مثنوی کی روایتی ہیئت کے مطابق ابتدا میں حمد،نعت،صفت معراج اور منقبت خلفائے راشدین ہے۔اس کے بعد میر مومن کی توصیف ہے جن سے خوشنود کو بڑی عقیدت تھی۔پھر سلطان محمد عادل شاہ کی مدح ہے اس کے بعد اصل داستان کا آغاز کیا گیا ہے۔ملک خوشنود ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھا۔''جنت سنگار'' میں اس نے ''ہشت بہشت'' سے خوشہ چینی ضرور کی ہے لیکن جب بھی موقع ملا اپنی جدت طرازی'اپج اور تازہ خیالی کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔''جنت سنگار'' کو پروفیسر سیدہ جعفر نے مرتب کر کے 1997ء میں شائع کروایا ہے۔

6.5.4 رستمی:

رستمی کا نام کمال خاں اور اس کے باپ کا نام اسماعیل خاں تھا۔اسماعیل خاں کا خاندان چھے پشتوں سے بیجاپور کے دربار میں شاہی دبیر کی خدمت پر فائز تھا۔اسماعیل خاں کو شاہی دربار سے ''خطاط خاں'' کا خطاب ملا تھا۔رستمی سلطان محمد عادل شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔وہ اپنے زمانے کا نامور ادیب اور باکمال شاعر تھا۔وہ فارسی اور دکنی میں مہارت کے ساتھ شعر گوئی کرتا تھا۔اسے قصیدہ'غزل اور مثنوی جیسی اصناف سخن میں کمال حاصل تھا۔دکنی ادب کی تاریخ میں اس کی اہمیت اس کی مثنوی ''خاورنامہ'' کی وجہ سے ہے جو ابن حسام کے فارسی ''خاورنامہ'' کا ترجمہ ہے۔محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان جو گولکنڈے کے چھٹے حکمراں سلطان محمد قطب شاہ کی دختر اور عبداللہ قطب شاہ کی بہن تھی بڑی علم پرور اور ادب دوست ملکہ تھی۔اس نے اپنے دور کے تمام شاعروں کو فارسی خاورنامے کا دکنی میں ترجمہ کرنے کی دعوت دی تھی اور اعلان کیا تھا کہ جو کوئی ابن حسام کے فارسی خاورنامے کا کامیاب منظوم ترجمہ کرے گا اسے انعام و اکرام سے سرفراز کیا جائے گا۔رستمی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ڈیڑھ سال کی مدت میں ترجمے کا کام مکمل کر کے انعام کا مستحق قرار پایا۔

رستمی کا خاور نامہ اُردو کی سب سے طویل مثنوی مانی جاتی ہے جو تقریباً چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں 222 عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔خاور نامے میں حضرت علیؓ اور آپ کے ساتھیوں کی مختلف بادشاہوں' دیوؤں' پریوں' جادوگروں اور آدم خوروں سے لڑائیوں کا حال بطور داستان بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک فرضی داستان ہے جو داستان امیر حمزہ کی طرز پر لکھی گئی ہے۔مثنوی کے اختتام پر رستمی نے فارسی نثر میں مثنوی کے سبب تالیف پر روشنی ڈالی ہے۔''خاور نامہ'' ایک کامیاب رزمیہ مثنوی ہے۔اس میں میدان جنگ' اسلحہ جات' گھوڑے' حرب وضرب اور جنگی مناظر کی بھر پور تصویر کشی کی گئی ہے۔اس کے علاوہ منظر نگاری اور سراپا نگاری کے بھی اچھے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔رستمی کی صلاحیت اور روانی طبع کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ چوبیس ہزار ابیات پر مشتمل اس طویل مثنوی میں نہ کہیں تسلسل مجروح ہوا ہے اور نہ ہی واقعات کا ارتباط کہیں منقطع ہوا ہے۔مثنوی کے تمام اشعار ایک دوسرے سے پیوست نظر آتے ہیں۔جس کی وجہ سے داستان میں ترتیب وتوازن اور ہم آہنگی وتسلسل کا احساس ہوتا ہے۔رستمی کے ترجمے کو اُردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہ ترجمہ اس قدر دلکش اور پراثر ہے کہ اس پر ترجمے کی بجائے اصل کا گمان ہوتا ہے۔رستمی کی اس ضخیم مثنوی کو شیخ چاند ابن حسین نے مرتب کیا اور 1968ء میں اسے ترقی اُردو بورڈ کراچی نے شائع کیا۔

6.5.5 حسن شوقیؔ:

حسن شوقی اپنے دور کا مسلم الثبوت استاد تھا۔حسن شوقی ابتدا میں احمد نگر کے نظام شاہی دربار سے وابستہ رہا۔1633ء میں مغلوں نے نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ کر دیا تھا۔اسی دور زوال وانتشار کے آخری دنوں میں حسن شوقی عادل شاہی سلطنت میں آ گیا۔اس وقت سلطان محمد عادل شاہ بیجاپور کا فرمان روا تھا۔1043ھ میں محمد عادل شاہ نے اسے اپنا سفیر بنا کر گولکنڈہ روانہ کیا۔اس طرح حسن شوقی کو دکن کے تین مختلف درباروں یعنی نظام شاہی' عادل شاہی اور قطب شاہی سے وابستہ ہونے کا موقع ملا۔

حسن شوقی بیجاپور کے مشہور صوفی مولانا حبیب اللہ کا مرید تھا۔حسن شوقی کو ایک مثنوی نگار اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے اہمیت حاصل ہے۔اس کی دو مثنویاں اور 21 غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔حسن شوقی کی پہلی مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' ہے جو (620) اشعار پر مشتمل ہے۔اس مثنوی میں حسن شوقی نے دکن کی مشہور جنگ تالی کوٹ کا حال لکھا ہے۔ یہ جنگ 972ھ/1564ء میں وجیانگر کے راجہ رام راج اور دکن کے مسلم حکمرانوں (ابراہیم قطب شاہ۔علی عادل شاہ اول۔حسین نظام شاہ اور علی برید شاہ) کی متحدہ افواج کے درمیان ہوئی جس میں رام راج کو شکست فاش ہوئی اور وہ میدان جنگ میں گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔حسن شوقی نے اس فتح کے موقعے پر منظوم فتح نامہ لکھ کر حسین نظام شاہ کے حضور میں پیش کیا۔ اس مثنوی میں حسن شوقی نے اپنے مربی حسین نظام شاہ کو اصل فاتح دکھایا ہے۔اس مثنوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن شوقی کو رزم و بزم دونوں پر عبور حاصل تھا۔اس نے موقع ومحل کے مطابق اسلوب ولہجہ اختیار کیا ہے۔اور زبان و بیان میں بھی کرداروں سے مناسبت کا خیال رکھا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس مثنوی میں بیان کردہ واقعات قابل اعتماد اور مستند ہیں۔''فتح نامہ نظام شاہ'' آج سے تقریباً ساڑھے چار سو سال پرانی اُردو کا نمونہ ہے۔

حسن شوقی کی دوسری مثنوی ''میزبانی نامہ'' ہے۔اس میں سلطان محمد عادل شاہ کی اس شادی کو موضوع بنایا گیا ہے جو نواب مظفر خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔میزبانی نامہ 1214 اشعار پر مشتمل ہے۔اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کی میزبانی' سلطان کی شہر گشت' مظفر خاں کی مہمانی اور جہیز کی تفصیل نظم کی گئی ہے۔حسن شوقی نے جشن کی دھوم دھام' میزبانی اور مہمانی کی شان وشوکت' عیش وعشرت اور آرائش وزیبائش کا ذکر ایسی

ترتیب اور سلیقے سے کیا ہے کہ سجاوٹ اور سامان کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔اس مثنوی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے اس زمانے کے رسم ورواج، عادات واطوار، طورطریقے، آداب مجلس، ملبوسات اور مختلف ظروف کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔اس طرح یہ مثنوی آج سے صدیوں پہلے کی مسلم تہذیب ومعاشرت کا مرقع پیش کرتی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے 1971ء میں ''دیوان حسن شوقی'' مرتب کیا جو انجمن ترقی اُردو پاکستان (کراچی) سے شائع ہوا۔اس میں غزلیات کے علاوہ ''مثنوی فتح نامہ نظام شاہ'' اور ''مثنوی میزبانی نامہ'' بھی شامل ہے۔ مثنویوں کی طرح غزلوں میں بھی حسن شوقی نے اپنی مہارت سخن اور قادرالکلامی کا مظاہرہ کیا ہے۔اس کی غزل خیال، اسلوب لہجے اور طرز ادا میں فارسی غزل کی پیروی کرتی ہے۔اس کے کلام میں مٹھاس اور حلاوت کا احساس ہوتا ہے۔حسن شوقیؔ کی غزلیں غزل کی اسی روایت کا حصہ ہیں جس کا نقطۂ عروج ولیؔ اورنگ آبادی کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔

6.6 عادل شاہی سلطنت کے آخری دور کے شعرا وادبا

6.6.1 شاہیؔ:

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کا آٹھواں حکمران سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ دکنی کا نہایت بلند پایہ شاعر تھا۔یہ سلطان محمد عادل شاہ کا فرزند اور جگت گرو ابراہیم عادل شاہ ثانی کا پوتا تھا۔اسے اپنے دادا ابراہیم عادل شاہ ثانی کی طرح شاعری اور موسیقی سے بڑی رغبت تھی۔یہی وجہ ہے کہ اگر دادا نے ''جگت گرو'' کا نام پایا تو پوتے نے ''استادِ عالم'' کے لقب سے شہرت حاصل کی۔سلطان علی عادل شاہ ثانی نے فنون لطیفہ اور علم وحکمت اور شعروادب کی بڑی سرپرستی کی۔اس کے دربار سے کئی علما، فضلا، شعرا اور مورخین وابستہ تھے جن میں ابوالمعالی، سید نوراللہ، عبدالنبی، سید کریم اللہ اور نصرتی کے نام قابل ذکر ہیں:

علی عادل شاہ ثانی شاہی ایک قادرالکلام اور پرگوسخنور تھا۔وہ دکنی اور فارسی دونوں میں مشق سخن کرتا تھا لیکن اسے دکنی زبان سے بڑی محبت تھی کیوں کہ یہ اس کی مادری زبان تھی۔شاہی نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔''کلیات شاہی'' میں قصیدے، مثنویاں، غزلیں، مخمس، مثمن، رباعیات، فردیات، گیت، کبت، دوہرے، جھولنہ اور تاریخی قطعات موجود ہیں۔شاہی ایک حسن پرست، عیش کوش اور رند مشرب انسان تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس کی غزلوں میں ہجر وفراق کی تپش اور سوز وگداز کی کیفیت نہیں ملتی۔اس کی شاعری میں کیف وطرب اور سرمستی کا احساس ہوتا ہے۔اس نے غزلوں میں محبوب کے حسن وجمال، خدوخال اور رفتار وگفتار کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے۔شاہیؔ کی غزلوں کے اظہار واسلوب اور لب ولہجے میں ندرت اور بانکپن پایا جاتا ہے۔اس کی تشبیہات اور استعارے مقامی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔اس نے ہندوستانی روایات اور ہندو دیومالا کو بڑی مہارت کے ساتھ غزل میں سمویا ہے۔مقامی اور ملکی عناصر کی جلوہ ریزی دکنی شاعری کا امتیازی وصف ہے اور یہ وصف شاہیؔ کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔اس کے کلام کا پورا پس منظر ہندوستانی ہے۔شاہیؔ نے قصائد میں تشبیب، گریز، مدح اور دعا چاروں اجزائے ترکیبی کو بڑے قاعدے اور مہارت کے ساتھ نبھایا ہے۔شاہی نے یہ قصیدے فارسی روایت کے تتبع میں کہے ہیں۔فارسی قصائد کی طرح اس کے قصیدوں میں رفعت فکر، علوئے مضامین، زور بیان اور شوکت الفاظ جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کی بدولت شاہی کا شمار دکنی کے صف اول کے قصیدہ نگاروں میں ہوتا ہے۔شاہیؔ کے کلیات میں گیت بھی ہیں جو مختلف راگ راگنیوں میں لکھے گئے ہیں۔ان گیتوں میں سنسکرت، تہذیب اور ہندو اساطیر کے بکثرت حوالے ملتے ہیں۔شاہیؔ کو موسیقی سے اتنا گہرا شغف تھا کہ گیتوں کے علاوہ اس نے بعض مرثیے بھی راگوں کے آہنگ میں لکھے۔انہیں پڑھنے کے

لیے مرثیے کے اوپر راگ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔شاہیؔ کے سارے کلام میں غنائیت کا احساس ہوتا ہے۔

کلیاتِ شاہی کے واحد نسخے کو، جو نامکمل ہے، مولوی نصیرالدین ہاشمی نے دریافت کیا۔1962ء میں اسی نسخے کو سید مبارز الدین رفعت اور زینت ساجدہ نے مرتب کر کے علاحدہ علاحدہ طور پر شائع کیا۔

6.6.2 نصرتیؔ:

یہ سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔نصرتی کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا۔اس کے والد عادل شاہی لشکر میں سلحدار کے عہدے پر فائز تھے۔نصرتیؔ نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا۔نصرتی علی عادل شاہ ثانی کی شہزادگی کے زمانے سے اس کا دوست تھا جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے نصرتی کو نہ صرف اپنے مصاحبوں میں شامل کیا بلکہ اپنے دربار کا ملک الشعرا بھی مقرر کیا۔ یہ منصب نصرتی کو یوں ہی نہیں دیا گیا تھا اس کے پیچھے اس کے علم وفضل کا بھی دخل تھا۔ بیجاپور میں اس کی علمیت کا شہرہ تھا لوگ اسے ملّا نصرتی کے احترامی نام سے پکارتے تھے۔نصرتی نے طبعی موت نہیں پائی بلکہ حاسدوں نے جو اس کی عزت وعروج سے جلتے تھے سازش کر کے اسے قتل کرادیا تھا۔''نصرتی شہید اہے'' کے الفاظ سے اس کا سنہ وفات 1085ھ برآمد ہوتا ہے۔نصرتی کی قبر نگینہ باغ بیجاپور میں واقع ہے۔نصرتی کی جو تصانیف دستیاب ہوئی ہیں ان میں تین مثنویاں (1) ''گلشنِ عشق''(2) ''علی نامہ'' (3) ''تاریخ اسکندری'' اور ایک دیوانِ قصائد وغزلیات ورباعیات شامل ہے۔

مثنوی ''گلشن عشق'' نصرتی کی اولین تصنیف ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1068ھ ہے۔اس میں نصرتی نے منوہر اور مدمالتی کی داستان عشق بیان کی ہے ''گلشن عشق'' کا ڈھانچہ وہی ہے جو اس دور کی دیگر دکنی مثنویوں کا ہے۔مثنوی کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے جیسے حمد، نعت، معراج، منقبت، مدح گیسودراز، مدح بادشاہ وغیرہ۔ان تفصیلات کے بعد اصل داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ ہر باب کے شروع میں نصرتی نے ایک شعر لکھا ہے جس میں اس باب کے مطالب کا خلاصہ آجاتا ہے۔عنوانات کے سارے اشعار ایک ہی بحر اور قافیے میں ہیں۔اگر ان اشعار کو یکجا کر لیا جائے تو داستان کا خلاصہ سامنے آتا ہے۔اس مثنوی کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ نصرتیؔ نے اکثر ابواب کے آغاز میں مختلف مناظر کی مرقع کشی کی ہے اور قصے کے ضمن میں جو حالات اور واقعات پیش آتے ہیں ان کی بھرپور عکاسی کی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مختلف انسانی جذبات کی کیفیت بھی ہر موقعے پر نہایت خوبی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔اکثر ابواب کے خاتمے پر نصیحت آمیز اشعار بھی لکھے ہیں۔''گلشن عشق'' سے نصرتی کی شاعرانہ قدرت اور زور بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔''گلشن عشق'' کو مولوی سید محمد اور مولوی عبدالحق نے الگ الگ مرتب کر کے شائع کروایا ہے۔

نصرتی کی دوسری تصنیف ''علی نامہ'' ایک رزمیہ مثنوی ہے جو 1076ھ میں لکھی گئی اس میں ان جنگی مہمات کا ذکر ہے جو سلطان علی عادل شاہ ثانی کو شیواجی مرہٹہ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے اور مغلوں کے حملوں کی مدافعت میں پیش آئی تھیں اس لیے اس نے اس مثنوی کا نام بادشاہ کے نام پر ''علی نامہ'' رکھا۔ایک اعتبار سے یہ علی عادل شاہ ثانی کے ابتدائی عہد کی منظوم تاریخ ہے جو حقائق پر مبنی ہے۔خود نصرتی نے اسے ''شاہ نامہ دکن'' قرار دیا ہے۔نصرتی نے ''علی نامہ'' میں دربار کی زیب وزینت، سیاسی اتار چڑھاؤ اور جنگ وجدل کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس مثنوی میں بعض ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جنھیں بیان کرنے سے تاریخ بھی قاصر ہے۔اس طرح یہ مثنوی مورخوں کے لیے ایک اہم تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔''گلشن عشق'' کی طرح ''علی نامہ'' میں بھی نصرتی نے

ہر باب کے آغاز میں بطور عنوان ایک یا دو شعر لکھے ہیں جو ایک ہی بحر اور ایک ہی زمین میں ہیں۔ ہر شعر کے ذریعے ایک باب کا اور بحیثیت مجموعی تمام اشعار سے ساری مثنوی کا خلاصہ سامنے آتا ہے۔مثنوی کے آغاز میں حمد،نعت، معراج، منقبت وغیرہ کے ابواب ہیں۔مثنوی کے درمیان علی عادل شاہ کی مدح میں قصائد بھی ہیں۔نصرتی کی اس مثنوی کو پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے مرتب کر کے شائع کروایا ہے۔

نصرتی کی تیسری مثنوی ''تاریخِ اسکندری'' بھی ایک رزمیہ مثنوی ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1083ھ ہے۔اس مثنوی میں نصرتی نے عادل شاہی سپہ سالار بہلول خاں اور شیواجی کے درمیان لڑی گئی جنگ کو موضوع بنایا ہے جس میں شیواجی کو شکست اور بہلول خاں کو فتح نصیب ہوئی تھی۔ نصرتی کی یہ مثنوی ''گلشنِ عشق'' اور ''علی نامہ'' کے مقابلے میں بہت ہی مختصر ہے۔اس میں صرف (554) ابیات ہیں۔ابتداءً حمد ہے جو نہایت مختصر ہے اس کے بعد مثنوی کے نام اور سنہ تالیف کی وضاحت کر کے اصل مثنوی کا آغاز کیا گیا ہے۔مولوی عبدالحق بیان کرتے ہیں کہ یہ نصرتی کا آخری کلام ہے اور یہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جو اس کے اور بیجاپور کے انحطاط کا زمانہ ہے۔اس زمانے میں نہ اگلی سی شان و شوکت تھی نہ اگلے بادشاہوں کا سا جاہ و جلال تھا اور نہ ان کے جیسے پُر عظمت کارنامے تھے۔غرض یہ کہ شاعر کی طبیعت کو ابھارنے والی کوئی بات نہ تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے نصرتی کا جو دیوان مرتب کیا ہے اس میں مثنوی ''تاریخ اسکندری'' کے علاوہ قصائد، غزلیات اور رباعیات بھی شامل ہیں۔نصرتی نہ صرف ایک باکمال مثنوی نگار تھا بلکہ قصیدہ گوئی میں بھی اس کا پایہ بہت بلند ہے۔قصیدہ گوئی میں دکنی کا کوئی شاعر اس کی برابری نہیں کر سکتا۔شوکتِ لفظی، علو مضامین اور زورِ بیان جو قصیدے کے اہم لوازمات ہیں نصرتی کے قصائد میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔اس کی قصیدہ گوئی صرف بادشاہوں کی مدح و ستائش تک محدود نہیں رہی بلکہ اس نے جنگ کے واقعات اور مظاہر قدرت کے بیان میں بھی بڑے پُر زور قصائد لکھے ہیں۔معیارِ سخن کے اعتبار سے نصرتی کے قصائد فارسی قصائد سے ٹکر لیتے ہیں۔نصرتی غزل کا بھی مسلم الثبوت استاد تھا۔اس کی غزلوں میں تخیل کی رنگینی، جذبے کی حرارت، معنیٰ آفرینی اور حسن بیان جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔غزلوں میں اس نے عشق کی واردات، حسن کی جلوہ آفرینوں اور محبت کے تجربات کی پُر اثر ترسیل کی ہے۔نصرتی کی رباعیات اور مرثیے بھی فنی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔

6.6.3 امین الدین اعلیٰ:

سید شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپور کے مشہور صوفی شاہ میراں جی شمس العشاق کے پوتے اور شاہ برہان الدین جانم کے فرزند تھے۔وہ 1007ھ میں پیدا ہوئے اور 1085ھ میں ان کا انتقال ہوا۔(ڈاکٹر حسینی شاہد۔سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔صفحہ 119 اور 149)

شاہ امین جس طرح بیجاپور کے صوفیا میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔اسی طرح دکنی ادب کی تاریخ میں بھی وہ ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کی خاندانی روایت کو آگے بڑھایا اور کئی منظوم اور نثری رسائل لکھے۔منظومات میں ''رموز السالکین''۔''قربیہ''۔''محبّ نامہ'' اور ''وجودیہ'' اہم ہیں۔ان کے علاوہ انہوں نے خیال، ریختہ، غزلیں، سہیلا نیز راگ راگنیوں پر مبنی گیت بھی لکھے۔

''رموز السالکین'' شاہ امین کی ایک طویل مثنوی ہے جس میں انہوں نے تصوف کے بعض مسائل، مشاہدے اور مراقبے کے تمام مدارج اور ان کی کیفیات پر روشنی ڈالی ہے۔''قربیہ'' بھی شاہ امین کی ایک مثنوی ہے جس میں وحدت و کثرت، معرفتِ نفس، حقیقتِ محمدی، مشاہدۂ حق اور سفلی اوصاف سے پرہیز کی اہمیت وغیرہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔''وجودیہ'' شاہ امین کی ایک نسبتاً طویل مثنوی ہے۔اس میں توحید، فنا اور بقا کے مضامین کے علاوہ سوال اور جواب کے طرز میں مشاہدۂ نفس، پانچ عناصر، پچیس گن اور پانچ تن کی تفصیلی وضاحت کی گئی ہے۔''محبّ نامہ'' ایک مختصر نظم ہے جس

میں شاہ امین نے ابتدا میں محبوب مجازی کا سراپا بیان کیا ہے اس کے بعد نور محمدی کی تعریف کی ہے۔ ''مدح شاہ برہان'' موضوع کے اعتبار سے قصیدہ ہے اس میں شاہ امین نے اپنے والد شاہ برہان کے روحانی کمالات' باطنی فیوض اور ان کے اوصاف حمیدہ کی تعریف کی ہے لیکن اس کی ہیئت قصیدے کی نہیں ہے۔ شاہ امین کی ایک نظم ''گفتار امین اعلیٰ'' کے عنوان سے ملتی ہے جو خاصی طویل ہے۔ اس نظم کی بحر ہندوی ہے۔ اس میں وحدت کے مسئلے پر روشنی ڈال کر ''وحدت الشہو د'' کو واضح کیا گیا ہے۔ شاہ امین کے نثری رسائل کے نام یہ ہیں گنج مخفی' وجود یہ'' گفتار شاہ امین''۔ ''ارشادات ظاہر و باطن''۔ ''عشق نامہ''۔ ''شرح کلمۂ طیب''۔ ''کلمتہ الاسرار'' وغیرہ۔ دکنی نثر کے ارتقا میں شاہ امین کے ان رسائل کی بڑی اہمیت ہے۔ شاہ امین کی منظوم اور نثری تصانیف کا بنیادی موضوع تصوف و اخلاق ہے تصوف میں ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پانچ عناصر پچیس گن کے فلسفے کو مکمل کیا اور مراتب وجود کو سمجھنے کے لیے مطالعۂ نفس کی اہمیت پر زور دیا۔

6.6.4 شاہ معظم:

شاہ معظم علی عادل شاہ ثانی کے دور کے ایک صوفی شاعر تھے۔ انہوں نے سکندر عادل شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔ ان کا نام محمد حسینی تھا۔ اور وہ قادری تھے معظم شاہ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ قادر لنگا کوتال کے مرید تھے اور انہیں سے خلافت بھی حاصل کی تھی۔ شاہ معظم ایک قادر الکلام سخنور تھے۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ مثنوی' غزل اور قصیدے کی ہیئتوں میں ان کا کلام موجود ہے۔ معظم کی مثنویوں میں ''معراج نامہ''۔ ''ساقی نامہ''۔ ''مفتاح الاسرار''۔ ''آزاد نامہ''۔ ''گلزار چشت'' اور ''شجرۃ الاتقیا'' اہم ہیں۔ غزلوں کا ایک دیوان بھی ان کی یادگار ہے۔

معراج نامہ: معظم نے یہ مثنوی 1070ھ میں لکھی۔ اس میں معراج کے واقعے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ مثنوی سولہ ابواب پر مشتمل ہے ابتدائی ابواب حمد' نعت و منقبت کے لیے مختص ہیں۔

ساقی نامہ: یہ مثنوی اُردو کا پہلا ساقی نامہ ہے۔ مثنوی کے پہلے حصے میں معظم نے مئے و مینا اور کیف و مستی کے حقیقی مضامین باندھے ہیں اور دوسرے حصے میں ساز و نغمہ اور اس کے سرور و نشاط کو بیان کیا ہے۔ اس ساقی نامے میں حقیقی اور مجازی دونوں رنگ پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔

مفتاح الاسرار: یہ مثنوی 1273 اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں معظم نے اپنی روحانی سرگزشت اپنے خانوادے کی تعلیمات اور نظامِ تصوف کی تشریح کی ہے۔

آزاد نامہ: یہ مثنوی ڈیڑھ سو ابیات پر مشتمل ہے۔ جس میں معظم نے فقرا کی سج دھج' وضع قطع' طور طریق' مزاج و افتاد طبع' بے نیازی و استغنا' مدارج و مقامات' بے سروسامانی' طمانیت قلب اور تعلق باللہ کا ذکر کیا ہے۔

گلزار چشت: معظم کی یہ مثنوی چار سو ابیات پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی ایک طرح سے منظوم تذکرہ ہے جس میں حضرت خواجہ اجمیری سے حضرت برہان الدین غریب تک چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کا حال قلم بند کیا گیا ہے۔ مثنوی کا آغاز حسب روایت حمد و نعت سے کیا گیا ہے۔

شجرۃ الاتقیا: یہ معظم کی سب سے ضخیم مثنوی ہے جو پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ ''گلزار چشت'' کی طرح یہ بھی منظوم تذکرہ ہے جس میں معظم نے حضرت بندہ نواز گیسو دراز' حضرت جمال الدین مغربی' حضرت کمال الدین بیابانی' شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے خانوادے کے تمام بزرگوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے مختصر حالات زندگی اور کرامات بیان کیے ہیں۔

معظم نے غزلیات کا ایک دیوان بھی چھوڑا ہے جس میں غزلوں کے علاوہ قصیدہ اور ریختیاں بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی نے

ان کا یہ دیوان شائع کیا ہے۔ معظم کی ایک سی حرفی بھی مشہور ہے جس میں الف سے والسلام تک ہر حرف تہجی سے ایک ایک شعر کا آغاز کیا گیا ہے۔ دکنی نثر میں معظم کا ایک مختصر رسالہ ''شرح شکارنامہ'' کے نام سے ملتا ہے۔ جس میں حضرت گیسودراز کے فارسی شکارنامے کی شرح بیان کی گئی ہے۔ معظم کے اس رسالے کو سید مبارز الدین رفعت اور ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے الگ الگ شائع کیا ہے۔

6.6.5 مرزا:

مرزا عادل شاہی دور کا سب سے بڑا مرثیہ نگار تھا۔ یہ علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں موجود تھا۔ اس نے حمد، نعت، منقبت اور مرثیہ کے سوا کسی دوسری صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ یہاں تک کہ جب بادشاہ نے اپنی مدح لکھنے کی خواہش کی تو اس نے انکار کر دیا۔ مرزا مرثیہ گوئی کو اپنا مذہبی فریضہ خیال کرتا تھا۔ شہدائے کربلا سے اسے والہانہ عشق تھا۔ چنانچہ مرثیہ پڑھتے وقت کسی دشمن نے اسے خنجر مار کر ہلاک کر دیا۔ دوسرے دن یوم عاشورہ تھا۔ علی عادل شاہ ثانی نے حکم دیا کہ سارے تعزیے اور علم ابراہیم پور کے دروازے سے جو فتح دروازہ کہلاتا تھا لے جائے جائیں۔ تعزیوں اور علموں کے پیچھے مرزا کا جنازہ تھا۔ مرزا کے شاگرد مرثیہ خوانی کرتے ہوئے جنازے کے ساتھ تھے۔ جنازہ مرتضیٰ قادری کی درگاہ کو لیجایا گیا جہاں اس کی تدفین عمل میں آئی۔ دکن میں مرزا نام کا ایک اور مرثیہ گو شاعر تھا جو گولکنڈے کا باشندہ تھا۔ وہ ابوالحسن تانا شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ قدیم بیاضوں میں مرزا کے تخلص سے جو مرثیے ملتے ہیں ان میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کون سے مرثیے مرزا بیجاپوری کے ہیں اور کون سے مرزا گولکنڈوی کے۔ مرزا کے مرثیے دکن میں بہت مقبول تھے۔ اس نے مختصر مرثیے بھی لکھے اور طویل مرثیے بھی۔ اس کے مرثیے مسدس اور غزل کی ہیئت میں ہیں۔ اس نے نوحے اور سلام بھی لکھے۔

6.6.6 ہاشمی:

سید میراں میاں خاں ہاشمی علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا ایک قادر الکلام اور پرگو شاعر اور شاہ ہاشم مہدوی (م 1080ھ) کا مرید تھا۔ مشہور ہے کہ وہ پیدائشی اندھا تھا۔ لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ سن شعور کو پہنچنے کے بعد چیچک کی بیماری سے اس کی بینائی جاتی رہی۔ عادل شاہی حکومت کے زوال کے بعد وہ ارکاٹ چلا گیا۔ ہاشمی کے سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ شمس اللہ قادری نے ''اُردوئے قدیم'' میں ہاشمی کا سنہ وفات 1109ھ متعین کیا ہے جو قرین قیاس ہے۔ ہاشمی کی تصانیف میں دیوان غزلیات کے علاوہ مثنوی ''یوسف زلیخا''۔ ''مثنوی عشقیہ''۔ ''معراج نامہ''، مخمس درنعت ومدح مہدی جونپوری، قصائد اور ہجویہ مثنوی شامل ہیں۔

مثنوی ''یوسف زلیخا'' ہاشمی کی سب سے ضخیم مثنوی ہے۔ یہ پانچ ہزار ایک سو بیاسی اشعار پر مشتمل ہے۔ (بحوالہ ڈاکٹر محمد علی اثر ''دکنی کی تین مثنویاں'' صفحہ 13)۔ اس کا سنہ تصنیف 1099ھ ہے۔ ہاشمی نے اس میں یوسف زلیخا کے روایتی قصے کو نظم کیا ہے۔ پوری مثنوی (54) فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ فصلوں کے عنوانات اشعار میں ہیں جنھیں یکجا کرنے سے مربوط نظم بن جاتی ہے۔ یہ مثنوی ہاشمی نے اپنے مرشد کی فرمائش پر قلم بند کی۔ مثنوی کے آغاز میں حمد و نعت اور ذکر معراج کے بعد سید محمد جونپوری اور اپنے مرشد سید ہاشم مہدوی کی منقبت ہے۔ ''یوسف زلیخا'' کسی فارسی تصنیف کا ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد تصنیف ہے۔ اس مثنوی میں ہاشمی کی شاعرانہ صلاحیتیں بام عروج پر نظر آتی ہیں۔ قصے کی ترتیب، مختلف اور متضاد عناصر میں باہمی ربط، منظر کشی، جذبات نگاری، روانی اور بہاؤ یہ ایسی خصوصیات ہیں جن کی بدولت اس مثنوی کو فنی اعتبار سے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

''مثنوی عشقیہ'' جس کا ایک نام ''قصہ'' بھی ہے ہاشمی کی دوسری اہم مثنوی ہے۔ اس میں ہاشمی نے کشمیر کی شہزادی اور ایک معمولی نوجوان

کے عشق کی المیہ داستان اور ایک بقال زادے سے شیخ سعدی کی محبت کے قصے کو باہم مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ہاشمی نے جس خوبصورتی ‘سلیقے اورفن کارانہ مہارت سے قصے کا پلاٹ تیار کیا ہے وہ اس کے فن کارانہ کمال کی دلیل ہے‘ زبان واسلوب اور فنی پختگی کے اعتبار سے یہ مثنوی قدیم ادب میں ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔

’’معراج نامہ‘‘ میں ہاشمی نے معراج کے واقعات کو موضوع بنایا ہے۔ہاشمی نے اس واقعے کی جزئیات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔یہ ایک عوامی انداز کی مثنوی ہے جو محفلوں میں پڑھ کر سنانے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔اس کی بحر نہایت رواں اور مترنم ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ’’تاریخ ادب اُردو‘‘ (جلد اول) میں ’’معراج نامہ‘‘ کا ذکر ایک علحدہ مثنوی کے طور پر کیا ہے۔لیکن افسر صدیقی امروہوی کا خیال ہے کہ ’’معراج نامہ‘‘ دراصل مثنوی ’’یوسف زلیخا‘‘ ہی کا ایک باب ہے۔مخمس درنعت و مدح مہدی جونپوری (38) بندوں پر مشتمل ہے۔اس میں حمد ونعت‘ ذکر معراج مدح اولادِ علیؓ کے بعد سید مہدی جونپوری کی مدح لکھی گئی ہے۔بعد کے بند فرقۂ مہدویہ کے اکابرین کی تعریف وتوصیف میں ہیں۔

ہاشمی کا دیوان ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مرتب کر کے 1961ء میں شائع کیا ہے۔ہاشمی کے دیوان میں ریختی کے انداز کی غزلیں ہیں۔اسے ریختی کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہا جاسکتا ہے۔ہاشمی کا دیوان دکنی عورتوں کی گھریلو زبان‘ محاوروں اور کہاوتوں کا خزانہ ہے۔ہاشمی نے عورتوں کے جذبات کو عورتوں کی زبان میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے اشعار میں دکنی عورتوں کی آواز اوران کا لب ولہجہ صاف سنائی دیتا ہے۔

ہاشمی نے دو قصیدے بھی لکھے تھے جو ذوالفقار خاں صوبے دار ارکاٹ کی مدح میں ہیں۔ڈاکٹر محمد علی اثر نے ان غیر مطبوعہ قصیدوں کو مرتب کر کے اپنی کتاب ’’دکنی شاعری۔تحقیق وتنقید‘‘ میں شائع کیا ہے۔ہاشمی کی ایک مختصر مثنوی ’’ابیات ہندی تصنیف ہاشمی‘‘ کے عنوان سے ہے۔یہ ایک ہجو یہ مثنوی ہے جس میں شاہ داول کی مذمت کی گئی ہے اور عورتوں کو نصیحت کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ڈاکٹر محمد علی اثر نے اس مثنوی کو بھی مرتب کر کے اپنی کتاب ’’دکنی کی تین مثنویاں‘‘ میں شائع کیا ہے۔

6.6.7 بحرؔی:

ان کا نام سید محمود اور لقب و تخلص بحرؔی تھا۔بحری قصبہ گوگی کے باشندے تھے جو سگر (نصرت آباد) کے مضافات میں واقع ہے۔ان کے والد بحرالدین گوگی کے قاضی تھے اور ’’قاضی دریا‘‘ کے نام سے مشہور تھے۔بحری کے والد شاہ برہان الدین جانمؔ کے خانوادے میں مرید تھے۔قاضی محمود بحری کو شیخ محمد باقر عرف منجن بحری سے نسبت وارادت حاصل تھی۔1095ھ میں بحری گوگی سے بیجاپور گئے۔جہاں سکندر عادل شاہ ان کا معتقد تھا۔بیجاپور میں آئے اسے دو سال ہوئے تھے کہ مغلوں نے بیجاپور پر قبضہ کرلیا۔بحری نے بیجاپور سے نکل کر حیدرآباد کا رخ کیا۔سفر کے دوران رہزنوں نے ان کا سارا اسباب لوٹ لیا جس میں ان کا ذخیرۂ سخن بھی تھا جو پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔حیدرآباد میں بحری دو سال ہی رہنے پائے تھے کہ اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر بھی قبضہ کرلیا۔زوال گولکنڈہ کے بعد وہ مدراس کی طرف نکل پڑے۔(افسر صدیقی‘ مخطوطات انجمن جلد چہارم صفحہ 41) 1100ھ میں بحری اپنے پیرومرشد کے آستانے میں گوشہ گیر ہو گئے۔(سخاوت مرزا‘ مقدمہ ’’من لگن‘‘ صفحہ 23) قاضی محمود بحری نے طویل عمر پائی 1130ھ میں ان کا انتقال ہوا۔بحری کی تین اہم تصانیف ہیں (1) مثنوی من لگن (2) بنگاب نامہ (3) دیوان غزلیات۔

’’من لگن‘‘ بحری کی سب سے مقبول مثنوی ہے۔اس کا موضوع عرفان وتصوف ہے۔یہ مثنوی انہوں نے 1112ھ میں تصنیف کی۔من لگن اٹھارہ سو سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں (45) ابواب ہیں۔عنوانات فارسی میں ہیں۔ابتدا میں حمد ونعت‘ بیان معراج‘ منقبت خلفائے

اربعہ اور منقبت پیرو مرشد کے بعد اورنگ زیب کی توصیف ہے۔ پھر سبب تصنیف اور شکایت روزگار کے ابواب ہیں۔ مثنوی میں بحری نے طلب حق' فضیلت انسان' کیفیت موجودات' وجود ملکوتی' منزل ذات' روح مطلق' اسرار دل والنفس' نبوت وولایت سرود وسماع اور عشق وغیرہ جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ من لگن کی زبان نہایت ادق اور مضامین نہایت دقیق ہیں۔ مریدوں کے اصرار پر بحری نے اس کے منتخب مضامین کا فارسی میں ترجمہ کیا جس کا نام ''عروس عرفاں'' ہے۔ 1955ء میں سخاوت مرزا نے مثنوی من لگن کو مرتب کر کے شائع کیا۔

''بنگاب نامہ'' بحری کی ایک اور تصنیف ہے جس میں انہوں نے تصوف وطریقت کے مسائل کے اظہار کے لیے بھنگ سے کنایہ کیا ہے۔ یہ نظم بارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ جنھیں جام کا عنوان دیا گیا ہے ہر جام میں بارہ اشعار ہیں۔ بحری کا دیوان (113) غزلیات پر مشتمل ہے۔ بحری کی غزلیات میں مجازی رنگ غالب ہے۔ ایسے اشعار بہت کم ہیں جن میں عشق حقیقی کی واردات بیان کی گئی ہو۔ بحری کا محبوب ارضی مخلوق ہے۔ ان کی غزلوں میں معشوق کے رخسار کی سرخی' چہرے کی آب وتاب' لبوں کی مٹھاس' جذبات کی آنچ اور جسم کی مہک صاف محسوس ہوتی ہے۔ 1939ء میں ڈاکٹر حفیظ سید نے کلیات بحری مرتب کر کے شائع کروایا جس میں غزلوں کے علاوہ بنگاب نامہ بھی شامل ہے۔

عادل شاہی دور' دکنی شعروادب کا سنہری دور تھا۔ اس عہد میں بے شمار شعرا و ادبا پیدا ہوئے لیکن ان میں سے بہت کم کی تصانیف محفوظ ہیں۔ گزشتہ صفحات میں عادل شاہی دور کے اہم شعرا و ادبا کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اس دور کے دیگر نسبتاً کم اہم شعرا کے نام اور ان کے کارنامے اس طرح ہیں۔

امینؔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کا شاعر تھا۔ 1048ھ میں اس نے ایک مثنوی ''بہرام وبانو ے حسن'' لکھنا شروع کیا لیکن مکمل نہ کر سکا اس کے انتقال کے بعد ایک دوسرے شاعر دولتؔ نے 1050ھ میں اس ادھوری مثنوی کو مکمل کیا۔

شاہ داول نے جو برہان الدین جانم کے خلیفہ تھے'' کشف الوجود''۔ ''کشف الانوار''۔ ''چہار شہادت'' اور ''ناری نامہ'' جیسی عارفانہ مثنویاں لکھیں جانم ہی کے ایک اور خلیفہ شیخ محمود خوش دہاں سے ایک نثری رسالے کے علاوہ کئی مثنویاں جیسے ''وجودیہ''، ''علم الحیات''، ''انصاف الحق''، ''مقصود محمود'' اور ''نکتہ راز و نیاز'' وغیرہ یادگار ہیں۔ علی رحتمی اور ایاغی علی عادل شاہ ثانی کے دور کے مذہبی شعرا ہیں۔ اول الذکر نے ''پند دلبند'' کے نام سے اور آخر الذکر نے نجات نامہ (1080ء) کے نام سے مثنویاں لکھی ہیں۔ جنھیں ڈاکٹر محمد علی اثر نے مرتب کر کے اپنی کتاب ''دکنی کی تین مثنویاں'' میں شائع کر دیا ہے۔ اسی دور کے ایک صوفی شاعر قادر لنگا کوتال تھے جو امین الدین اعلیٰ کے مرید وخلیفہ تھے انہوں نے ایک مثنوی ''معجزہ خاتون جنت'' کے علاوہ متعدد غزلیں اور حقیقت گیت لکھے۔

6.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ عادل شاہی دور دکن کی تاریخ میں ایک خاص امتیاز اور اہمیت کا حامل ہے۔ 895ھ سے 1098ھ تک اس خاندان کے نو حکمرانوں نے مملکت بیجاپور میں نہایت شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔

☆ عادل شاہی حکمران علم وادب اور فنون لطیفہ کے نہایت شائق تھے۔ انہوں نے علما' فضلا' شعرا' ادبا اور دیگر اہل ہنر کی بڑی قدر دانی اور سرپرستی کی۔ بیجاپور میں ان کی بنوائی ہوئی کئی عمارتیں' محلات' فصیل' شہر برج' مسجدیں' مقبرے اور کنویں وغیرہ آج بھی محفوظ ہیں اور

عادل شاہوں کی عظمت رفتہ کی یادگار ہیں۔

☆ عادل شاہی حکمران نہایت منصف مزاج اور رعایا پرور واقع ہوئے تھے۔انہوں نے بیجاپور میں ایک گنگا جمنی کلچر کو فروغ دیا۔عادل شاہی حکومت میں دکنی زبان اور شعروادب کو بے مثال ترقی ہوئی۔بیجاپور میں شاعری کی تمام اصناف پر توجہ کی گئی لیکن مثنوی اس دور کی سب سے مقبول صنف تھی۔

☆ میراں جی شمس العشاق اور برہان الدین جانم کے ہاں بیشتر نظمیں ہندوی وزن میں پائی جاتی ہیں بعد میں فارسی اصناف اور بحروں کا چلن شروع ہوا۔عادل شاہی شعرا نے طبع زاد مثنویاں بھی لکھیں اور فارسی سے ترجمہ بھی کیا۔

☆ طبع زاد مثنویوں میں ''چندر بدن و مہیار'' (مقیمی) ''قصہ بے نظیر'' (صنعتی) ''میزبانی نامہ'' (حسن شوقی) ''گلشن عشق'' (نصرتی) اور ''یوسف زلیخا'' (ہاشمی) اہم ہیں۔فارسی سے ترجمہ کی ہوئی مثنویوں میں ''جنت سنگھار'' (ملک خوشنود) ''خاورنامہ'' (رستمی) اور ''بہرام و بانوے حسن'' (دولت وامین) اہم ہیں۔

☆ موضوعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دور میں مذہبی،صوفیانہ،رزمیہ،بزمیہ اور تاریخی ہر قسم کی مثنویاں لکھی گئیں۔میراں جی شمس العشاق کی نظمیں ''خوش نامہ''۔''خوش نغز''۔''شہادت التحقیق'' جانم کی نظمیں ''وصیت الہادی''۔''منفعت الایمان''۔''بشارت الذکر'' اور مثنوی ''ارشادنامہ'' شاہ امین الدین اعلیٰ کی مثنویاں ''رموز السالکین''۔''قربیہ'' اور ''محبّ نامہ''،معظم کی مثنویاں ''شجرۃ الاتقیا''،''گلزار چشت''،''ساقی نامہ''۔''مفتاح الاسرار'' اور بحری کی مثنوی ''من لگن''،صوفیانہ مثنویاں ہیں جن میں تصوف وطریقت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

☆ رزمیہ اور تاریخی مثنویوں میں ''ابراہیم نامہ'' (عبدل) ''فتح نامہ نظام شاہ'' و ''میزبانی نامہ'' (حسن شوقی) ''خاورنامہ'' (رستمی) ''علی نامہ''۔''تاریخ اسکندری'' (نصرتی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔عشقیہ مثنویوں میں ''چندر بدن و مہیار''۔''گلشن عشق'' اور ''یوسف زلیخا'' اہم ہیں۔مثنویوں سے قطع نظر دیگر اصناف میں نصرتی اور علی عادل شاہ ثانی شاہی کے قصیدے فنی اعتبار سے اہم ہیں۔

☆ حسن شوقی،نصرتی اور شاہی اور بحری کی غزلیں تغزل کی تمام خصوصیات کی حامل ہیں۔اسی دور میں مرزا دکنی کے سب سے بڑے مرثیہ نگار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔مرزا کے علاوہ تقریباً تمام عادل شاہی شعرا نے بھی مرثیے لکھے ہیں۔

☆ نصرتی،شاہی اور بعض دیگر شعرا نے رباعی میں بھی طبع آزمائی کی۔ابتدائی دور میں ہندوی گیتوں کا بھی رواج رہا۔ابراہیم عادل شاہ ثانی کی ''کتاب نورس''،موسیقی کے راگوں پر مبنی گیتوں پر مشتمل ہے۔

☆ علی عادل شاہ ثانی شاہی کے کلیات میں بھی ایسے گیت ملتے ہیں۔دیگر متروک اصناف میں برہنی،حقیقت گیت،سہیلا اور سی حرفی صوفی شعرا میں مقبول رہیں۔ان کے نمونے جانم،اعلیٰ،شاہی،قادر اور معظم کے ہاں ملتے ہیں۔

☆ عادل شاہی دور میں نثر پر بھی توجہ کی گئی۔دکنی میں نثر کا پہلا رسالہ ''کلمۃ الحقائق'' برہان الدین جانم نے اسی دور میں لکھا۔کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بعض اور نثری رسائل بھی لکھے۔نثر کی روایت کو آگے بڑھانے میں جانم کے خلیفہ شیخ محمود خوش دہاں اور امین الدین اعلیٰ کے نثری رسائل نے بھی اہم خدمت انجام دی۔

6.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ارباب کمال	:	کمال رکھنے والے
فروغ	:	روشنی، رونق
تاخت	:	حملہ، غارت
جلیل القدر	:	نہایت معظم، بڑی شان والا
مرفہ الحال	:	خوش حال، آسودہ
حصار	:	فصیل
گوہر شب چراغ	:	ایک قسم کا لعل جو رات کو چراغ کی طرح چمکتا ہے
ہم مشرب	:	ایک ہی مسلک کا، ایک ہی طریقے کا
ملحد	:	خدا کو نہ ماننے والا
انتساب	:	منسوب کرنا
دبیر	:	منشی، خطاط
اکتساب	:	کمانا، زاتی محنت سے حاصل کرنا
انحطاط	:	کم ہونا، گھٹاؤ
حربی	:	جنگ سے متعلق
بدرجہ اتم	:	مکمل درجے کا
غنائیت	:	موسیقت
تزک واحتشام	:	شان وشوکت
ناپید	:	معدوم، غائب
قرائن	:	قرینہ کی جمع (اندازہ، صورت)

6.9 نمونہ امتحانی سوالات

6.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مشہور تصنیف کون سی ہے؟

2۔ نصرتی کی پہلی رزمیہ مثنوی کا نام کیا ہے؟

3۔ کون سی مثنوی حسن شوقی کی تصنیف ہے؟

4۔ فارسی خاورنامہ کا دکنی میں ترجمہ کس نے کیا؟

5۔ مثنوی یوسف زلیخا کے مصنف کون ہیں؟

6۔ ریختی کسے کہتے ہیں؟

7۔ نصرتی کا پورا نام کیا تھا؟

8۔ بیجاپور کا مشہور مرثیہ گو شاعر کون ہے؟

9۔ مثنوی ''یوسف زلیخا'' کا سنہ تصنیف کیا ہے؟

10۔ عادل شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

6.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ عادل شاہی دور کے سماجی اور تہذیبی پس منظر کے بارے میں لکھیے۔

2۔ عادل شاہی دور کی کسی ایک مثنوی کا جائزہ لیجیے۔

3۔ ہاشمی بیجاپوری کے بارے میں لکھیے۔

4۔ سب رس پر ایک نوٹ لکھیے۔

5۔ مرزا کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ بیان کیجیے۔

6.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نصرتی کی ادبی خدمات تفصیل سے بیان کیجیے۔

2۔ عادل شاہی دور کی مثنویوں کا جائزہ لیجیے۔

3۔ ذیل کے کسی دو شاعروں پر مختصر نوٹ لکھیے۔

1۔حسن شوقی 2۔شاہی 3۔مرزا 4۔ہاشمی

6.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
2۔	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی
3۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
4۔	تاریخ ادب اردو 1700ء تک (جلد دوم، سوم)	پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین
5۔	دکنی کی تین مثنویاں	پروفیسر محمد علی اثر

اکائی 7: مغل دور میں دکنی ادب: ولی اور معاصرین ولی

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 مغل دور میں دکنی شعروادب

7.2.1 ولی اورنگ آبادی

7.2.2 قاضی محمود بحری

7.2.3 سید محمد فراقی

7.2.4 داؤد اورنگ آبادی

7.2.5 سراج اورنگ آبادی

7.3 دیگر شعرا

7.3.1 شاہ قاسم اورنگ آبادی

7.3.2 عاجز اورنگ آبادی

7.3.3 وجدی کرنولی

7.4 اکتسابی نتائج

7.5 کلیدی الفاظ

7.6 نمونہ امتحانی سوالات

7.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

7.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

7.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

مغل فرماں روا اورنگ زیب عالمگیر نے بیجا پور اور گولکنڈہ کو علی الترتیب 1096ھ/ 1686ء اور 1097ھ/ 1687ء میں فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اورنگ زیب کی فتحِ دکن اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک اہم واقعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ قطب شاہی اور

عادل شاہی حکمرانوں کی سرپرستی میں دکن میں، اُردو زبان وادب نے ترقی کے جو مراحل تیز رفتاری سے طے کیے تھے ان دو عظیم الشان سلطنتوں کی تباہی نے اس کے نشو ونما اور ارتقا میں ایک بڑا رخنہ ڈال دیا۔

1686-87ء کے واقعات اُردو زبان وادب کے فروغ کے سلسلے میں بڑے تباہ کن نتائج کے حامل ہیں۔ بہمنی عہد اور پھر اس کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار میں اُردو زبان ترقی کر کے ایک علمی اور ادبی زبان کے درجے تک پہنچ چکی تھی۔ خصوصاً سترہویں صدی عیسوی میں جو ادب گولکنڈہ اور بیجاپور میں تخلیق پایا وہ شعر وادب کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ معیارات کا حامل ہے۔ لیکن ان دو سلطنتوں کا زوال ایک ایسے انقلاب کی صورت میں رونما ہوا جس نے سرزمین دکن کی تہذیب وتمدن اور علم وفن کی بنیادیں ہلا دیں۔ 1687ء کے بعد دکن کے شاعروں اور ادیبوں کا قدر دان کوئی نہ تھا۔ مغل سلاطین یا اہل شمال دکنی زبان سے بڑی حد تک نا آشنا تھے۔ دوسری طرف وہ سلاطین یا امراجنھوں نے ایک طویل عرصے تک دکن کے فن کاروں کی سرپرستی اور قدر افزائی کی تھی خود بے سہارا ہو گئے تھے۔

جہاں تک بیجاپور کا تعلق ہے، یہ شہر جو کبھی جنوبی ہند کا ایک عظیم ثقافتی اور تمدنی مرکز تھا۔ 1686ء کے بعد ہمیشہ کے لیے گوشۂ گم نامی میں چلا گیا اور یہاں کے شعرا وادبا ایک ایک کر کے دور دراز کے مقامات جیسے کڑپہ، کرنول، ویلور، آرکاٹ اور دوسرے علاقوں کو منتقل ہو گئے۔ لیکن گولکنڈہ یا حیدرآباد کی صورتِ حال اس سے مختلف تھی۔ 1687ء میں گولکنڈہ کو فتح کرنے کے بعد عالمگیر نے اورنگ آباد کو اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ اس لیے شعری، تمدنی اور ادبی ذوق کی وہ چنگاریاں جو خاکِ دکن میں موجود تھیں، ان میں سے کچھ تو شعلہ بننے کی خاطر اورنگ آباد پہنچ گئیں اور کچھ اِدھر اُدھر بکھری رہیں۔ اس پُر آشوب زمانے میں بھی سرزمین دکن، شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کو برابر پیدا کرتی رہی۔ قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین نے اُردو شعر وادب کے ارتقا کا پہیہ اس قدر تیز رفتاری سے گھمایا تھا کہ 1687ء کے بعد بھی اس کی رفتار کو بہ آسانی روکا نہ جاسکا۔ دکنی شاعری کی عظیم روایات اور رجحانات فیروزؔ، محمودؔ، خیالیؔ، محمد قلیؔ، وجہیؔ، غواصیؔ، ابن نشاطیؔ، مقیمیؔ، حسنؔ شوقی، علی عادل شاہ شاہیؔ، نصرتیؔ، اور ہاشمی کی وساطت سے ولیؔ اور سراجؔ تک پہنچتے ہیں۔ ان روایات کے کچھ کچھ اثرات نہ صرف ولیؔ اور سراجؔ کے معاصرین میں موجود ہیں بلکہ ان کی بازگشت شمالی ہند کے دورِ اول کے شعرا کے کلام میں بھی سنائی دیتی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی فتحِ دکن نے سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر سے ایک طرف شمال اور جنوب کو گھر آنگن بنا دیا تو دوسری طرف لسانی اور ادبی نقطۂ نظر سے ولیؔ اور اس کے معاصرین نے تدریجی طور پر فارسی زبان واسالیب کے اثرات قبول کیے اور اس طرح اُردو شعر وادب، گولکنڈہ و بیجاپور کے حدود سے نکل کر پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ولیؔ کے مقلدین اور مداح صرف گجرات و دکن ہی میں نہیں بلکہ آرکاٹ، ویلور اور کڑپہ کرنول میں بھی نظر آتے ہیں۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ مغل دور کے دکنی شعر وادب کو بیان کرسکیں۔

☆ مغل دور کے اہم دکنی شعرا وادبا سے واقف ہوسکیں۔

☆ اس عہد کے دیگر شعرا وادبا کے متعلق معلومات فراہم کرسکیں۔

7.2 مغل دور میں دکنی شعروادب

7.2.1 وؔلی اورنگ آبادی:

ولی محمد وؔلی، دکنی اُردو کا ایک قدآور اور باکمال سخنور ہے۔ اس کے مقامِ پیدائش کے بارے میں محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شاعر نے آنے والے زمانے میں اُردو شعروسخن کے دھارے کو موڑنے میں جو عظیم رول انجام دیا اس کی وجہ سے اُردو زبان وادب کے بعض محققین نے اس کو اپنے مخصوص صوبوں سے منسوب کرنے کی کوشش کی۔ ولی کے بچپن کے واقعاتِ حیات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ لڑکپن اور نوجوانی کے زمانے میں اس نے کچھ عرصہ گجرات اور خاص طور پر احمد آباد میں قیام کیا تھا۔ اس واقعے کا ذکر اس کے کلام میں ملتا ہے۔ شہر سورت کی تعریف میں ایک مثنوی بھی وؔلی کے دیوان میں موجود ہے۔ احمد آباد اور شہر سورت کے حوالوں کی وجہ سے گجرات کے بعض اہل علم نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ وؔلی کا وطن گجرات ہے اور نوجوانی کے زمانے میں وہ کسی وقت اورنگ آباد آئے اور یہیں بس گئے۔ اس کے برخلاف زمانۂ قدیم کے مورخین، محققین اور تذکرہ نگاروں سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی تک سبھی اس امر پر متفق ہیں کہ وؔلی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن اسی شہر میں گزرا۔ اگرچہ نوجوانی کے زمانے میں انہوں نے گجرات کا سفر کیا اور کچھ عرصے تک شاہ وجیہ الدین گجراتی کی خانقاہ میں قیام ضرور کیا۔

وؔلی کے مقامِ پیدائش کے سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ ''تاریخ احمدی'' (مصنفہ مٹھن لال 1737ء) اور ''تحفۃ الکرام''، احمد آباد کی گجرات کی اہم تواریخ ہیں لیکن ان میں وؔلی کا نام نہیں ملتا۔ وؔلی ایک جہاں گرد شاعر تھا اس کے شوق سیاحت کی شہادت کم وبیش تمام تذکرے دیتے ہیں۔ اس نے نہ صرف سید ابوالمعالی کی معیت میں دہلی کا سفر کیا تھا بلکہ جنوبی ہند کے کئی شہروں کی بھی سیاحت کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے حج بھی کیا اور زیارتِ مدینہ منورہ کی سعادت بھی حاصل کی۔ (وؔلی از نورالحسن ہاشمی۔ صفحہ 13)

احسن مارہروی نے لکھا ہے کہ ولی 1079ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ مولوی عبدالحق نے کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے ''دیوان وؔلی'' کے ایک مخطوطے میں درج قطعۂ تاریخ کو بنیاد بنا کر ولی کی تاریخ وفات 1119ھ/ 1707ء بتائی تھی اور ایک عرصے تک اسے مستند سمجھا جاتا رہا۔ حال ہی میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مولوی صاحب کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے 1133ھ/ 1720ء تک ولی کے بقید حیات رہنے اور 1138ھ/ 1725ء سے پہلے کسی وقت وفات پانے کی اطلاع دی ہے۔ (تاریخِ ادب اُردو (جلد اول) ص 557)

وؔلی کی شاعری کی فضا بنیادی طور پر دکنی شاعری کی فضا ہے اس نے نہ صرف دکنی شاعری کی روایت اور رجحانات کی پاسداری کی ہے بلکہ دکنی کے عظیم المرتبت شاعروں سے استفادہ کرتے ہوئے ان زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں جن میں محمد قلی، غواصؔی، حسن شوقؔی، نصرتؔی، شاہؔی، شاہ سلطاںؔ اور دوسرے شاعروں نے دادِ سخن دی ہے۔ چند شعر دیکھیے:

محمد قلی:	خبر لیا یا ہے ہد ہد میرے تئیں اس یار جانی کا	خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں راز نہانی کا
وؔلی:	الٰہی رکھ مجھے تو خاک پا اہلِ معانی کا	کہ کھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا
غواصؔی:	عاشق ہے جن تج لال کا اس مال ودھن سوں کیا غرض	ہے کام جس کوں روح سوں اس کوں بدن سوں کیا غرض
وؔلی:	تجھ زلف کے بیتاب کوں مشک ختن سوں کیا غرض	تجھ لعل کے مشتاق کوں کانِ یمن سوں کیا غرض
شاہؔی:	ساری رین تیرا مدن مج طبع میں بھر پور ہے	تج صبح مکھ کے سامنے دیپک سدا مخمور ہے

ولیؔ: تشنہ لب کوں تشنگی مئے کی نہیں ناسور ہے پنبۂ مینا اسے جیوں مرہم کافور ہے

شاہ سلطاںؔ: صد سال، وصالِ حق بن جیونا سو جیوں مگس ہے یک دم خدا تھے ہل مل تل جیونا سو بس ہے

ولیؔ: ہر دل ربا کوں ہرگز دیتا نہیں ہوں دل میں دل بستگی کوں میری وہ بے مثال بس ہے

قدیم دکنی شعرا کی غزلوں پر غزلیں کہہ کر ولیؔ نے ان سے نہ صرف اثر پذیری کا ثبوت دیا ہے بلکہ دکنی شاعری کی روایات اور رجحانات کا احترام بھی کیا ہے۔ ولیؔ کے ابتدائی دور کے کلام میں دکنی شاعری کے گہرے اثرات ہیں۔ اس کے اس دور کے کلام کو محمد قلیؔ، غواصیؔ، شاہیؔ، حسن شوقیؔ، شاہ سلطاںؔ کے کلام کے ساتھ رکھا جائے تو ولیؔ کی غزلوں کو دکنی کے دوسرے شعرا کی غزلوں سے الگ کرنا دشوار ہوگا۔ اس قبیل کے چند شعر دیکھیے:

سجن ہے سانولا سج کا سجیلا کٹیلا ہور ہٹیلا لٹ پٹا ہے

ترا قد یو رشکِ قیامت اچھو قیامت تلک یو سلامت اچھو

تجھ در کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

ولیؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیت اظہار بیان کی سادگی اور حقیقت نگاری کا رجحان ہے۔ اس کی غزلوں میں ہندوستانی تہذیب کی روح رچ بس گئی ہے۔ تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں کے علاوہ اس کے تخیل پر بھی ہندوستانیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس نے اپنے کلام میں نہ صرف ہندوستانی موسموں، پھلوں، باغوں، پرندوں، جانوروں، دریاؤں، عیدوں، تہواروں وغیرہ کا جا بجا ذکر کیا ہے بلکہ ہندوستانی ذوق کے تقاضوں کا احترام بھی ملحوظ رکھا ہے۔ چند شعر دیکھیے۔

کوچۂ یار عین کاسی ہے جو گئی دل وہاں کا باسی ہے

اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال ہندوے ہردوار باسی ہے

زلف تیری ہے موج جمنا کی تل نزک اس کے جیوں سنیاسی ہے

گرچہ لچھمن ترا ہے رام ولے اے سجن تو کسی کا رام نہیں

جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

قائمؔ چاند پوری کے بیان کے مطابق ولی نے 1112ھ/1700ء میں شمالی ہند کا سفر کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شمالی ہند میں فارسی کا سکہ چل رہا تھا۔ حکومت اور سلطنت کی زبان فارسی تھی چوں کہ حکمرانوں کا رجحان فارسی کی طرف زیادہ تھا اور فارسی ہی کی سرپرستی اور قدر و منزلت کی جاتی تھی اس لیے شاعروں اور ادیبوں کا فارسی کی طرف جھکاؤ ایک فطری بات تھی۔ ولیؔ کے سفرِ دہلی سے پہلے بھی اگرچہ بعض شاعروں نے اُردو میں شعر گوئی کی کوشش کی تھی لیکن بنیادی طور پر ان میں سے بیشتر حضرات فارسی ہی کے شاعر تھے جو صرف ذائقہ بدلنے کے لیے اُردو میں کبھی کبھار شعر موزوں کر لیا کرتے تھے۔ شمالی ہند کے فارسی زدہ ماحول میں جب ولیؔ نے اپنی اُردو غزلیں سنائیں تو اہل شمال کو اس بات کا احساس ہوا کہ اُردو زبان میں (جسے وہ ایک کم مایہ زبان سمجھتے تھے) اتنی گہرائی، گیرائی اور قوت اظہار موجود ہے کہ اس میں ادب بھی تخلیق کیا جا سکتا ہے۔

ولیؔ ایک طرف دکنی زبان کی عظیم شعری روایات کا علمبردار ہے تو دوسری طرف اس کے کلام میں سفرِ دہلی کے اثرات بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ وہ اُردو شاعری کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ایک طرف اُردوئے قدیم کی عظیم شاہراہ اختتام کو پہنچتی ہے تو دوسری طرف شمالی ہند میں

اُردو شاعری کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

قیام دہلی کے زمانے میں ولی کی ملاقات اپنے زمانے کے مشہور عالم اور شاعر شیخ سعد اللہ گلشن (متوفی 1141ھ/1728ء) سے ہوئی۔ شاہ گلشن نے ولؔی کی توجہ فارسی کے موضوعات شعر اور اسالیب کی طرف مبذول کرائی۔ اور انھیں اپنے کلام کو فارسی شاعری کی روایات کے سرچشمے سے سیراب کرنے کا مشورہ دیا۔ چناں چہ سفر دہلی اور شاہ گلشن سے ملاقات کا نقش ولؔی کے تخلیقی شعور پر دھیرے دھیرے گہرا ہوتا گیا اور بقول مصحفی جب 1132ھ/1719ء میں ان کا دیوان دلی پہنچا تو شمالی ہند کی فضائیں ولؔی کے نغموں سے گونجنے لگیں اور ان کے شعر بچے بچے کی زبان پر جاری ہو گئے۔

ولؔی' زبان کا رمز شناس اور اصلاح زبان کا بہت بڑا محرک تھا۔ اس نے فارسی شاعری کے موضوعات و مضامین' تشبیہات و استعارات' روزمرہ و محاورے' تراکیب و ضرب الامثال سے دل کھول کر استفادہ کیا۔ فارسی کے بیسیوں اشعار کا بڑی خوبصورتی اور فنی مہارت سے اُردو میں ترجمہ کیا اور اُردو لفظیات کے خزانے کو وسعت بخشی۔ چند تراکیب دیکھیے "شعلۂ آواز"' دیدۂ حیراں"' "مسندِ گل" حسن شور انگیز"' "شعاعِ آفتابی"' "رشک ماہِ کنعانی"' "خوبی اعجاز حسن"' "سلطنتِ ملکِ قناعت"' "مطربِ نغمہ ساز" وغیرہ۔

7.2.2 قاضی محمود بحری:

بحرؔی' ولی دکنی کے بزرگ ہم عصر شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا نام اور لقب سید محمود تھا اور وہ گوگی (تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ) کے متوطن تھے۔ ان کے والد کا نام سید بحر الدین تھا اور لقب قاضی دریا تھا۔ ان کا خانوادہ سبز پوش قادری کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ بحری 1022ھ میں پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے 1130ھ میں وفات پائی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 108 سال تھی۔ قاضی محمود بحری کو قادریہ اور چشتیہ دونوں سلاسل میں بیعت حاصل تھی۔ قادریہ سلسلے میں وہ شاہ محمد باقر کے ارادت مند اور مرید تھے جن کی مدح میں انہوں نے اپنی مثنوی "من لگن" میں ایک باب مختص کیا ہے۔ چشتیہ سلسلے میں وہ اپنے والد سید بحر الدین سے ارادت و اجازت رکھتے تھے جنھیں خانوادہ شاہ برہان الدین جانم میں بیعت حاصل تھی۔

بحرؔی ایک پُر گو شاعر تھے۔ ان کی قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ 1097ھ 1687ء تک جب کہ ان کی عمر 75 سال تھی اُردو اور فارسی میں پچاس ہزار اشعار کہہ چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ وہ گوگی سے ترک وطن کر کے بیجاپور میں مقیم تھے۔ اورنگ زیب کی فوجوں نے جب بیجاپور پر قبضہ کیا تو بحری نے 1097ھ/1687ء میں حیدرآباد کا رخ کیا۔ دوران سفر ڈاکوؤں نے نہ صرف ان کا مال و اسباب لوٹ لیا بلکہ سرمایہ سخن بھی ضائع کر دیا۔ بحرؔی نے حیدرآباد میں تقریباً دو سال تک قیام کیا اور جب حیدرآباد بھی اورنگ زیب عالمگیر کی قلمرو میں شامل ہو گیا تو وہاں سے وہ مدراس منتقل ہو گئے اور خود ان کے بیان کے مطابق 1100ھ میں وہ اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ محمد باقر کے آستانے میں گوشہ گیر ہو گئے۔

(من لگن از سخاوت مرزا۔ صفحہ 32)

بحرؔی نے ایک دیوان کے علاوہ دو مثنویاں "بنگاب نامہ" اور "من لگن" اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی چند منظومات کا پتہ چلتا ہے۔ جنھیں ڈاکٹر حفیظ سید نے مرتب کر کے "کلیات بحری" میں یکجا کر دیا ہے۔ جہاں تک بحری کے دیوان کا تعلق ہے اس میں ایک سو تیرہ (113) غزلیں شامل ہیں۔ بحری کی مثنویوں میں متصوفانہ رنگ کا غلبہ ہے۔ جن کے مطالعے سے وہ ایک عارف کامل کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ان کی غزلوں میں عشق مجازی کی کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کے خیال میں مکتبِ مجازی میں "عشق" کے آگے زانوے

ادب تہہ کرنے سے عشق حقیقی کی راہیں آسان ہوجاتی ہیں۔

منجہ اس مکتب مجازی میں جو عشق استاد نہ ہوتا　　　تو میرے دل سوں کثرت کا سبق برباد نہ ہوتا

بحرؔیا سر پاوں کیوں کرتا حقیقت کا سو بول　　　گرنا کھڑتا سر پہ تیرے یو مجازی مار کا [معرکہ]

بحرؔی کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جن میں روحانی کیفیات کی عکاسی یا عشق حقیقی کا بیان ہوا ہے۔ان کی بیشتر غزلوں میں محبوب کے حسن و جمال، خدوخال، رفتار وگفتار، چشم وابرو اور لب ورخسار کی تعریف وتوصیف ملتی ہے۔

دیکھ تیرے او رخ رنگیلے لال　　　پھول ہوتے ہیں پھول کھل خوش حال

جے مکھ ہے آفتاب اجالا سو او تیرا　　　مستک پُنم کے چاند سوں ہالا سو او تیرا

یک زلف ہور ہزار کنڈالاں سوہے تجھے　　　یک چک ہوراس میں لاک ہے چالا سو او تیرا

جانے نہ دیا دھن لک اس ہٹ نہ کئیں تو کیا کئیں　　　ایسے رقیب اوپر پھٹ پھٹ نہ کئیں تو کیا کئیں

آخر الذکر شعر کی زمین میں وؔلی نے بھی غزل کہی ہے:

دلبر ادھر کوں تیرے کوثر نہ کوں تو کیا کوں　　　میٹھے ترے لباں کوں شکر نہ کوں تو کیا کوں

ڈاکٹر جمیل جالبی بحرؔی کی غزل گوئی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بحرؔی کی غزلیں اسی روایت کی ترجمانی کررہی ہیں۔جس پر شروع میں وؔلی چلے تھے۔اگر بحری کی غزلوں کو وؔلی کے ابتدائی دور کے کلام میں ملا دیا جائے تو پہچاننا مشکل ہوگا۔اسی لیے بحرؔی کی چند غزلیں وؔلی سے بھی منسوب ہوگئی ہیں۔(تاریخ ادب اُردو۔جلد اول صفحہ 522)

مثنوی ''بنگاب نامہ'' 144 ابیات پر مشتمل ہے۔جسے بحری نے 12 بند میں تقسیم کیا ہے۔ہر بند میں 12 ابیات ہیں جسے شاعر نے جام کا عنوان دیا ہے اور ہر جام میں بنگ (بھنگ) یعنی شراب کی تعریف اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس سے تصوف ومعرفت کے اسرار کی توضیح وتشریح ہوتی ہے۔

''من لگن'' تصوف وعرفان کے موضوع پر بحری کی سب سے مشہور مثنوی ہے۔یہ مثنوی 1112ھ کی تصنیف ہے۔1830 اشعار اور 45 ابواب پر مشتمل اس ضخیم مثنوی کو مولوی سخاوت مرزا نے 1955ء میں مرتب کرکے شائع کردیا ہے۔من لگن کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے اور پھراس کے بعد کے ابواب میں توحید باری۔نعت رسول مقبولﷺ۔بیان معراج۔مدح خلفائے اربعہ۔منقبت پیرومرشد (شیخ محمد باقر)۔توصیف بادشاہ دین پناہ اورنگ زیب عالم گیر۔سبب تصنیف اور شکایت روزگار کا بیان ہوا ہے۔تمام ابواب کو بحری نے فارسی عنوانات سے آراستہ کیا ہے۔آخری باب کا عنوان ''خاتمہ'' ہے۔دیگر 35 درمیانی ابواب میں مختلف متصوفانہ مسائل جیسے طلب حق۔فضیلت انسان۔کیفیت موجودات۔روح مطلق۔اسرار دل ونفس۔اسرار بےخودی۔سرود وسماع اور عشق وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔بحری نے سلوک ومعرفت کے مختلف مسائل کی توضیح وتشریح کے سلسلے میں تشبیہ واستعارہ اور تمثیل وحکایت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔

مثنوی من لگن کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے مشکل اور دقیق الفاظ کی ایک شرح سید شاہ اسمٰعیل قادری نے نواب شہامت جاہ بہادر کی فرمائش پر ''ارت من لگن'' کے عنوان سے لکھی تھی۔خود بحری نے بھی 1116ھ میں اپنے معتقدوں اور مریدوں کے اصرار

پر اس کے بعض اہم موضوعات کا فارسی زبان میں ترجمہ کر کے اس کا نام ''عروس العرفان'' رکھا۔

بحری کی زبان بنیادی طور پر بیجاپوری دکنی ہے لیکن انہوں نے اپنی زبان کو ''ہندی'' اور ''ہندوی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ:

''بحری دکن کے ان شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے اپنے سرپرست سلاطین قطبیہ و عادل شاہیہ کے زوال کے بعد بھی اپنے قدیم ذوقِ شعر و سخن کو جملہ لوازمات کے ساتھ عرصۂ دراز تک باقی رکھا۔'' (تذکرہ اُردو مخطوطات جلد اول صفحہ 56)

بحری کی غزلوں میں کہیں کہیں ولی کی تحریکِ اصلاح زبان کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔

7.2.3 سید محمد فراقی:

فراقی دکنی اُردو کے ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کی شہرت شمالی ہند تک پہنچ چکی تھی۔ چناں چہ شمالی ہند کے متعدد تذکروں جیسے ''تذکرہ شعرائے اُردو'' (میر حسن) ''مخزن نکات'' (قائم چاند پوری) ''مجموعہ نغز'' (قدرت اللہ قاسم) وغیرہ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ قائم نے اپنے تذکرے (مخزن نکات) میں ذکر کیا ہے کہ فراقی نے محمد یار خاں صوبہ دار دہلی کے زمانے (1108ھ۔1114ھ) میں دہلی کا سفر کیا تھا (مخزن نکات، صفحہ 7)۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن کے بعد فراقی نے کچھ عرصے تک اورنگ آباد میں قیام کیا اور پھر جنوبی ہند پہنچ کر ویلور میں سکونت اختیار کر لی۔ (دکن میں اُردو صفحہ 375) ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا بیان ہے کہ فراقی نے فقیر اللہ آزاد اور ولی کے ساتھ اورنگ آباد سے نکل کر سورت، احمد آباد اور دلّی کا سفر کیا۔ (تذکرہ اُردو مخطوطات، جلد چہارم، صفحہ 272)

ولی دکنی کے ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے فراقی کے ایک مصرع پر گرہ لگائی تھی۔

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وہ ظالم
کمر سوں کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے

ولی نے اپنے کلام میں جہاں اپنے متعدد بے تکلف احباب کا تذکرہ کیا ہے وہیں اپنے شاعرانہ مرتبے کا فراقی سے تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے:

ترے اشعار ایسے نئیں فراقی
کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں

موجودہ معلومات کی روشنی میں فراقی کی ایک ضخیم مثنوی ''مراۃ الحشر'' کے علاوہ اس کی دو نعتیں چند غزلیں اور بعض غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار دستیاب ہوئے ہیں۔ ''مراۃ الحشر'' تقریباً چار ہزار ابیات پر مشتمل ایک غیر مطبوعہ مثنوی ہے۔ جس کے مطالعے سے مثنوی کی تاریخ تصنیف، فراقی کے نام اور تخلص کے علاوہ اس کی تاریخ پیدائش پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

فراقی تخلص ہے میرا مدام ولے اصل سید محمد ہے نام
کیا قصد تاریخ جب بولنا یو اجمال تفصیل کر کھولنا
تو مجھ دل کیا اس وزا انتخاب یو دیکھو جو ہے بابرکت کتاب

1132ھ

چوں کہ فراقی نے یہ مثنوی 1132ھ میں بہ عمر 36 سال لکھی ہے اس لیے اس سے 1097ھ اس کی تاریخ پیدائش برآمد ہوتی ہے۔

''مراۃ الحشر'' میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے احوال قیامت بیان کیے گئے ہیں۔ یہ فراقی کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے اس نے فارسی ''آخرت نامہ'' کو دکنی اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس مثنوی میں جیسا کہ فراقی نے مختلف ابواب میں واضح کیا ہے۔ نزع کی کیفیت ''بیان اہل قبور''، ''یوم حشر''، ''قیامت کی علامتیں''۔ دجال اور یاجوج ماجوج کی فتنہ انگیزی اور حضرت مہدی اور حضرت عیسیٰ کا ظہور، پل صراط اور جزا و سزا کی تفصیل بیان کی ہے۔

اس مثنوی کے علاوہ فراؔقی کی چند غزلوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جن میں مدحت رسول کے علاوہ عشق و محبت، فلسفہ و تصوف، درویشی و عزلت نشینی اور قناعت پسندی کے مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ چند شعر دیکھیے۔

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا — محمدؐ کی گلی بھیتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا

فقیراں باوجود دست و پا بے دست و پا اچھنا — انوں سب کی نظر میں ان کی نظراں میں خدا اچھنا

میں جاں اچھوں مجھ دل کوں شوق اس گلبدن کا کھینچتا — بلبل کے دل کو دام بھا رشتہ چمن کا کھینچتا

مجے اے حسن کا ساقی لباں کا مئے پلاتا نئیں — ارے ظالم میں مرتا ہوں تجے کچ رحم آتا نئیں

فراؔقی کی زبان اور موضوعات شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''فراؔقی کی شاعری کی زبان ولی کے دور اول کی شاعری کی زبان سے مزاجاً قریب ہے۔ غزلوں میں دو قسم کے موضوعات ملتے ہیں۔ ایک تو عشقیہ جس میں جذبات عشق، خواہش وصل، ہجر کی تڑپ، محبوب کی ہر ہر ادا پر جان و دل سے فریفتہ ہونے کا اظہار ملتا ہے اور دوسرا ناصحانہ ہے جس میں قناعت پر زور، ہوس و طمع سے نفرت، دشمن کو معاف کر دینے کی تلقین، درویشی، نیکی اور عزلت نشینی کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔

(تاریخ ادب اُردو جلد اول۔ صفحہ 560)

7.2.4 داؤد اورنگ آبادی:

مرزا داؔؤد بیگ نام داود تخلص۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا سلیمان تھا۔ داؔؤد کے آباواجداد عہد عالمگیر میں بلخ سے اورنگ آباد آئے اور یہاں شاہی منصب سے معزز و مکرم ہوئے۔ داؔؤد کی تاریخ پیدائش پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ داؔؤد کو سراؔج کا مدمقابل سمجھا جاتا تھا۔ سراج سے ان کی شاعرانہ چشمک بھی رہی ہے اور داؔؤد نے اپنے کلام میں خود کو ''ولی ثانی'' کہا ہے۔ اس لحاظ سے وہ غالباً سراج (پیدائش 1124ھ) سے عمر میں بڑے ہوں گے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے اور فن شاعری میں انہوں نے کسی استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔

مجھ کو کچھ علم نہیں ہے وہ خدا آپ علیم
شعر کہنا مجھے داؔؤد خدا داد آیا

داؔؤد کے معاصرین میں یوں تو متعدد شعرا داد سخن دے رہے تھے لیکن سراج کے سوا وہ کسی اور کو اپنا مد مقابل نہیں سمجھتے تھے۔ اگر چہ داؔؤد شاعرانہ کمال کے نقطۂ نظر سے سراج کے مرتبے کو نہیں پہنچتے لیکن غالباً بلحاظ عمر اپنی بزرگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ سراج پر چوٹ کی ہے:

جب سوں روشن ہے مجھ سخن کا چراغ　　رشک ستیں سراج جلتا ہے

چرب زبانی نہ کر بزم سخن میں سراج　　تیغ سیں گل گیر کی ورنہ کٹے گا سراج

داؔؤدفن کارچوبی کے ماہر تھے۔اسی رعایت سے سراؔج نے بھی درج ذیل شعر میں ان پر چوٹ ہے۔

نہ بھول کسب قدیمی کو اپنے اے مرزا　　وگرنہ بچہ کہیں کارچوب ہووے گا

داؤد کا شاعرانہ کمال یہی ہے کہ انہوں نے کلام ولی سے وسیع پیانے پر استفادہ کیا ہے وہ کھلے دل سے ولی کی شاعری کے گن گاتے ہیں اور پیروی ولی کو باعث افتخار سمجھتے ہیں۔کئی اشعار میں انہوں نے خودکو''ولی ثانی''اور ولی کا مقلد کہا ہے:

علی کی ہے قسم سن شعر میرا　　کہے عالم ولؔی ثانی یہی ہے

بعد از ولی ہوئے ہیں کئی شاعراں ولیکن　　داؔؤد شعر تیرا مشہور ہے دکن میں

حق نے بعد از ولؔی مجھے داؤد　　صوبۂ شاعری بحال کیا

کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعرکوں سن کر　　تجھ طبع میں داؔؤد ولؔی کا اثر آیا

داؤد نے ولؔی کی زمین میں بے شمار غزلیں کہی ہیں اور بعض غزلوں میں ولؔی کے مصرعوں پر گرہیں بھی لگائیں ہیں۔

پڑھو ناصح انگے مصرع ولؔی کا　　نصیحت عاشقاں کوں کب روا ہے

ہوا معلوم مصرع سوں ولؔی کے　　پری رخسار سوں ملنا ہنر ہے

راست اے داؔؤد کہتا ہے ولؔی　　عشق میں صبر و رضا درکار ہے

داؔؤد کے دیوان کا بیشتر حصہ محبوب کے خدوخال،لب ورخسار،چشم وابرواور رفتاروگفتار کی تعریف وتوصیف پر محیط ہے۔یہی ان کی شاعری کے پسندیدہ موضوعات ہیں اور اسی میں ان کی شاعری کے جوہر کھلتے ہیں:

زلف تیری دامِ عالم گیر ہے　　مجہ دل وحشی کے تئیں زنجیر ہے

اے کماں ابرو تری ہر یک پلک　　مارنے عاشق کوں کاری تیر ہے

جس نے وہ گلبدن نہیں دیکھا　　اس نے سیر چمن نہیں دیکھا

خیال اس چشم کا ہے جب سیں دل میں　　سدا وحشت میں ہوں مانند آہو

داؔؤد نے صنعتِ ایہام میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کے دیوان کے آخر میں''فردیاتِ ایہام''کے عنوان سے 29 اشعار موجود ہیں۔

عالم میں معتبر ہے اکثر سخن اُسی کا　　مثل قلم جہاں میں جو دو زباں ہوا ہے

آباد کیوں نہ یاد علی میں رہوں سدا　　روز ازل سو دل ہے مرا مرتضیٰ نگر

ہے شباب و کباب و فصل بہار　　کوئی اس وقت جو پیا لادے

لیکن یہ داؔؤد کا خاص رنگ نہیں۔یہ محض اس دور کے رجحان کا اثر ہے۔داؔؤد کے یہاں ولی کے دور اول کی شاعری کی طرح دکنی رنگ بھی موجود ہے اور دور دوم کی شاعری کی طرح فارسی شاعری کے رجحانات سے اثر پذیری کے نتیجے میں ترکیب اور اضافتوں کی کثرت بھی۔داؔؤد کی چند

اضافتیں اور ترکیبیں دیکھیے۔

شوقِ بوے غنچۂ گل، آئینۂ دل، دیدۂ پرخوں، مثلِ صورتِ دیوار، سینۂ تحریر حباب، بوے غبارِ راہ، بادۂ گل رنگ، چہرۂ دل دار، خیال روے روشن یار، سایہ معشوقِ ہرجائی۔

فراقیؔ اور بحریؔ کے مقابلے میں داؤد کی زبان بہت صاف ہے تاہم اس کے کلام میں ولیؔ کے ابتدائی دور کی شاعری کی طرح جگہ جگہ قدیم دکنی کے بعض الفاظ جیسے سوں، کوں، سیتے، سیتی، منے، سجن، سریجن، پیو، موہن، تجہ لب، مجہ دل، نمن، انجھو، اچھنا، کاں، نیں، باج، انگے، یو، اپس وغیرہ نظر آتے ہیں جنھیں الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ بہ آسانی آج کی زبان کا روپ دیا جاسکتا ہے۔

7.2.5 سراجؔ اورنگ آبادی:

سید سراج الدین سراجؔ اورنگ آبادی (1128ھ/ 1715ء۔ 1177ھ/ 1763ء) اُس پُرعظمت ادبی ورثے اور شعری روایات کے آخری علمبرداروں میں شمار ہوتے ہیں جو کم وبیش تین صدیوں سے دکن کے مختلف ادبی مراکز جیسے گلبرگہ، بیدر، گولکنڈہ، بیجاپور اور پھر اورنگ آباد میں نشو ونما پا رہی تھیں۔ محمد قلی سے ولیؔ تک یہ ادبی روایت اپنے نشو ونما اور ارتقا کی نئی منزلیں طے کرتی رہی۔ سراج کے بعد دکنی شاعری کی روایات میں بتدریج ضعف آتا گیا اور اس کی جگہ فارسی شاعری کے اثرات نے لے لی۔ ولیؔ اور سراجؔ نے دکنی شاعری کی اس عظیم روایت کا سلسلہ شمالی ہند کی شاعری سے ملا دیا۔ جس کی وجہ سے 1750ء کے بعد شمالی ہند میں فارسی شاعری کے زیر اثر نئے خطوط پر اُردو شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔

سراجؔ نے بارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ کی تعلیم مکمل کی۔ اس زمانے میں ان پر جذب ومستی کی کیفیت طاری ہوا کرتی اور بے اختیار فارسی اشعار منہ سے جاری ہو جاتے تھے۔ بے خودی کے عالم میں وہ گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ رات دن صحرا نوردی کرتے اور زیادہ تر وقت حضرت برہان الدین غریب کے آستانے پر گزارتے۔

1146ھ/ 1734ء میں جب کہ سراج کی عمر 20 یا 19 سال تھی۔ انہوں نے چشتیہ سلسلے کے ایک صوفی بزرگ شاہ عبدالرحمان سے بیعت کی۔ اسی زمانے میں انہوں نے اُردو شاعری کا آغاز کیا اور 1152ھ/ 1740ء میں اپنے مرشد کے حکم کی بنا پر شاعری ترک کردی۔ گویا پانچ‘ چھے سال کی مختصر مدت میں انہوں نے اپنا ضخیم دیوان مرتب کیا۔

سراجؔ نے کم وبیش تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کے کلیات میں غزل‘ قصیدہ‘ مثنوی‘ رباعی‘ ترجیع بند سبھی اصناف شعر ملتے ہیں۔ عشق ان کی شاعری کا بنیادی محور ہے۔ جذبۂ عشق اور سوز محبت کی وجہ سے ان کی شاعری اور شخصیت میں وسیع المشربی‘ خاکساری اور بے نیازی کی کیفیات پیدا ہوگئی ہیں۔ سراجؔ نے یوں تو چھوٹی بڑی بارہ مثنویاں تصنیف کی ہیں لیکن ''بوستانِ خیال'' ان کی ایک طویل اور اہم عشقیہ مثنوی ہے۔ جو نہ صرف عہد ولیؔ اور سراجؔ کی ایک نمائندہ مثنوی ہے بلکہ اُردو کی بلند پایہ مثنویوں میں بھی شمار ہوتی ہے۔ ''بوستانِ خیال'' اس کا تاریخی نام ہے، جس سے نہ صرف اس کی تاریخ تصنیف 1160ھ/ 1756ھ کا پتا چلتا ہے بلکہ تعدادِ اشعار (1160) پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کیا میں جب اس مثنوی کا خیال — تھے ہجری ہزار و صد و شصت سال
شمار اس کی ابیات کا جب کیا — تو ہجری کے سن سے موافق ہوا
زبس اس میں ہے سیر گلشن تمام — رکھا ''بوستانِ خیال'' اس کا نام

عدد جب کہ اس نام کے آے ہات　　　مطابق ہوے سال و ابیات سات

مثنوی کے درج ذیل شعر میں سراج نے اطلاع دی ہے کہ یہ طویل مثنوی انہوں نے صرف دو دن میں لکھی ہے۔

یہ دو دن کی تصنیف ہے حسبِ حال　　　زبان پر نکل آیا دل کا اُبال

بوستانِ خیال کا قصہ اس عہد کی دیگر مثنویوں کی طرح کسی فرضی یا خیالی داستان پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس میں سراؔج نے اپنے ذاتی اور نجی واقعات کی ترجمانی کی ہے۔ سراؔج ایک خوبرو لڑکے پر فدا ہو گئے تھے۔ جو اُن کے یہاں درس وتدریس کے سلسلے میں آیا کرتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اس لڑکے نے اچانک سراؔج سے ترک تعلق کر لیا جس کی وجہ سے وہ بیکل و بے قرار رہنے لگے۔ اپنی اس رودادِ عشق کو انہوں نے ایک سردار زادہ کو اسی کے ایما پر سنایا۔ مثنوی کا اختتام ایک مناجات پر ہوتا ہے جس میں انہوں نے خدا سے التجا کی ہے کہ ان کا دل بتوں کی محبت سے آزاد ہو جائے۔ وہ صحبت غیر سے کنارہ کشی اختیار کر کے دیر سے کعبے کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ اس طرح بوستان خیال عشق مجازی سے شروع ہو کر عشق حقیقی پر ختم ہوتی ہے۔ سراؔج کی دیگر مثنویاں مختصر ہیں اور جن کی حیثیت مثنوی سے زیادہ مسلسل غزل کی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی: یہ نظمیں

''ان معنی میں مثنویاں ہیں کہ ان میں مثنوی کی بحر کی پابندی اور ابیات کا التزام کیا گیا ہے۔ لیکن مزاج کے اعتبار سے یہ نظم اور غزل مسلسل کی ملی جلی شکلیں ہیں۔'' (تاریخِ ادب اُردو۔ جلد اول۔ صفحہ 581)

جہاں تک سراج کی غزل گوئی کا تعلق ہے وہ ولؔی کے بعد اور عہدِ میؔر و سوؔدا سے پہلے کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ غزل گوئی کے میدان میں ان کا کوئی ہم عصر ان کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔ سراج کی غزل گوئی کا نمایاں وصف سادگی بیان، سوز و گداز اور تاثر کی فراوانی ہے۔ ان کی غزلوں میں بڑا کیف ہے، وارفتگی ہے، رس ہے اور رعنائی ہے۔ جو ایک طرف ان کے جذبے کی شدت اور خلوص کی دین ہے تو دوسری طرف اس میں وہ اسلوب بیان بھی برابر کا شریک ہے، جو ہندوستانی اور ایرانی عناصر کے دل کش اور متوازن امتزاج کا نتیجہ ہے۔ فارسی زبان و ادب پر ماہرانہ عبور اور قدیم دکنی شاعری کے بنیادی رجحانات سے وابستگی نے سراج کے کلام کو ایک رچی ہوئی کیفیت اور ایسی رنگینی و رعنائی بخشی ہے کہ ان کی شاعری اُردو غزل کی ایک منفرد آواز بن گئی۔ ایک ایسی آواز جو دو صدیوں کے گزر جانے کے باوجود آج بھی پڑھنے والوں کے لیے دل کش بھی ہے اور نئی بھی۔

سراؔج کو عموماً صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صاحب دل صوفیوں کی صحبت میں بسر کیا، وہ مزاجاً اور عملاً صوفی تھے اور ان کے کلام میں روحانی تجربات کی حرارت بھی ملتی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کے کلام پر تصوف کا غلبہ نظر نہیں آتا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ان کے ضخیم کلیات میں جو تقریباً تین ہزار پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ سو دو سو اشعار کو چھوڑ کر تصور عشق خالصتاً مادی اور مجازی ہے۔ سراؔج کا تصور محبوب، دکنی اُردو کے دوسرے شاعروں کی طرح ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ محبوب محض تخیلی اور روایتی نہیں بلکہ اسی عالم رنگ و بو میں رہنے بسنے والا جیتا جاگتا انسان ہے جو تمام نسوانی محاسن کے ساتھ سامنے آتا ہے اور جسے سراؔج نے گل بدن، موہن، سریجن، پیو، پری وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے:

کہاں ہے گل بدن موہن ہمارا　　　کہ جیوں بلبل ہے نالاں دل ہمارا

دل پری رو کوں دیکھ دنگ ہوا　　　دشمن جانِ نام و ننگ ہوا

نین کی پتلی میں اے سریجن ترا مبارک مقام دستا　　　پلک کے پٹ کھول کر جو دیکھوں تو مجھ کوں ماہ تمام دستا

سراج کی شاعری کا ایک اہم موضوع تصوف ہے۔عشق میں ان کی ازخود رفتگی مجاز اور حقیقت کی حدوں کو ایک کر دیتی ہے اور محبت کا دائرہ وسیع ہو کر کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔اُردو شاعری میں تصوف کی روایت بہت عام ہے کم وبیش ہر شاعر کے کلام میں تصوف کے مسائل کا کچھ نہ کچھ ذکر ضرور مل جاتا ہے لیکن اُردو شاعری کی تاریخ میں بہت کم شاعر ایسے نظر آتے ہیں جو عملاً صوفی بھی تھے۔سراج کے کلام میں روحانی کیفیات اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ نمایاں ہیں۔انہوں نے تصوف کے مسائل کو عشقیہ لب و لہجے میں سادہ' پراثر اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ سراج کے ہاں فلسفہ وتصوف کے مضامین بھی ہیں اور درس اخلاقیات بھی۔دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ بھی ہے۔پند ونصیحت بھی ہے اور اعلیٰ اقدار کو اپنا نے کی تلقین بھی۔

دو رنگی خوب نئیں یک رنگ ہو جا　　سراپا موم ہو یا سنگ ہوجا
تو فنا ہو اگر بقا چاہے　　نیستی میں توں دیکھ ہستی ہے
راہ خدا پرستی اول ہے خود پرستی　　ہستی میں نیستی ہے اور نیستی میں ہستی
روشن ہے اے سراج کہ فانی ہے سب جہاں　　مطرب غلط ہے جام غلط انجمن غلط

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''پوری اُردو شاعری کے پس منظر میں سراج کی شاعری کو رکھ کر دیکھا جائے تو وہ اُردو شاعری کے راستے پر ایک ایسی مرکزی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے میر' سودا' مصحفی' آتش' مومن' غالب اور اقبال کی روایت کے راستے صاف نظر آ رہے ہیں۔سراج نے اُردو شاعری کے بنیادی راگ کو جگایا ہے۔اس لیے ان کی آواز سارے بڑے شاعروں کی آواز اور لہجے میں موجود ہے۔''

(تاریخ ادب اُردو۔جلد اول صفحہ 573)

7.3 دیگر شعرا

7.3.1 شاہ قاسم اورنگ آبادی:

شاہ قاسم علی نام'' قاسم تخلص برہان پور میں پیدا ہوئے۔نوجوانی کے زمانے میں اورنگ آباد آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو گئے۔ان کے والد کا نام شیخ عبداللہ انصاری تھا وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔

شاہ قاسم کو چشتیہ اور قادریہ دونوں سلسلوں میں بیعت حاصل تھی۔چشتیہ سلسلے میں وہ شاہ فقیر علی کے مرید وخلیفہ تھے۔قادریہ سلسلے میں ان کے مرشد و رہنما شاہ کرم اللہ بخاری تھے۔تاہم کلام کے مطالعے سے وہ ایک رند مشرب' عشق پیشہ' حسن پرست' آزاد منش اور قلندر مزاج شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

رند مشرب ہیں قلندر' ہم جو چاہیں سو کریں　　کوئی ہمارا کیا کرے گا منصب وجا گیر نئیں
ہم قلندر وضع بے پروا فقیر　　رند مشرب عاشق بے باک ہیں

شاہ قاسم ایک قادر الکلام اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔مولوی سخاوت مرزا نے 1975ء میں ان کے دیوان کو مرتب کر کے انجمن ترقی

اُردو کراچی سے شائع کر دیا۔ شاہ قاسم شاعرانہ کمال کے نقطۂ نظر سے وؔلی اور سراؔج کے مرتبے کو نہیں پہنچتے لیکن انہیں اپنی شاعری پر بہت ناز تھا اور وہ وؔلی کو خود سے کم تر درجے کا شاعر سمجھتے تھے۔

آج اس وقت میں ولی نہیں حیف مجھ سے پوچھیں صلاحِ راہِ سخن

شاؔہ قاسم کے متعدد اشعار میں خود ستائی' شاعرانہ تعلّی اور فخر و مباہات کا انداز موجود ہے۔

قیامت لگ تمہارے شاہ قاسم سخن عالم کو یاد آیا کریں گے

شاہ قاسم دکن سیں تا دلی کون دیوے ترا حساب سخن

زبان و بیان کے اعتبار سے شاؔہ قاسم' وؔلی اورنگ آبادی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان کو ''ریختہ'' کہا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی شاہ قاسم کے کلام کو ''بغیر جذبے کی شاعری'' کہتے ہیں تاہم ان کے ہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں گہرا تاثر اور سوز و نشتریت پائی جاتی ہے۔

ہزار افسوس یارب یہ بہاریں یوں چلی جائیں ہماری آہ و نالوں کی پکاریں یوں چلی جائیں

شاہ قاسم فقیر آتے ہیں عاشق بے نظیر آتے ہیں

شاہ قاسم کا حال مت پوچھو باز آیا ہے زندگانی سیں

7.3.2 عاؔجز اورنگ آبادی:

عارف الدین خاں عاؔجز (متوفی 1178ھ) کے والد اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں بلخ سے ہندوستان آئے۔ عاؔجز کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ غازی الدین فیروز جنگ نے ان کے والد کو منصب سے سرفراز کیا تھا۔ عاجز ابھی کم عمر تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کی وفات کے بعد عاجز نواب لشکر خاں بہادر نصرت جنگ کے زیر سایہ پرورش پاتے رہے۔ نواب مذکور کے ہمراہ وہ شمالی ہند سے اورنگ آباد آئے اور انہیں کی سفارش کی بدولت آصف جاہ اول اور پھر ناصر جنگ شہید کے درباروں تک رسائی حاصل کی۔

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ عاجز کو مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل تھی اور وہ نہایت تیز طبع' بدیہہ گو اور منکسر المزاج انسان تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے کلام کو محفوظ کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔ اورینٹل مینو اسکرپٹ لائبریری حیدرآباد میں ان کے اُردو دیوان کا ایک مخطوطہ موجود ہے۔

عاجز نے زیادہ تر مشکل زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اور اپنے کلام میں صنائع بدائع کے استعمال پر خصوصی توجہ دی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام میں سادگی کے بجائے تصنع اور آمد کے بجائے آورد کا احساس ہوتا ہے۔

کہتے ہیں سنگلاخ زمینوں میں ہم تو شعر پانا ہماری شوخی معنی کو ہے بکٹ

سر ہمارا توڑنے وہ سنگ دل آیا ہے آج مر مرا کیدھر ہے یارو سنگ خارا ہے کدھر

چمن میں چل کے بجن بے حساب ساغر کھینچ بہار رنگ گلستاں کے سر سے چادر کھینچ

عاجز نے 500 ابیات پر مشتمل ''لال و گوہر'' کے نام سے ایک مثنوی بھی تصنیف کی ہے۔ جس میں بنگالہ کے شہزادے لال اور پریوں کی شہزادی گوہر کی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں اس دور کی دوسری مثنویوں کی طرح محیر العقول واقعات اور مافوق الفطرت عناصر کی

کارفرمائی بھی ہے۔مثنوی لال و گوہر کو بے حد شہرت حاصل ہوئی۔اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ 1226ھ میں میر محمد باقر نے ''حدیقۂ دل'' کے نام سے اس کو فارسی نثر میں منتقل کیا اور مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے اس کا فرنچ زبان میں خلاصہ بھی لکھا ہے۔بمبئی اور مدراس میں یہ مثنوی کئی بار چھپ چکی ہے۔مجلس ترقی ادب لاہور نے اس کا جدید ایڈیشن بھی شائع کیا ہے۔

7.3.3 وجدؔی کرنولی:

حکیم شیخ ہدایت اللہ وجدی کا شمار عہد ولی وسراج کے قادر الکلام سخنوروں میں ہوتا ہے۔ان کے حالات زندگی' تاریخ پیدائش و وفات اور مدفن پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ان کے بارے میں صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ انہیں فن طب اور کتابت کے علاوہ علم نجوم' موسیقی اور شطرنج سے دلچسپی تھی۔ان کی تین مثنویاں دریافت ہوئی ہیں۔(1) مخزن عشق (2) پنچھی باچھا (3) تحفۂ عاشقاں

مخزن عشق وجدی کی پہلی مثنوی ہے۔وجدی نے ''باغ جاں فزا'' سے اس کی تاریخ تصنیف 1145ھ خود نکالی ہے۔مثنوی کا آغاز حمد و نعت اور خلفاءِ راشدین کی مدح سے ہوتا ہے اس کے بعد منقبت حضرت غوث اعظمؒ ہے۔اور پھر وجدی نے اپنے پیر و مرشد حضرت فخر الدین شامی کی مدح لکھی ہے۔

کہوں اب مدح مرشد کا زبان کھول   مبارک ناوں پر گوہر سٹوں رول
جہانِ فقر کا فخر گرامی   جسے تھا ناوں فخرالدین شامی

مخزنِ عشق میں وجدؔی نے کرنول کے نواب اسماعیل خاں پنّی کی تعریف میں ایک باب مختص کیا ہے۔جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ نواب مذکور کے دربار سے وابستہ تھے۔مخزنِ عشق ایک ضخیم مثنوی ہے جس میں زابلستان کے وزیر بیدار دل اور فعفور چین کی بیٹی پری رخ کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔یہ مثنوی دراصل وجدی کے ایک رفیق دیرینہ عبدالقدوس کے مرشد شاہ صادق اورنگ آبادی کے فراہم کردہ فارسی قصے کا دکنی ترجمہ ہے جو شاہ صادق ہی کی فرمائش پر کیا گیا ہے۔

وجدی کی دوسری مثنوی پنچھی باچھا 1146ھ کی تصنیف ہے۔یہ شیخ فریدالدین عطار کی مشہور فارسی مثنوی ''منطق الطیر'' کا منظوم ترجمہ ہے۔اس کی خوبی یہ ہے کہ وجدی نے عطارؔ کی مثنوی کے مطالب کو آزادانہ طور پر اُردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمہ نہیں بلکہ اچھی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔وجدی کی مثنویوں میں پنچھی باچھا کو اس کے متصوفانہ موضوع کی وجہ سے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔یہ کتاب بمبئی اور مدراس کے مختلف مطبعوں سے متعدد بار چھپ چکی ہے۔1959ء میں پروفیسر سید محمد نے اسے مرتب کر کے سالار جنگ پبلشنگ کمیٹی' حیدرآباد سے شائع کیا۔

وجدی کی تیسری مثنوی کا نام ''تحفۂ عاشقاں'' ہے۔پنچھی باچھا کی طرح یہ مثنوی بھی شیخ فریدالدین عطار کی فارسی مثنوی ''گل و ہرمز'' کا دکنی ترجمہ ہے۔''تحفۂ عاشقاں'' میں ملک روم کے بادشاہ قیصر کے شہزادے ہرمز اور حورستان کے بادشاہ فوزان کی شہزادی گل رخ کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔اس مثنوی کو وجدی نے متعدد ابواب میں تقسیم کیا ہے اور دکنی کی دوسری مثنویوں کی طرح ہر باب کے عنوان کو ایک شعر کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے جس کی بحر مثنوی کی بحر سے مختلف ہے۔اگر تمام عنوانات کے اشعار کو جمع کرلیا جائے تو مثنوی کا خلاصہ سامنے آجاتا ہے۔تحفہ عاشقاں ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔اس میں شاعر نے اپنے دور کی تہذیب و معاشرت اور رسوم و رواج کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

7.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ اورنگ زیب عالمگیر نے 1096ھ/ 1686ء میں بیجاپور اور 1097ھ/ 1687ء میں گولکنڈہ فتح کیا۔ان فتوحات کے نتیجے میں دکن کی عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا۔

☆ ان سلطنتوں کے زوال کی وجہ سے دکن میں علم وفن اور تہذیب وتمدن کی بنیادیں ہل گئیں۔اب اس خطے میں دکنی شاعروں اور ادیبوں کا کوئی سرپرست اور قدردان نہیں رہا تھا۔

☆ بیجاپور کی تباہی کے بعد وہاں کے شعرا وادبا دور دراز کے مقامات جیسے کڑپہ' کرنول' ویلور اور ارکاٹ چلے گئے۔ جہاں مقامی امرا کی سرپرستی کی توقع تھی۔اس طرح گولکنڈہ کے کچھ شعرا وادبا اورنگ آباد چلے گئے جو عالمگیر کا جنوبی مستقر تھا۔ بہرحال دکن کے سیاسی زوال کی وجہ سے یہاں شعروادب کی تخلیق کا سلسلہ بالکلیہ طور پر رک نہیں گیا بلکہ نئے رخ سے جاری رہا۔

☆ مغلوں کی فتح دکن کی وجہ سے شمالی ہند کے لسانی اثرات دکنی زبان پر مرتب ہوئے۔اور دکنی زبان پر فارسی الفاظ اور اسالیب کا رنگ گہرا ہوتا گیا۔ولؔی اور سراؔج اس دور کے سب سے قدآور شاعر تھے اس لیے اس دور کو ولؔی اور سراؔج کا دور کہا جاسکتا ہے۔

☆ ولؔی اور سراؔج کے علاوہ اس دور میں متعدد شعرا داد سخن دے رہے تھے جن میں قاضی محمود بحری' فراقی' داؤد اورنگ آبادی اور دیگر شعرا میں شاہ قاسم' عاجز اور وجدی کرنولی اہم ہیں۔

☆ ولؔی کا نام ولی محمد اور تخلص ولؔی تھا۔ان کے حالات زندگی نامعلوم ہیں۔بعض محققین اسے گجرات کا باشندہ کہتے ہیں تو بعض اورنگ آباد کا۔ تاہم زمانۂ قدیم کے مورخین اور تذکرہ نگاروں نیز عہد حال میں ڈاکٹر زور اور جمیل جالبی کی رائے ہے کہ ولی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔نوجوانی میں انہوں نے گجرات کا سفر کیا تھا۔

☆ ولؔی ایک قادرالکلام شاعر تھے ان کی کلیات میں غزل۔مثنوی۔مخمس۔رباعیات مرثیہ وغیرہ مختلف اصناف ملتی ہیں۔ولؔی نے دکنی شاعری کی روایات اور رجحانات کی پاسداری کی۔ولؔی کو اُردو غزل کا مجتہد اور امام کہا جاتا ہے۔کیوں کہ انہوں نے دکنی غزل کو فارسی مضامین اور فارسی اسالیب سے ملا کر غزل کا ایک نیا اسلوب ایجاد کیا۔

☆ 1112ھ/ 1700ء میں ولؔی نے دلی کا سفر کیا۔شمالی ہند میں ولی کے سفر کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ولؔی کے اثر سے شمالی ہند کے شعرا نے سنجیدگی کے ساتھ اُردو زبان میں شاعری کا سلسلہ شروع کیا ورنہ اس سے قبل وہ فارسی میں شاعری کرنے کو باعث فخر سمجھتے تھے۔1132ھ/ 1719ء میں ولؔی کا دیوان دلّی پہنچا تو اس کے اشعار وہاں کے ادبی حلقوں میں نہایت مقبول ہوئے۔

☆ قاضی محمود بحرؔی ولؔی کے بزرگ ہم عصر تھے۔وہ گوگی (تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ) کے باشندے تھے۔انہوں نے اُردو اور فارسی میں پچاس ہزار اشعار لکھے تھے لیکن ان کا یہ ادبی سرمایہ بیجاپور سے حیدرآباد کے سفر کے دوران ڈاکوؤں نے لوٹ کر تباہ کردیا۔

☆ بحری کی تصانیف میں ایک دیوان اور دو مثنویاں ''بنگاب نامہ'' اور ''من لگن'' محفوظ ہیں۔بحری کی غزلوں میں عشق مجازی کا رنگ غالب ہے۔البتہ ان کی مثنویاں عشق حقیقی اور تصوف وعرفان کے مسائل پر مبنی ہیں۔

☆ سید محمد فراقی ولؔی کے کم عمر ہم عصر تھے۔ولؔی کی طرح انہوں نے بھی شمالی ہند کا سفر کیا تھا۔فراقی کی اہم تصنیف مثنوی ''مراۃ الحشر'' ہے جو

تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ فارسی کے ''آخرت نامہ'' کا ترجمہ ہے۔اس میں قیامت سے قریب اور قیامت کے بعد پیش آنے والے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔فراقی کی غزلوں میں عشقیہ اور ناصحانہ مضامین ملتے ہیں۔

☆ داؤد اورنگ آبادی اسی دور کے ایک اہم غزل گو شاعر ہیں۔داؤد کے کلام پر ولی کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔وہ اپنے آپ کو''ولی ثانی'' کہتے تھے۔داؤد کے دیوان کا بیشتر حصہ محبوب کے خد وخال، لب ورخسار، چشم وابرو اور رفتار و گفتار کی تعریف وتوصیف پر محیط ہے فراقی اور بحری کے مقابلے میں داؤد کی زبان بہت صاف ہے۔

☆ ولی کے بعد اس دور کے دوسرے بڑے شاعر سراجؔ اورنگ آبادی ہیں سراج نے کم وبیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ان کے کلیات میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور ترجیع بند وغیرہ مختلف اصناف ملتی ہیں۔وہ ایک پر گو شاعر تھے انہوں نے پانچ چھے سال کی مختصر مدت میں اپنا ضخیم دیوان مرتب کیا۔ان کی غزل کا محور ومرکز جذبہ عشق اور سوز محبت ہے۔ان کی غزلوں میں سوز وگداز، کیف ووارفتگی اور سادگی بیان کا احساس ہوتا ہے۔سراج نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں بوستان خیال نہایت اہم ہے اس میں سراج نے کسی فرضی داستانِ عشق کے بجائے ذاتی واردات بیان کی ہے۔

☆ اس دور کے دیگر شعرا میں شاہ قاسم اورنگ آبادی صاحب دیوان شاعر ہیں وہ ایک رند مشرب، عشق پیشہ، حسن پرست اور قلندر مزاج شاعر تھے۔زبان و بیان کے اعتبار سے شاہ قاسم ولی اورنگ آبادی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔انہوں نے اپنی زبان کو ریختہ کہا ہے۔ان کے اکثر اشعار میں گہرا تاثر اور سوز ونشتریت پائی جاتی ہے۔

☆ عارف الدین خاں عاجز کا شمار بھی اس دور کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔وہ نہایت تیز طبع اور برجستہ گو شاعر تھے۔انہیں مختلف علوم میں مہارت حاصل تھی۔اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ایک اُردو دیوان اور مثنوی لال وگوہر ان سے یادگار ہے۔

☆ عاجز کو مشکل زمینوں میں شعر کہنے کا شوق تھا جس کی وجہ سے ان کی غزل کے اشعار میں تصنع اور آورد پائی جاتی ہے۔عاجز کی مثنوی لال و گوہر جو 500 اشعار پر مشتمل ہے اپنے زمانے میں نہایت مقبول ہوئی۔

☆ اس دور کے ایک اور قادرالبیان شاعر وجدیؔ کرنولی ہیں۔ان کے حالات پردہ تاریکی میں ہیں۔دکنی زبان میں ان سے تین مثنویاں یادگار ہیں۔مخزن عشق، پنچھی باچھا اور تحفۂ عاشقاں۔ان میں مخزن عشق وجدی کی پہلی مثنوی ہے جو 1145ھ میں لکھی گئی۔یہ مثنوی وجدی نے شاہ صادق اورنگ آبادی کی فرمائش پر لکھی۔

☆ پنچھی باچھا وجدی کی دوسری تصنیف ہے جو 1146ھ میں وجود میں آئی۔یہ عطارؔ کی مشہور فارسی مثنوی منطق الطیر کا منظوم ترجمہ ہے۔وجدی کی تیسری مثنوی تحفۂ عاشقاں ہے۔یہ بھی عطارؔ کی ایک اور مثنوی ''گل و ہرمز کا دکنی ترجمہ ہے۔وجدی کی مثنویوں میں پنچھی باچھا صوفیانہ مثنوی ہے باقی دو مثنویاں عشقیہ داستانوں پر مبنی ہیں۔

7.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
رخنہ	:	سوراخ، دیوار کا چھید

پرآشوب	: مصیبتوں اور پریشانیوں سے بھرا
قدآور	: درازقد (مرادی معنی بلند مرتبت)
پنبہ	: روئی، کپاس
سلاسل	: سلسلہ کی جمع، زنجیریں
آہو	: ہرن
شصت	: ساٹھ
وساطت	: وسیلہ یا واسطہ
مقلدین	: تقلید کرنے والے، پیروی کرنے والے
رازنہانی	: چھپا ہوا بھید
رمزشناس	: پوشیدہ بات سمجھنے والا
ارادت مند	: معتقد
چشمک	: دشمنی
صحرانوردی	: جنگلوں میں مارا مارا پھرنا
وارفتگی	: آپے سے باہر ہونا، بےخود ہونا
معاصرین	: ہم عصر، ایک ہی زمانے کے لوگ
ادعا	: دعوا کرنا
مدن	: محبت کا دیوتا، عشق
وسیع المشرب	: کشادہ دل، کشادہ ذہن
رعنائی	: زیبائش، دلکشی
دام	: جال، پھندا
قلمرو	: حکومت، سلطنت

7.6.1 نمونہ امتحانی سوالات

7.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ولی کا اصل نام کیا ہے؟

2۔ سراج اورنگ آبادی کی تصانیف کے نام بتائیے۔

3۔ عاجز اورنگ بادی کی مثنویوں کے نام بتائیے۔

4۔ شاہ قاسم کا دیوان کس نے مرتب کیا؟

5۔ وؔلی نے کس سنہ میں دہلی کا سفر کیا؟

6۔ قاضی محمود بحری کا اصل نام کیا تھا؟

7۔ مثنوی ''من لگن'' کا موضوع کیا ہے؟

8۔ داؤد اورنگ آبادی کا پورا نام کیا تھا؟

9۔ عاجؔز کی پیدائش کہاں ہوئی؟

10۔ وجدؔی کرنولی کا پورا نام کیا تھا؟

7.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سراج اورنگ آبادی پر مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔

2۔ سید محمد فراقؔی کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

3۔ وجدی کرنولی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ بیان کیجیے۔

4۔ بحرؔی کے حالات بیان کیجیے۔

5۔ داؤد اورنگ آبادی کے بارے لکھیے۔

7.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ وؔلی کے حالات زندگی اور ان کے کلام کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ وؔلی کے اورنگ آبادی معاصرین کا تعارف کرائیے۔

3۔ مغل دور میں اردو ادب کا جائزہ لیجیے۔

7.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی

2۔ تاریخ ادب اردو جلد اول — ڈاکٹر جمیل جالبی

3۔ تاریخ ادب اردو، جلد اول ودوم — پروفیسر سیدہ جعفر، گیان چند جین

4۔ ولی گجراتی — سید ظہور الدین مدنی

5۔ دکنی ادب کی تاریخ — ڈاکٹر محی الدین قادری زوؔر

اکائی 8: مابعد دکنی ادب
(دکن میں)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 مابعد دکنی ادب: تعارف (آصف جاہ ثالث، رابع، خامس، سادس، سابع کا دور)

8.3 دکنی دور کے بعد کے اہم شعرا

8.3.1 شاداںؔ

8.3.2 چنداؔ

8.3.3 فیضؔ

8.3.4 فیاضؔ

8.3.5 مائلؔ

8.3.6 امجدؔ

8.3.7 توفیقؔ

8.3.8 شادؔ

8.3.9 صفیؔ

8.3.10 جلیلؔ

8.3.11 نظمؔ

8.4 دکنی دور کے بعد کے اہم نثر نگار

8.4.1 ابراہیم بیجاپوری

8.4.2 دارالترجمہ شمس الامرا

8.4.3 محبّ حسن

8.4.4 صوفی ملکاپوری

8.4.5 شمس اللہ قادری

8.5 دکنی دور کے بعد صحافت
8.5.1 اہم رسالے اور اخبارات
8.6 اکتسابی نتائج
8.7 کلیدی الفاظ
8.8 نمونہ امتحانی سوالات
8.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
8.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
8.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

آصفیہ دور کے آغاز ہی سے دکن میں اردو شعر و ادب کا بڑا چرچا تھا۔اس کے پیچھے قطب شاہی دور کی شاندار ادبی روایات کارفرما تھیں۔آصف جاہی سلطنت کے قیام کے بعد اس روایت کی توسیع ہوئی اور دکن میں بے شمار خوش فکر و خوش گو شاعر اور ادیب پیدا ہوئے۔آئندہ صفحات میں مابعد دکنی ادب (دکن میں) شاعری،نثر نگاری اور صحافت کے فروغ کا مطالعہ کیا گیا۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

☆ مابعد دکنی ادب کا تعارف بیان کرسکیں۔
☆ دکنی دور کے بعد کے شعرا پر روشنی ڈال سکیں۔
☆ دکنی دور کے بعد کے نثر نگار پر اظہار خیال کرسکیں۔
☆ دکنی دور کے بعد صحافت،اہم رسائل و اخبارات سے واقف ہوسکیں۔

8.2 مابعد دکنی ادب : تعارف (آصف جاہ ثالث،رابع،خامس،سادس،سابع کا دور)

دکن میں سلطنت آصفیہ کا قیام 1724ء میں عمل میں آیا۔اس سلطنت کے بانی نواب میر قمرالدین خان نظام الملک آصف جاہ اول نے اورنگ آباد کو اپنا پایہ تخت قرار دیا لیکن بعد میں نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد (1184ھ 1768ء) میں پایہ تخت سلطنت کو اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کیا گیا تو تہذیبی چہل پہل اور شعر و سخن کی سرگرمیاں بھی یہاں منتقل ہوگئیں۔آصف جاہ اوّل صاحب سیف و قلم اور فارسی کے صاحب دیوان سخنور تھے۔ان کے بعد اُن کے جانشینوں نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی،نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث،نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع،نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس،نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس اور نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف سابع نے

بھی بانی سلطنت کی علمی و ادبی روایات کی پاسداری کی اور اپنی سلطنت میں علم و ادب اور علوم وفنون کے فروغ اور علما و فضلا اور شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ بالخصوص اس خاندان کے آخری دو فرمانرواوں یعنی نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس اور نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے عہد میں اردو زبان اور شعر و ادب کو بے حد عروج حاصل ہوا ۔ یہ دونوں حکمراں خود بھی شاعر تھے اور شعر و ادب کا نہایت پاکیز ذوق رکھتے تھے۔آصف جاہ سادس ادب نواز اور شعر و سخن کے قدر دان تھے ۔ وہ نہایت پرگو اور صاحب دیوان شاعر تھے ۔ اور باکمال شعرا کی سرپرستی بھی فرماتے تھے ۔نواب میر محبوب علی خاں کو فصیح الملک استاد جہاں حضرت داغؔ سے تلمذ حاصل تھا اور نواب میر عثمان علی خاں شاعری میں فصاحت جنگ جلیلؔ کے شاگرد تھے ۔

آصف جاہ سادس ’آصف‘ تخلص فرماتے تھے ۔ وہ اردو کے پرگو شاعر تھے ۔ ان کا دیوان اور کلام شائع ہو چکا ہے ۔انہیں جملہ اصناف نظم پر دسترس حاصل تھی ۔موضوعاتی نظموں کی طرح ان کی عاشقانہ اور دلکش غزلیات بھی قابل ستائش ہیں ۔ان کی رباعیات کا ایک خاص رنگ ہے ۔ انہوں نے فی البدیہ رباعیات بھی کہی ہیں ، جو لطفِ زبان، ترکیب کی خوبی، فصاحت مضمون، محاورات روزمرہ ہر پہلو سے لائق ستائش ہیں ۔ان کی علم نوازی اور قدر دانی سخن کا شہرہ دور دور تھا ۔ یوں تو شمالی ہند اور مختلف مقامات کے باکمال شعرا کی آمدورفت کا سلسلہ پہلے سے قائم ہو چکا تھا لیکن اس دور میں وہ اور مستحکم ہو گیا۔اس باہمی میل جول کا شاعری پر بھی اچھا اثر رہا۔

آصف جاہ سابع ’عثمان‘ تخلص فرماتے تھے ۔انہیں چھ زبانوں میں مہارت حاصل تھی ۔ اردو کے علاوہ انگریزی، عربی، فارسی اور تلنگی میں بھی دسترس رکھتے تھے ۔انہوں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اشاعت تعلیم کی طرف خاص طور پر توجہ کی ۔ نظام سابع نے اپنے عہد حکومت میں علم و ادب کی گراں بہا خدمات انجام دیں ۔علاوہ ازیں انہوں نے بیرون ریاست تعلیمی اداروں کو بیش بہا مالی امداد دی ۔ میر عثمان علی نے علوم وفنون کے ساتھ شعر و سخن کی بڑی سرپرستی کی ۔آپ خود اردو اور فارسی کے ایک خوش گو شاعر تھے ۔اوائل عمری سے ہی ان کو شاعری سے دلچسپی تھی ۔ان کا کلام انتخاب مرتب ہو کر زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے ۔آپ کے کلام کو ملوک الکلام کہنا ہر طرح صحیح ہے ۔آصف سابع کے عہد میں نئی شاعری کا آغاز ہوا ۔ان کا بیشتر کلام عالمانہ اور مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا ۔

نواب میر محبوب علی خاں کا ایک عہد ساز کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے 1301ھ میں اپنی سلطنت میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا جس کی وجہ سے اردو زبان شعر و ادب کی زبان سے آگے بڑھ کر دفتری اور کاروباری زبان بن گئی ۔اسی طرح آصف جاہی خاندان کے آخری فرمانروا میر عثمان علی خاں کے عہد میں اردو زبان کی پہلی یونیورسٹی ’’جامعہ عثمانیہ‘‘ کا قیام عمل میں آیا جس کی بدولت اردو علوم وفنون کی زبان بھی بن گئی ۔اس طرح آصف جاہی عہد حکومت کو اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی اور فروغ کا سنہرا دور کہا جا سکتا ہے ۔

آصفیہ دور کے آغاز ہی سے دکن میں اردو شعر و سخن کا بڑا چرچا تھا ۔اس کے پیچھے قطب شاہی دور کی طویل اور شاندار ادبی روایات کارفرما تھیں ۔آصف جاہی سلطنت کے قیام کے بعد اس روایت کی توسیع ہوئی اور دکن میں بے شمار خوش فکر و خوش نغز شاعر پیدا ہوئے جن کی تفصیل ضخیم دفتر کی متقاضی ہے ۔ پیش نظر اکائی میں شاعری، نثر اور صحافت کے حوالے سے مابعد دکنی ادب یعنی عہد آصفیہ کے اہم اور منتخب شاعروں، ادیبوں اور رسائل و اخبارات کا مطالعہ کیا گیا ہے ۔

8.3 دکنی دور کے بعد کے اہم شعرا

8.3.1 شاداںؔ:

چندولال نام، راجہ بہادر، مہاراجہ بہادر، راجۂ راجایاں خطاب اور شاداںؔ تخلص تھا۔ ان کی پیدائش 1175ھ میں بمقام برہان پور میں ہوئی لیکن کم عمری میں والد کے انتقال کے بعد اپنے چچا کی نگرانی وتربیت میں پرورش پائی۔

مہاراجہ چندولال شاداںؔ نے بہت ہی معمولی درجے سے ترقی کی اور ریاست حیدرآباد کے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ 1260ھ میں مہاراجہ بہادر وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہوئے اور ایک سال بعد 1261ھ میں 86 سال کی عمر میں وفات پائی۔

مہاراجہ چندولال خود صاحب علم وفضل تھے اور علوم کے قدردان، سخن فہم، اہل علم کے محسن بھی۔ ساتھ ہی وہ ایک با کمال اور کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ ان کو شعر وسخن سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ علماء اور شاعروں کی سرپرستی اور امداد میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ بڑے مخیرّ تھے ان کی داد ودہش کا شہرہ سن کر دور دراز مقامات سے صاحبان علم وفضل اور ارباب کمال حیدرآباد آئے۔ شاہ نصیر دہلوی' مشتاق' حفیظ دہلوی وغیرہ انہی کی طلب پر حیدرآباد آئے تھے۔ انہوں نے دہلی ک سے استاد ذوقؔ اور لکھنو سے استاد ناسخؔ کو بھی حیدرآباد آنے کی دعوت دی تھی۔

شاداںؔ کے فارسی اور اردو دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ایک دیوان 1239ھ میں دوسر 1241ھ میں مرتب ہوا تھا شاداںؔ کا کلام مثنوی' قصیدہ' غزل اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ لیکن جو خوبیاں ان کی غزلوں میں پائی جاتی ہیں، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ میں نہیں ملتیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ غزل گوئی ہی کو زیادہ ترجیح دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ قصیدے دو تین سے زیادہ نہیں لکھے اور مثنویوں کا بھی یہی حال ہے۔

شاداںؔ کا کلام ان کے حقیقی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُن کی شاعری میں معرفت وتصوف' پند وموعظت اور عاشقانہ رنگ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ کلام کی رنگینی انداز بیان کی جدت اور تخیل کی بلند پروازی قادر الکلامی کی شاہد ہے۔

8.3.2 چنداؔ:

چندا بی بی نام' ماہ لقا خطاب اور چنداؔ تخلص تھا۔ چندا کی پیدائش 1181ھ/ 1766ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ چنداؔ کے جد اعلیٰ قوم چغتائی برلاس سے تھے۔ چنداؔ کے والد صلابت خاں تھے جن کو شاہ عالم کے زمانہ میں خطاب سے ممتاز کیا گیا تھا۔ راج کنور بائی گجراتن ان کی والدہ تھی۔ چنداؔ کی خالہ مہتاب کنور بائی کو آصف جاہ ثانی کے مدارالمہام رکن الدولہ بہادر نے اپنے عقد نکاح میں لے کر''صاحب جی صاحبہ'' کا خطاب دیا تھا۔ چونکہ وہ لاولد تھی اس لیے چنداؔ کو گود لے لیا تھا۔ اس طرح ایوانِ وزارت میں چندا کی پرورش ہوئی۔ تعلیم وتربیت کے لیے بڑے بڑے با کمال اُستاد مقرر کیے گئے۔ فن موسیقی کی تعلیم بھی مشہور اساتذۂ فن سے دلوائی گئی۔ ماہ لقا چونکہ ترکی الاصل تھی اس لیے حسن وجمال میں بے مثال تھی۔ ابھی پندرہ برس کی بھی نہ ہونے پائی کہ آصف جاہ ثانی کے دربار میں باریاب ہوئی وہ اس کو اتنا چاہتے تھے کہ جنگی مہم میں بھی ہمراہ سفر رکھا۔ ساٹھ سال کی عمر میں 1240ھ میں وفات پائی۔ کوہ مولا علی کے قریب اس کا مقبرہ موجود ہے۔

چنداؔ اردو کی دوسری شاعرہ ہے جس نے ایک مکمل دیوان (1213ھ) اپنی یادگار چھوڑا۔ وہ اکتسابی شاعرہ نہ تھی بلکہ اپنی فطرت اور اپنے ذوق کی مناسبت سے تفریحاً شعر کہا کرتی تھی۔ شاعری میں شیر محمد خان ایمان اس کے استاد تھے۔ فارسی میں چنداؔ کو اچھی خاصی مہارت حاصل تھی۔ اردو تو اس کی مادری زبان تھی۔ اس کا علمی وادبی ذوق اعلیٰ درجہ کا تھا ہمیشہ اہل علم وفضل سے اس کی صحبت رہتی۔ کتابوں کا بہت شوق تھا اور اس کا اپنا

ایک نفیس کتب خانہ تھا۔

حالات زندگی کا اثر اس کے ذوق شاعری پر بہت اچھا مرتب ہوا۔ حسن و جمال کی دولت اور نغمہ و موسیقی میں دستگاہ رکھنے کے ساتھ وہ خوش گوشاعرہ بھی تھی۔ اس کے اشعار زیادہ تر اس کے ذاتی حالات وخیالات کے غماز ہیں۔ اس کی غزلوں سے قلبی واردات اور ذہنی تاثرات کی نفاست ظاہر ہوتی ہے۔

1226ھ میں خود اس نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا جس میں ایک سو پچیس غزلیں ہیں اور ہر غزل پانچ شعر کی ہے جو پنجتن کی مناسبت سے ہیں۔ اس کی تقریباً تمام غزلوں کے مقطعوں میں ائمہ کا ذکر ملتا ہے۔ چنؔدا کی شاعری کی یہ خصوصیت بالکل انفرادی ہے۔ اردو شاعری میں کوئی دوسری مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی نے بھی اس التزام کے ساتھ اس بات کا خیال رکھا ہو اور اہتمام کے ساتھ غزل کہی ہو۔ چنؔدا کا انداز بیان نہایت شیریں اور لطیف ہے۔ اس کے کلام میں نسائی طرز احساس موجود ہے۔ شاعری میں جدت خیال اور تازگی فکر کے ساتھ سادگی بیان، صفائی اور بے ساختگی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے علاوہ محاکات کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

8.3.3 فیضؔ:

میر شمس الدین نام اور فیض تخلص تھا۔ ان کی ولادت 1195ھ میں حیدر آباد میں ہوئی۔ فیضؔ کے جد اعلیٰ مولوی میر رحمت اللہ آصف جاہ ثانی کے دور میں دہلی سے حیدر آباد آئے۔ انہیں کے فرزند میر امیر الدین، فیضؔ کے والد تھے۔ فیضؔ نے حیدر آباد میں تعلیم حاصل کی۔ بارہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ بہت جلد مروجہ علوم پر دسترس حاصل کی۔ عربی، فارسی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ عمدہ خوش نویس تھے۔ وہ اپنا وقت درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تلقین وہدایت درود و وظائف میں صرف کرتے تھے۔ اپنے عہد کے بڑے صوفی تھے۔ مریدین اور عقیدت مندوں کے ساتھ شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا، جس میں نواب شمس الامرا اور ان کے فرزند بھی شامل تھے۔

فیضؔ نے چار آصفی بادشاہوں (نظام علی خاں، سکندر جاہ، ناصر الدولہ اور افضل الدولہ) کا عہد دیکھا اور چھٹے بادشاہ (محبوب علی خاں) کی پیدائش کے قطعات تاریخ لکھے۔ اُن کا وصال (69) انہتر سال کی عمر میں 1283ھ میں ہوا اور حیدر آباد میں پیوند خاک ہوئے۔

فیضؔ نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ ''چشمہ فیض'' 1238ھ میں مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد اور تین دیوان مرتب ہوئے۔ ان کے علاوہ فارسی میں بھی ایک دیوان تھا۔ ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف بکثرت ہیں جن میں شمس النحو، شمس التصرف، طریق الفیض شرح عوامل، شمع منظومہ صرف، رسالہ ناسخ ومنسوخ، رسالہ عروض وقافیہ، خزانۃ الامثال جدول نصف النہار فیض، مفید الاحکام، حلت وحرمت، اصطلاحات اردو ان کے گراں قدر کارنامے ہیں۔ شاعری فطرت میں ودیعت تھی۔ اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد حافظ تاج الدین مشتاقؔ دہلوی سے تلمذ تھا۔ اس طرح فیض کا کلام دبستان دہلی کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ مگر اس کے ساتھ لکھنو کا بھی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ان کی علمی قابلیت اعلیٰ پایہ کی تھی۔ ان کی قادر الکلامی اور بدیہہ گوئی ضرب المثل تھی۔

فیضؔ اپنے دور کے مشہور استاد الشعراء مانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے کلام کو محض عشق و عاشقی کا ترجمان نہیں بنایا بلکہ اپنے دور کی سیاست اور سماجی حالت کی اصلاح کا بھی وسیلہ بنایا۔ اخلاق وتصوف کی چاشنی سے ان کا کلام اور بھی زیادہ پر تاثیر ہو جاتا ہے۔ فیض کو تاریخ گوئی میں خداداد ملکہ حاصل تھا۔ نواب فیاض الدین خاں مشرف جنگ کے مرتبہ ''دیوان فیضؔ''، کو 1300ھ میں فیضؔ کے شاگرد عزیز حکیم منور الدین خاں

علاؔج نے زیورطباعت سے آراستہ کیا۔خواجہ جمال الدین نے بھی فیضؔ کا دیوان شائع کروایا۔

8.3.4 فیاضؔ:

محمد فیاض الدین خاں نام، تخلص فیاضؔ اور مشرف جنگ بہادر خطاب، امرائے دربار آصفی سے تھے۔ وہ 1250ھ میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے اور دارالعلوم میں تعلیم وتربیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ دستور زمانہ کے مطابق فیاضؔ نے مشہور اساتذۂ وقت سے بھی عربی، فارسی اور دیگر علوم کی تکمیل کی۔ ان کو فطری طور پر شاعری کا ذوق تھا۔ مشہور استادِ سخن فیضؔ سے تلمذ حاصل تھا اور ان کے پاس شعروسخن کی جتنی محفلیں ہوتیں فیاضؔ ان سب میں شریک ہوتے۔ فیضؔ کے ممتاز تلامذہ میں فیاضؔ کا شمار ہوتا تھا۔ بہت کم عرصے میں ایک باکمال شاعر کی حیثیت سے مقبول ہوگئے۔ اپنے انتقال تک فیضؔ کے سالانہ عرس کی تقریب کے مشاعروں کی روح رواں ہوتے تھے۔ فیاضؔ ان مشاعروں کی منتخب غزلیات کو ایک گلدستے کی شکل میں مرتب کر کے ''گلدستۂ فیض'' کے نام سے شائع کرتے تھے۔ فیاضؔ فارسی زبان میں بھی شعر کہا کرتے تھے لیکن کم۔ عمر خیامؔ کی رباعیات کو یورپ و ایشیاء کے متفرق مجموعوں اور نسخوں سے جمع کر کے 1311ھ میں شائع کیا۔ فیضؔ کے دیوان کو سب سے پہلے فیاضؔ ہی نے ترتیب دے کر طبع کرایا تھا۔ فیاض 77، 78 سال کی عمر پائی آخر زمانے میں ان کی بصارت میں فرق آ گیا تھا لیکن لکھنا پڑھنا ترک نہیں کیا تھا۔ ان کا انتقال 1328ھ میں ہوا۔ ان کے فرزند نواب عزیز یار جنگ بہادر اپنے والد کی طرح علم دوست اور اعلیٰ درجے کے سخن سنج وسخن فہم اور بلند حوصلہ تھے۔ ان کا ایک اردو دیوان ہے جس میں غزلوں کے علاوہ مخمسات، قطعات اور موقتی نظمیں وغیرہ شامل ہیں۔ فیاضؔ کا کلام سادہ اور انداز بیان دلچسپ، نزاکتِ تخیل بھی لائق تحسین ہے۔

8.3.5 مائلؔ:

ڈاکٹر احمد حسین المتخلص بہ مائلؔ، حیدرآباد کے ممتاز شاعر تھے۔ مائلؔ کی پیدائش 1247ھ میں ہوئی۔ ان کے والد حاجی محمد رضا حسین رضاؔ علاقہ صرفخاص میں میر منشی تھے۔ ان کا سلسلہ شمالی ہند میں قاضیان گوپامو اور مدراس میں والا جاہی خاندان سے ملتا تھا۔

مائلؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے والدین ہی سے حاصل کی۔ انگریزی 'اقلیدس' حساب اور دیگر علوم میں انہیں عبور حاصل تھا۔ 1692ھ میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔ مائلؔ کو طب یونانی اور ہومیو پیتھک سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ طب کے بعد شاعری ہی ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ طبعی شاعر تھے۔ فارسی میں اپنے والد رضاؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ بعد میں محمد سرفراز علی وصفیؔ لکھنوی سے اصلاح لینی شروع کی۔ شمالی ہند کے مشہور شعرا میرؔ، سوداؔ، انیسؔ، جراتؔ، امیرؔ اور داغؔ وغیرہ کے جواب میں ان کی طویل غزلیں قابل مطالعہ ہیں۔

مائل کی جودت اور ولولہ سخن نے استاد کو بہت جلد ان کی طرف مائل کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تین سال کے عرصہ میں شاگرد خود استاد بن گیا۔ مائلؔ کی وفات 1332ھ کو ہوئی۔ حیدرآباد میں سپرد خاک ہوئے۔

مائلؔ حضرت آغا داؤد صاحب سے بیعت تھے۔ ان کی فرمائش پر ایک ''میلاد مبارک''، لکھی تھی جس کو انہوں نے بہت پسند کیا۔ اس کے بعد سے مائلؔ نے سوائے نعت شریف کے کچھ نہیں لکھا چنانچہ ایک نعتیہ دیوان مکمل ہو گیا تھا۔ مائلؔ نے نظم میں متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

مائلؔ کی شاعری کے تین مجموعے ہیں جن میں ''نورظہور'' اور ''ظہورنور'' دو نعتیہ مجموعے ہیں اور ایک ''تحفہ دکن'' جس میں ہر صنف سخن کے نمونے شامل ہیں۔ آخرالذکر مجموعہ 1897ء میں شائع ہوا۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ہر غزل پر شاعر کی وہ عمر درج ہے جو اس کی

تصنیف کے وقت تھی۔ ''تحفہ دکن'' کے بعد مائل نے چار ہزار شعر کا ایک اور دیوان بھی مدون کیا تھا علاوہ ازیں آخر عمر میں نعتیہ کلام کا بھی اور ایک دیوان مرتب ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر بہت سی غزلیں، مرثیے، رباعیاں، معراج نامے وغیرہ خود شاعر کے ہاتھ سے لکھے ہوئے محفوظ ہیں۔

ان کے کلام کے مطالعے سے ان کی قادر الکلامی اور پر گوئی کا پتہ چلتا ہے۔ دوسری خصوصیت نہایت ہی سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ جو ان کی قدرت کلام کا ثبوت ہے۔ مائل کے کلام میں متعدد غزلیں ایسی بھی نظر آتی ہیں جو غالباً اردو کے مقبول و معروف اساتذہ کی خاص غزلوں کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ شمالی ہند کے اکثر شاعروں اور اہل ذوق مائل کی زبان اور قدرت کلام کے معترف تھے۔ اور ان میں سے بعض تو اپنے کلام پر ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ نواب میر محبوب علی خاں نے ایک مرتبہ داغ سے مائل کی نسبت دریافت فرمایا تھا تو داغ نے جواب دیا کہ ''وہ شاعر تو بہت اچھے ہیں مگر مجھ پر ہمیشہ چوٹ کیا کرتے ہیں''۔

8.3.6 امجد:

امجد حیدر آبادی دور عثمانی کے زبردست اور باکمال صاحب فن صوفی وشاعر تھے۔ سید احمد حسین نام، حکیم الشعراء خطاب اور امجد تخلص تھا۔ امجد کی پیدائش 1303ھ م 1885ء بمقام حیدر آباد میں ہوئی۔ امجد کے والد صوفی سید رحیم علی ابن سید کریم حسین ایک نیک اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ امجد ابھی چالیس دن ہی کے تھے کہ ان کے والد کا اچانک انتقال ہو گیا۔ تعلیم والدہ سے حاصل کی۔ بعد ازاں دکن کی قدیم درسگاہ جامعہ نظامیہ حیدر آباد میں تحصیل علم میں مصروف رہے۔ یہاں انہوں نے چھ سال تک تعلیم حاصل کی۔ وہ ابتداء ہی سے ذہین تھے اور حافظہ بھی تیز تھا۔ جامعہ نظامیہ کے اساتذہ نے امجد کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں اہم حصہ لیا۔ امجد نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان امتیازی حیثیت سے کامیاب کیا۔ امجد کی شادی 18 سال کی عمر میں ہوئی۔ شادی کے بعد انہوں نے ملازمت کے سلسلے میں بنگلور کا سفر کیا اور وہاں وہ مدرس مقرر ہوئے پھر دارالعلوم حیدر آباد میں مدرس کے فرائض انجام دینے کے بعد محکمہ صدر محاسبی میں ملازمت اختیار کی اور 1932ء میں وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔ 1908ء میں رود موسیٰ کی قیامت خیز طغیانی میں نہ صرف ان کا گھر کا سارا مال واسباب تلف ہو گیا بلکہ ان کی والدہ، رفیقہ حیات اور ان کی چار سالہ دختر اعظم النساء سیلاب میں بہہ گئیں۔ اس دردناک حادثے کا امجد کے دل و دماغ پر دیرپا اثر ہوا۔ انہوں نے اپنی نظم ''قیامت صغریٰ'' میں اس المناک واقعہ کی تصویر کشی کی ہے۔ 1961ء کو امجد کا انتقال ہوا اور احاطہ درگاہ شاہ خاموش میں سپرد خاک ہوئے۔

امجد حیدر آبادی نے رباعی گو کی حیثیت سے شہرت پائی۔ 1323ھ میں ان کی سو (100) رباعیاں شائع ہوئیں جن کو حالی، شبلی اور مولوی عزیز مرزا نے بے حد پسند کیا۔ ان کا کلام رسالہ مخزن اور نظام المشائخ میں مسلسل شائع ہوتا رہا۔ انہوں نے دیگر اصناف سخن نثر اور نظم میں بھی گراں قدر تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ امجد کی شعری تصانیف میں ''ریاض امجد'' حصہ اول و دوم، رباعیات امجد حصہ اول، دوم و سوم، خرقۂ امجد اور ''نذر امجد'' اہم ہیں۔

ان کے علاوہ نثری تصانیف میں حج امجد، جمال امجد، حکایات امجد، میاں بیوی کی کہانی، گلستان امجد (ترجمہ گلستان سعدی) ایوب کی کہانی اور پیام امجد وغیرہ اہم ہیں۔ ان کا کلام مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ مثلاً نظم، غزل، رباعی، قطعہ، تضمین وغیرہ۔ لیکن ان کا اصل کارنامہ ان کی رباعیاں ہیں۔

امجد کی رباعیوں کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ وجد آفریں، عام فہم اور سادہ سلیس لفظوں میں بلند اور اعلیٰ ترین خیال پیش کرنے پر دسترس رکھتے

ہیں۔اوراس کے ساتھ ساتھ بدایع لفظی اور معنوی بھی بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں۔اسلوب کی سادگی اس بلا کی ہوتی ہے کہ نظم نثر معلوم ہوتی ہے، جو کمال شاعری ہے۔نازک خیالی اور تاثر، تشبیہات اور استعاروں سے ان کا کلام مملو ہے لیکن یہ اعتدال سے متجاوز نہیں ہیں۔ان کے کلام میں کہیں فلسفہ کی جھلک ہے تو کہیں تصوف کا رنگ، کہیں درد و غم کا سوز و گداز ہے تو کہیں حکیمانہ خیالات تو کہیں پند و نصائح کا بیان۔عام شعرا کی طرح امجدؔ محض شاعر نہیں بلکہ ایک تبلیغی شاعر ہیں، جنھیں شہنشاہ رباعیات کہا جاتا ہے۔وہ اپنے شعری تفکر سے قاری کو چونکا دیتے ہیں۔امجدؔ کی لاثانی رباعیوں میں اخلاقی نکات ہی نہیں انسانیت، روحانی تعلیم اور آیات قرآنی کی طرف بھی بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ان میں ہمہ است کی نیرنگیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

امجدؔ نے صنف رباعی کو چار چاند لگادیے۔وہ پہلے اردو شاعر ہیں جنھوں نے رباعی گو شاعر کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی۔ان کی رباعیوں میں سرمدؔ کا رنگ پایا جاتا ہے۔امجدؔ کی رباعیوں، نظموں اور غزلوں میں تصوف کے اسرار و رموز بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

8.3.7 توفیق:

جلال الدین نام اور توفیقؔ تخلص تھا۔توفیقؔ کے جداعلیٰ حضرت سید علی گجرات کے رہنے والے تھے۔سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں وہ حیدرآباد میں آئے۔توفیقؔ کی ولادت 1282ھ میں حیدرآباد میں ہوئی۔فارسی اور عربی میں مہارت رکھتے تھے۔عروض معانی اور بیان میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔خطاطی سے بخوبی واقف تھے۔مروجہ علوم کے علاوہ توفیقؔ فن طب میں بھی کمال رکھتے تھے اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ہندی سے انھیں بڑی رغبت تھی اس بات کا ثبوت ان کی ٹھمریاں اور مثلثات ہیں۔اپنے والد بزرگوار مولانا سید ابراہیم تصدیقؔ سے تلمذ حاصل کیا تھا۔توفیقؔ کے کلام کا طرز مومنؔ اور غالبؔ کے بہت مشابہ ہے۔توفیقؔ کا وصال 1339ھ میں ہوا۔اردو کے علاوہ ان کا فارسی میں بھی ایک دیوان ہے۔

توفیقؔ نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، مگر ان کا کلام زیادہ تر غزل پر مشتمل ہے۔ان کے کلام میں تصوف کا پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔غزل گو شعراء میں میر دردؔ کو چھوڑ کر تمام اردو شعرا میں توفیقؔ کا کلام اس حوالے سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ان کی مقبول اور بہترین غزلیں وہ ہیں جن میں تصوف کی چاشنی ہے۔اس کی بدولت وہ ایک صاحب فکر شاعر بن گئے تھے ان کے کلام میں جہاں کہیں درد کی کیفیت ہے وہ بھی اخلاقی اصول اور بلند حوصلگی کا نتیجہ ہے۔وہ خیالات کو نئے نئے اسالیب اور اسلوب کے تغیر سے مروجہ موضوعات کو شگفتہ بنانے کے گر سے بخوبی واقف تھے۔اردو شاعری میں توفیقؔ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ان کا کلام خصوصاً غزلیں رنگینی خیال، عاشقانہ مضمون آفرینی، لطف گویائی، شوخی بیان اور حسن ادا کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہیں۔

8.3.8 شادؔ:

کشن پرساد نام اور راجہ بہادر، مہاراجہ بہادر اور یمین السلطنت بہادر، کے۔سی۔ایس آئی، سی۔آئی۔ای، جی۔سی۔ای خطابات اور شاد تخلص تھا۔ان کی ولادت 1846ء اپنے نانا مہاراجہ نریندر پرشاد کے گھر ہوئی۔ان کے والد کا نام مہاراجہ ہری کشن پرشاد بہادر تھا۔ان کے جد امجد مہاراجہ چندولال شاداںؔ نے برسوں دیوانی کی خدمت انجام دی۔وہ آصف جاہ سابع کے مقربین میں تھے۔مہاراجہ نریندر پرشاد لاولد تھے اور شادؔ ہی کو اپنا فرزند سمجھتے تھے۔ان کی تعلیم میں انہوں نے بہت دلچسپی لی اور گھر پر ہی انتظام کیا۔اچھے اچھے جیّد فارسی و عربی داں اساتذہ مقرر کیے گئے۔مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی۔شاد نے نہ صرف عربی، فارسی، انگریزی، تلنگی اور مرہٹی میں مہارت پیدا کی بلکہ خوشنویسی میں یدطولیٰ حاصل کیا اور سپاہیانہ فنون تیراندازی، بنوٹ وغیرہ بھی سیکھے۔شادؔ نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے ہاں ابتدا میں پیشکاری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔پھر مستقل

مدارالمہام بنائے گئے۔ 1330ھ میں اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کی مگر پھر 1345ھ میں صدارت عظمیٰ کی جلیل القدر مسند پر سرفراز ہوئے۔ انگریز حکمران بھی ان کی بلند پایہ شخصیت سے متاثر تھے۔ان کی وفات 1359ھ م 1940ء میں ہوئی۔

مہاراجہ بہادر خوش اخلاقی و مروت میں اپنی آپ نظیر تھے۔ان کی شعراپروری اور ادب نوازی کا چرچا عام تھا اور مطالعہ بہت وسیع تھا۔ان کا ایک نہایت ہی شاندار کتب خانہ تھا جس میں بعض نایاب کتب بھی موجود تھیں۔ان کا دربار ہمیشہ علماء و فضلا سے بھرا رہتا تھا۔مہاراجہ چندولال شاداںؔ کی طرح ان کی سخاوت کا بھی دور دور تک شہرہ تھا وہ بعض شاعروں کو مستقل طور سے تنخواہ دیتے تھے۔ان کے یہاں ماہانہ ایک خاص مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ان میں مقامی و بیرونی شعرا مدعو ہوا کرتے تھے۔شادؔ اردو زبان کے دلدادہ تھے۔حیدرآباد میں اردو کی سرپرستی اور ترقی میں ان کا بھی کافی حصہ رہا ہے۔وہ رسالہ ''دبدبۂ آصفی'' کے نام سے ایک علمی وادبی ماہنانہ بھی ترتیب دیتے تھے۔دوسرا ماہنامہ ''شوکت عثمانی'' اور میر محبوب علی خان آصف سادس کے عہد میں ماہنامہ ''محبوب الکلام'' بھی مرتب کرتے تھے جس میں اکثر شعرائے معاصرین کا کلام شائع ہوتا تھا اور آصف سادس بھی اپنا کلام بغرض اشاعت مرحمت فرماتے تھے۔

شادؔ کی طبعیت طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ابتدا میں وہ رائے بچولال تمکینؔ سے اصلاح سخن لیتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد میر عبدالعلی والاؔ مظفرالدین معلیٰ اور داغؔ دہلوی سے تلمذ حاصل کیا۔آخر میں غفراں مکاں نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور انہیں شاگرد خاص کا لقب عطا ہوا۔اور آخر کار خود ماہر رموز سخن استاد بن گئے تھے۔وہ نہ صرف اردو فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے بلکہ اچھے انشاء پرداز بھی تھے۔ان کے کلام کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثنوی جملہ اصناف سخن موجود ہیں اور نعتیہ کلام میں تو انہوں نے ایک خاص درجہ حاصل کرلیا تھا۔ان کا کلام شاعرانہ محاسن اور فصاحت بلاغت سے مالا مال ہے۔ ان کی شاعری میں نزاکت خیال، لطف زباں، ندرت جذبات اور اثر آفرینی قابل تحسین ہے۔ہندو اوتاروں کی شان میں صوفیانہ نقطہ نظر سے جو نظمیں لکھی گئی ہیں وہ اردو میں ایک جدید اضافہ ہے۔

شادؔ چالیس سے زائد تصانیف کے مصنف و مولف ہیں۔جن میں مجموعہ رباعیات خاص، دواوین، مجموعہ مضامین، ناول، افسانے، سفرنامے اور مذہبی مسائل کی کتابیں وغیرہ شامل ہیں۔یہ تمام تصانیف مختلف عناوین پر لکھی گئی ہیں جن میں سے صرف شاعری سے متعلق تصانیف کے نام درج ذیل ہیں۔

نظم اردو فارسی اور ہندی : باغ شاد، ارمغان زیبا، گلبن تاریخ، نسیم سحر، نذر شاد، صبح امید، مثنوی حسن وعشق، نغمہ شاد، خم کدہ شاد، ترانہ شاد، شگوفہ بہار، رباعیات شاد، آشوب عظیم، نعرۂ مستانہ، بیاض شاد، رین بسیرا، نظم دو بیسہ، رباعیات شاد حصہ دوم، پریم درپن، بزم شاد، رباعیات شاد حصہ سوم۔

8.3.9 صفیؔ:

آصفیہ دور کے آخری بڑے شعرا میں صفیؔ اورنگ آبادی کا شمار ہوتا ہے۔محمد بہاء الدین نام، بہبود علی کے نام سے مشہور اور صفیؔ تخلص تھا اورنگ آباد دکن میں 1310ھ کو تولد ہوئے۔ان کے والد حکیم محمد منیرالدین قادری پیشے سے طبیب تھے جب یہ سات سال کے تھے اپنے والد کے ساتھ حیدرآباد آئے اور دو چار سال گھریلو تعلیم کے بعد مدرسہ نظامیہ میں داخل کیے گئے۔

صفیؔ نے اپنی ابتدائی غزلوں کی اصلاح ضیاءؔ گورگانی، حکیم ظہور احمد دہلوی، عبدالولی فروغؔ اور کیفیؔ سے لی۔صفیؔ اپنے تمام اساتذہ کی نسبت

کیفؔی کی اصلاح کو ترجیح دیتے تھے۔

صفؔی رند مزاج، آزادرو، خاموش، خوددار اور قناعت پسند واقع ہوئے تھے۔انہوں نے کسی اخبار یا رسالے کو اپنی غزل یا نظم اشاعت کے لیے نہیں دی۔ اکثر احباب یا خاص دوست خلاف منشا ان کا کلام شائع کرواتے تھے۔ان کا نظریہ تھا کہ ان کی شاعری بر بنائے ذوق طبعی ہے وہ سوائے سخت اصرار کے کسی مشاعرے میں بھی نہیں جاتے اور نہ کوئی ملازمت اختیار کرتے تھے۔ان کے کلام میں حسن بیان ہے۔ان کا زیادہ تر کلام سہل ممتنع ہے۔تشبیہ اور استعارے کی ندرت بھی پائی جاتی ہے۔

صفؔی کئی دیوان مرتب کر چکے تھے لیکن ان کی زندگی میں کوئی دیوان شائع نہیں ہوا۔ان کی وفات کے بعد ان کے دیوان کا انتخاب پراگندہ کے نام سے شائع ہوا۔اس کے کچھ عرصہ بعد ان کا کلام کلیات صفی کے نام سے شائع ہوا۔انہوں نے اپنے کلام کو غزل گوئی تک محدود رکھا ہے۔ چند قصیدے، رباعیاں اور نظمیں بھی کہیں، لیکن ان کا اصلی میدان تغزل ہے۔

صفؔی نہایت پرگو شاعر تھے اور موزونی طبع کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا ہے جیسے خیالات کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ زبان کی برجستگی وشستگی، اصلیت، خیالات کی ہمواری اور سلاست، صفائی و روانی، کلامِ صفؔی کے وہ جوہر ہیں جو سرسری نظر ہی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ روزمرے اور محاورات کا برمحل استعمال ان کے کلام کی جان ہے۔ان کے شعر اس قدر برجستہ اور بے ساختہ ہوتے ہیں کہ ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ سلاست کا یہ عالم ہے کہ اگر شعر کی نثر کرنا چاہیں تو ممکن نہیں۔شعر میں اس صنعت کا پیدا ہو جانا نہایت مشکل امر ہے۔صفؔی کی طبیعت میں زبان کی سلاست کے ساتھ مضمون آفرینی کا جوہر بھی موجود ہے۔ان کے کلام میں ان کے ذاتی حالات و خیالات کے علاوہ کہیں کہیں اخلاقی مضامین بھی ہیں اور بے نیازی اور استغنا جو اُن کے خاص جوہر ہیں جو ان کے کلام میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔

8.3.10 جلیؔل:

نواب فصاحت جنگ جلیؔل کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ دو آصف جاہی سلاطین (آصف جاہ سادس اور آصف جاہ سابع) کے دربار سے وابستہ رہے اور ''جلیل القدر'' اور فصاحت جنگ بہادر کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔

جلیؔل مانک پوری کی تاریخ پیدائش 1862ء ہے۔ان کے والد عبدالکریم اور دادا عبدالرحیم دونوں حافظ قرآن تھے۔ پہلے قرآن کریم سے تعلیم کی ابتدا کی اور عربی اور فارسی کا درس گھر پر اپنے والد سے لیا۔حصول علم کی لگن انہیں لکھنو لے گئی ۔فرنگی محل میں عربی و فارسی کے علاوہ نحو اور منقولات ومعقولات کا درس لیا اور اس کے بعد مانکپور چلے آئے۔عہد طالب علمی ہی سے جلیؔل شعر موزوں کرنے لگے تھے۔جلیؔل کو امیر مینائؔی سے تلمذ حاصل تھا۔امیر مینائؔی 1900ء کو حیدر آباد پہنچے اور داؔغ کے مہمان ہوئے جلیؔل ان کے ساتھ تھے باریابی کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ امیر مینائی نے مختصر سی علالت کے بعد انتقال کیا۔جلیؔل نے حیدر آباد کو وطن بنالیا مہاراجہ کشن پرشاؔد ضروریات زندگی کی کفالت اور مشورہ سخن بھی کرنے لگے۔ بالآخر قسمت نے یاوری کی اور 16 رشوال 1327ھ کو آصف سادس نے خاطر خواہ تنخواہ مقرر کر دی۔

جلیؔل خانوادہ شاہی کے استاد سخن تھے۔شاہ دکن میر عثمان علی خاں نے معقول مشاہرے کے علاوہ خطاب اور دیگر اعزاز وانعامات سے سرفراز فرمایا۔جلیؔل کا انتقال 1356ھ م 1946ء میں ہوا۔

جلیؔل کا کلام کسی تعریف کا محتاج نہیں ہے۔وہ ایک قادر الکلام اور زود گو شاعر تھے۔ان کے تین دیوان ''تاج سخن''، ''جان سخن'' اور ''روح

سخن‘‘ شائع ہو چکے ہیں۔ان کے علاوہ معراج سخن‘ مدحیہ قصائد‘ سرتاج سخن‘ درباری شاعری کے مجموعے ہیں۔’’تذکیر وتانیث‘‘‘‘، ’’معیار اردو‘‘ ’’اردو کا عروض‘‘ ’’سوانح امیر مینائی‘‘ اور’’ تاریخ دکن‘‘ جلیلؔ کی نثری یادگاریں ہیں۔جلیلؔ کی وفات کے بعد ان کے خطوط ’’مکاتیب جلیل‘‘ کے نام سے شائع ہوئے۔

جلیلؔ نے غزل کے علاوہ قصیدے‘ نعت‘ منقبت‘ تاریخ گوئی‘ سلام اور سہرے میں بھی طبع آزمائی کی ہے،لیکن انہوں نے تغزل سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ان کی غزلیں سادگی و بیساختگی‘ کلاسیکی رچاؤ‘ لطف بیان اور غزلیہ آہنگ کی وجہ سے دلوں کو موہ لیتی ہیں۔زبان کی نرمی اور طرز ادا کی شگفتگی نے جلیلؔ کی غزلوں کو خواص اور عوام میں مقبولیت عطا کی ہے۔جلیلؔ مانکپوری اردو کے وہ خوش گو شاعر ہیں جن پر کلاسیکی شاعری کی روایات کا بڑی حد تک خاتمہ ہوا۔

8.3.11 نظمؔ:

علی حیدر طباطبائی نام۔نظمؔ تخلص نواب حیدر یار جنگ بہادر خطاب تھا۔1270ھ لکھنو میں تولد ہوئے۔منشی منیڈ ولال زآر سے تعلیم حاصل کی۔مُلاّ طاہر نحوی سے عربی کی تعلیم پائی۔شہزادے مرزا کام بخش کی تعلیم کے لیے ان کا تقرر ہوا اور کلکتہ میں قیام رہا۔1305ھ میں جب نواب واجد علی شاہ کا انتقال ہوا تو وہ حیدرآباد آئے۔کتب خانہ آصفیہ کے مہتمم، پھر نظام کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔بعد ازاں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کے رکن بنائے گئے۔شاہی اتالیق یعنی آصف جاہ سابع کے شہزادوں کی تعلیم بھی ان کے ذمہ ہوئی۔1352ھ میں انتقال ہوا۔

نظمؔ طباطبائی فضل وکمال اور شعر وسخن میں مسلم الثبوت استاد تھے۔ان کا کلام معرکتہ الآرا ہے۔روانی اور برجستگی سے ان کے جوش طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔الفاظ کلام میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ان کے قصائد مشہور ہیں ان میں سے زیادہ تر سیرت النبیؐ سے متعلق ہیں۔مثلاً بعثت وفتح مکہ‘ معراج‘ ہجرت‘ غزوۂ بدر وغیرہ۔ان قصائد میں بلاغت‘ تشبیہہ واستعارات کا استعمال جس خوبی سے کیا گیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

انگریزی نظموں کے تراجم بھی مولانا کی ایک خاص چیز ہیں یوں تو انگریزی نظموں کے اکثر وبیشتر ترجمے ہوئے ہیں مگر نظمؔ نے جو کمال اپنے ترجموں میں دکھلایا ہے واقعی وہ ان ہی کا حصّہ ہے۔انہوں نے جس خوبی وعمدگی سے اکثر اعلیٰ درجہ کی نظموں کو بہترین انداز میں اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔نظمؔ نے عربی‘ فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں شرح دیوان غالبؔ‘ تلخیص عروض وقافیہ اور نظموں وغزلوں کے مجموعے ان کی زیست ہی میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر شہرت ومقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ان کے دیوان کا نام ’’صوتِ تغزل‘‘ ہے۔نیچرل شاعری کے اعلیٰ نمونے بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں۔

8.4 دکنی دور کے بعد کے اہم نثر نگار

شعرا کے علاوہ دکنی کے نثر نگاروں نے بھی دکنی زبان میں عظیم الشان دکنی نثری کارنامے اپنی یادگار چھوڑے۔دکنی ادب کے ذخیرے میں منظومات کی طرح متعدد نثری رسائل بھی موجود ہیں۔دکنی کے چند نثر نگاروں کا ذکر سطور ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

8.4.1 ابراہیم بیجاپوری:

ابراہیم بیجاپوری اٹھارہویں صدی کے ربع آخر اور انیسویں صدی کے نصف اوّل کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ابراہیم کا پورا نام محمد ابراہیم

تھا۔ وہ ملک حسین خان کے فرزند تھے اوران کے دادا شیخ محمد بیجاپوری جمعدار دکھنی ہزار سواری تھے۔ نسباً شیخ تھے۔ ابراہیم بیجاپوری کے اسلاف کا وطن بیجاپور تھا۔ وہ مدراس میں قیام پذیر تھے۔ ان کی سال پیدائش، مقام ولادت، سال وفات، جائے وفات اور دیگر سوانحی حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ وہ فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس میں منشی کے عہدے پر فائز تھے۔ انھیں فارسی زبان پر دست رس حاصل تھی۔ فارسی کے ساتھ انھیں عربی میں بھی عبور حاصل تھا۔ علاوہ ازیں انشا پرداز اور سخن ور بھی تھے۔ ''دکھنی انوار سہیلی'' منشی محمد ابراہیم بیجاپوری کی نثری تصنیف ہے۔ انھوں نے مولانا حسین واعظ کاشفی کی فارسی ''انوار سہیلی'' کا دکنی میں ترجمہ کیا۔ جب ترجمہ کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا تو 1824ء میں خاص اہتمام سے فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کے مطبع میں اس کی طباعت عمل میں آئی۔ ابراہیم نے ''انوار سہیلی'' کے دکھنی ترجمے کا نام ''دکھن انجن'' رکھا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس سے جب یہ شائع ہوئی تو سرورق پر اردو اور انگریزی میں ''دکھن انجن'' کی بجائے ''دکھنی انوار سہیلی'' درج تھا۔ اس کا قصہ ہندوستانی الاصل ہے جو ''دکھنی انوار سہیلی'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ قدیم دکنی زبان واسلوب کی ایک بہترین مثال ہے جس میں ٹھیٹھ دکنی محاورے بروئے کار لائے ہیں اس کے لیے انھیں کافی تگ ودو کرنی پڑی۔ ابراہیم بیجاپوری کی یہ تصنیف دکنی نثر میں اہم مقام کی حامل ہے۔

8.4.2 دارالترجمہ شمس الامرا:

شمس الامرا کا نام تیغ جنگ ابوالفتح خان تھا۔ وہ پہلے امیر پائیگاہ نواب ابوالخیر خاں کے لڑکے تھے۔ ان کے خاندان میں چار پشتوں تک شمس الامرا کا خطاب رہا۔ امیران پائیگاہ صاحب سیف وقلم تھے اور شعر وادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے ریاست حیدرآباد اور یہاں کے عوام کی قابل قدر خدمات انجام دیں اور دکن میں اسلامی ومشرقی تہذیب وثقافت کے فروغ وترقی اور علوم وفنون کی نشر واشاعت اوران کی تالیف و تدوین کے باب میں اہم اور تاریخ ساز رول ادا کیا۔ اس عہد میں اردو نثر میں داستانوں اور تاریخی تصانیف کے علاوہ تراجم کے ذریعہ مغربی علوم و فنون کے خزانے اردو زبان میں منتقل کیے گئے۔ نواب محمد فخرالدین خاں امیر کبیر شمس الامراء کی علمی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ نہایت قابل اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اردو زبان کے بہت بڑے مربی ومحسن تھے۔ انھیں ریاضی، انجینئرنگ، علم ہیئت، جغرافیہ اور دوسرے علوم وفنون سے کافی دلچسپی تھی۔ مشرقی علوم کے ساتھ مغربی زبانوں مثلاً انگریزی اور فرانسیسی پر بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔ شمس الامراء نے سب سے پہلے سائنس کی کتابوں کا یوروپی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے کا انتظام کیا۔ اس کام کو منظّم انداز میں انجام دینے کے لیے انھوں نے ایک دارالترجمہ قائم کیا۔ جہاں اہل علم کی ایک جماعت ان کی فرمائش پر تالیف وترجمہ کا کام انجام دیتی تھی۔ اس دارلترجمہ کے ساتھ ایک مطبع بھی قائم کیا گیا۔ جو ''سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء'' کے نام سے موسوم تھا۔ اس مطبع میں تصاویر کے علاوہ لیتھو میں سائنسی آلات کے نقشے چھپتے تھے۔ چھاپا خانے سے خط نسخ میں پچاس سے زائد تصانیف شائع ہوئیں۔ انھوں نے ''مدرسہ فخریہ'' کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ جہاں حدیث، فقہ، صرف ونحو کے علاوہ مغربی علوم (کیمیا، طبعیات، ریاضی، ہیئت وغیرہ) کی کتابیں بھی درس میں شامل تھیں۔ شمس الامراء خود بھی مختلف علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کی علمی تصانیف کے تراجم سے کہیں زیادہ اہمیت ان تراجم کی ہے جو شمس الامراء نے کروائے ہیں۔ اس دارالترجمہ کی کتابوں کی زبان وبیان اور اسلوب پر دکنی اثر غالب نظر آتا ہے۔

8.4.3 محبّ حسین:

مولوی محبّ حسین اٹاوہ کے ایک معزز گھرانے میں 1849ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی سلامت علی ایک علم دوست اور ادب

نواز شخصیت تھے۔محبّ حسین کو بچپن ہی سے ادبی ماحول ملا تھا۔ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت اٹاوہ میں ہی ہوئی اوریہیں ایک مدرسہ میں ملازم ہوئے۔ اپنے ہم وطن مہدی علی خاں محسن الملک کی حیدرآباد میں ترقی وکامرانی کی شہرت سن کر حیدرآباد چلے آئے اور یہاں مختلف محکموں میں بحیثیت مترجم کام کرتے رہے۔مولوی محبّ حسین ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ ادیب تھے،شاعر اور صحافی تھے۔انہوں نے کئی رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔اس کے علاوہ تعلیم نسواں کے زبردست علم بردار بھی تھے۔انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ فرسودہ رسوم کے خلاف آواز اٹھائی۔ دکن میں معاشرتی اصلاح،سماجی شعور،قومی بیداری اور سیاسی بصیرت کو عام کرنے میں ان کا اہم کردار ہے۔حیدرآباد کی صحافتی تاریخ میں بھی وہ ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔مولوی محبّ حسین کی تصانیف میں مسدس توحید، وصال حق، عالم خیال، عالم آخرت،گلزار معرفت،آئینہ سلوک، رقعات محبّ،خطوط محبّ،افکار محبّ اور مثنوی اسرار قرآن وغیرہ شامل ہیں۔جن کے ذریعے سے مسائل تصوف اور توحید کی اشاعت کی کوشش کی۔

8.4.4 صوفی ملکاپوری:

مولوی عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری، ملکاپور(برار) کے باشندے تھے۔صوفی مدرسہ اعزاء حیدرآباد میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے رہے آخر صدر مدرس کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے اور حیدرآباد میں ہی 1924ء میں وفات پائی۔بحیثیت مؤرخ اور تذکرہ نگار اہم مقام رکھتے تھے۔عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری کے مرتبہ تذکروں میں ''تذکرہ شعرائے دکن''(دوجلدیں)''تذکرہ اولیاء دکن''(دوجلدیں) اور''تذکرہ سلاطین دکن'' قابل ذکر ہیں۔ان تذکروں میں جنوبی ہند کے معروف وغیر معروف قدیم شعراء،ادیبوں،علماء اور صوفیاء کی سوانح وتحریروں کے بارے میں اہم معلومات کے علاوہ عہد آصفیہ کے حیدرآباد کی سیاسی،سماجی اور ادبی تاریخ محفوظ ہوگئی ہے۔انھیں دکن کی تاریخ وتہذیب سے بے حد لگاؤ تھا۔ اپنی ساری زندگی انھوں نے تاریخ دکن کی تحقیق میں صرف کردی۔اور دکن کی تہذیب،تاریخ اور زبان وادب کے ذخیرے کو پانچ جلدوں میں محفوظ کردیا۔ان مجلّات کے سلسلہ کو''محبوب التواریخ'' کے نام سے مرتب وطبع کیا۔دکن پر کوئی کتاب ان کی مذکورہ کتابوں سے مدد لیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

8.4.5 شمس اللہ قادری:

حکیم سید شمس اللہ قادری بھی اسی عہد کے ایک معروف مؤلف ومؤرخ اور اعلیٰ پایہ کے محقق تھے۔وہ 1885ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کا بچپن اپنے والد سید ذوالفقار اللہ قادری کے ساتھ مختلف ممالک کی سیر میں بسر ہوا تھا۔نہ تو انہوں نے باقاعدہ تعلیم کسی مکتب میں حاصل کی اور نہ ہی کوئی ملازمت کی بلکہ زندگی بھر علمی وادبی خدمات میں مشغول رہے۔ان کی دلچسپی فارسی، دکنی ادب، انسائیکلوپیڈیا ولغات،مسکوکات، شجرات اور آثار قدیمہ سے تھی۔تاریخ ہند اور تاریخ اسلام پر انھوں نے کئی مضامین ومقالے لکھے جو مختلف مؤقر رسائل وجرائد میں طبع ہوئے۔اس کے علاوہ فارسی اور اردوزبان وادب پر ان کے متعدد علمی،سوانحی،تحقیقی اور ادبی مضامین شائع ہوچکے ہیں۔شمس اللہ قادری کو دکنی زبان وادب اور تحقیق سے خاص شغف تھا۔''اردوئے قدیم'' ان کی بلند پایہ تحقیقی تصنیف ہے جو پہلی دفعہ 1925ء میں اور پھر مزید اضافوں کے ساتھ دوسری بار 1930ء میں طبع ہوئی۔زبان اردو اور اس کی نظم ونثر کی ابتدائی تاریخ خصوصاً دکنی دور سے متعلق پہلی مستند تحقیقی کتاب قرار دی جاتی ہے۔ان کی کم وبیش دو درجن تحقیقی کتابیں آثار قدیمہ،مسکوکات،تاریخ اسلام، فارسی ادب،مشاہیر اور اردو کے قدیم ادب پر شائع ہوچکی ہیں۔وہ ایک سہ ماہی رسالہ''تاریخ'' بھی نکالتے تھے جو لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوا کرتا تھا۔حکیم سید شمس اللہ قادری کو''شمس المؤرخین'' کے خطاب سے سرفراز

کیا گیا تھا۔

8.5 دکنی دور کے بعد صحافت

ریاست حیدرآباد میں اردو صحافت کا آغاز انیسویں صدی کے نصف دوم میں ہوا اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کے اختتام تک حیدرآباد دکن میں اردو صحافت کا سورج نصف النہار تک پہنچنے لگا۔ سقوط ریاست حیدرآباد کے بعد متعدد سماجی، سیاسی اور ثقافتی عوامل کی وجہ سے دکن میں اردو صحافت کا شمس رو بہ زوال ہو گیا۔

مابعد دکنی عہد میں اردو صحافت کے آغاز اور مطبع کے قیام کی تاریخ ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ حیدرآباد کا پہلا مطبع نواب محمد فخر الدین خان امیر کبیر شمس الامراء نے 1834ء میں قائم کیا۔

اگر شمس الامراء کی سائنس سے خصوصاً میڈیکل سائنس سے دلچسپی نہ ہوتی اور وہ تراجم کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو شاید ریاست حیدرآباد کا پہلا طبی رسالہ 1855ء میں وجود میں نہ آتا۔ معیاری مطابع کی کثرت کے علاوہ مابعد دکنی صحافت کے فروغ میں بعض دیگر عوامل کی بھی کارفرمائی رہی جیسے 1886ء میں اردو کو بحیثیت سرکاری زبان قرار دیا جانا، تعلیمی اداروں کی ترقی اور نئے نئے تعلیمی اداروں کا قیام، مدارس کی تعداد کا بڑھنا، تعلیم کی وسعت، کثرت تصنیف و تالیف، 1918ء میں اردو ذریعہ تعلیم کی پہلی یونی ورسٹی "جامعہ عثمانیہ" کا قیام، علمی و ادبی انجمنوں کا قیام۔ ان تمام اداروں کے مجموعی اثر کے نتیجے میں مملکت آصفیہ میں اردو صحافت کو نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ فروغ ہونے لگا۔ چنانچہ ایسے رسائل و اخبارات نکلنے لگے جن کی اہمیت اور افادیت سے آج بھی انکار ممکن نہیں۔ فروغ اردو میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔

8.5.1 اہم رسالے اور اخبارات:

زبان کے فروغ میں رسائل اور اخبارات بھی غیر معمولی مدد کا باعث ہوتے ہیں۔ زبان و ادب کی ترقی میں ان کا اہم رول ہوتا ہے۔ عوام میں فنی، علمی اور ادبی ذوق و شوق پیدا کرنے کے ساتھ ان کی معلومات میں اضافہ اور حالات حاضرہ سے آگاہی کے لیے ریاست حیدرآباد میں کئی رسائل و اخبارات شائع ہونے لگے۔ ان میں سے بعض معیاری و مشہور رسائل و اخبارات کی مختصراً صراحت پیش کی جاتی ہے۔

رسالہ طبابت: ریاست حیدرآباد میں صحافت کی ابتدا ایک علمی یعنی طبی مجلّہ "رسالہ طبابت" سے ہوئی۔ یہ ہندوستان کا بھی پہلا طبی مجلّہ تھا جس کا اجرا ڈاکٹر جارج اسمتھ نے 4/نومبر 1855ء میں عمل میں لایا۔ یہ رسالہ نواب سالار جنگ بہادر مختار الملک کے پریس میں طبع ہوا۔ ابتدا میں اس مجلّہ کے مدیر خود ڈاکٹر جارج اسمتھ تھے بعد میں اس کی ادارت کے فرائض ڈاکٹر فلیمنگ اور ان کے بعد ڈاکٹر پیمبرٹن انجام دینے لگے۔ اس مجلّے میں طب مغربی، طب یونانی اور فن طب سے متعلق مضامین سادہ و سلیس اردو زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیے جاتے تھے۔ اس رسالے کی زبان پر دکنی کا اثر نمایاں تھا۔ رسالہ طبابت کے علاوہ دیگر رسائل و جرائد حسب ذیل ہیں۔

دکن میڈیکل جرنل (طبی رسالہ) سنہ اجرائی اگست 1898ء مدیر آصف جاہ سادس کے خاص معالج محمد حیدر خاں لقمان الدولہ بہادر تھے، ماہنامہ 'المعالج'، ماہنامہ 'حکیم دکن' بھی سابق ریاست حیدرآباد سے نکلنے والے طبی رسائل تھے۔

مخزن الفوائد: یہ سابق ریاست حیدرآباد کا دوسرا لیکن علمی موضوعات کے ساتھ ادبی موضوعات کو شامل کرنے والا پہلا رسالہ تھا جو مئی 1874ء میں عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی ادارت میں جاری ہوا۔

ماہنامہ ''معلم شفیق'' انجمن ''جلسہ خیر خواہ ہند'' حیدر آباد نے 4/نومبر 1880ء کو جاری کیا تھا۔ اس کے مدیر مولوی محبّ حسین تھے۔

ماہنامہ ''رسالہ حسن'' سنہ اجرائی اگست 1888ء مدیر مولوی سید محمد فخر اللہ۔

ماہنامہ ''معلم'' جولائی 1892ء **''معلم نسواں''** نومبر/ڈسمبر 1894ء حیدر آباد دکن، مدیر مولوی محبّ حسین ''معلم نسواں'' حیدر آباد میں خواتین کا پہلا رسالہ تھا۔ ماہنامہ **''رسالہ افسر''** حیدر آباد 1897ء کے مرتب رسالہ نواب میجر افسر الدولہ اور معتمد محبّ حسین تھے۔ جنوری 1900ء سے مولوی عبدالحق کی ادارت میں نکلنے لگا۔

رسالہ ''دبدبۂ آصفی'' سنہ اجرائی ستمبر 1897ء بانی مہاراجہ کشن پرشاد، مدیر پنڈت رتن ناتھ سرشار۔

افسانہ/ افسانہ دکن ریویو/ دکن ریویو: رسالہ افسانہ جولائی 1902ء، زیر سرپرستی راجہ سرکشن پرشاد حیدر آباد دکن سے جاری ہوا اس کے مالک و ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں۔ 1940ء میں اس رسالے کو ''دکن ریویو'' میں ضم کر دیا جس کا نام ''افسانہ دکن ریویو'' رکھا گیا۔ جنوری 1905ء سے اس رسالے کا نام صرف ''دکن ریویو'' تجویز کیا گیا۔

ماہنامہ ''رسالہ تاج'': جنوری 1914ء حیدر آباد دکن، شروع میں اس کے ایڈیٹر ابوالوفا غلام محمد انصاری وفا اور شیش راؤ بی اے تھے۔ مارچ 1914ء سے صرف ابولوفا غلام محمد انصاری وفا مدیر رہے۔

ماہنامہ ''مجلّہ مکتبہ'': اپریل 1928ء انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن، مدیر محمد عبدالقادر سروری، یہ ایک اہم اور معیاری علمی و ادبی رسالہ تھا۔

رسالہ ''تاریخ'': سہ ماہی جنوری 1929ء کوٹلہ اکبر جاہ حیدر آباد دکن، مدیر مولوی حکیم سید شمس اللہ قادری، یہ تاریخ اور آثار قدیمہ کے موضوع پر اردو کا واحد رسالہ تھا۔

''مجلّہ عثمانیہ'': سہ ماہی فروری 1927ء جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن، مجلس نگران اور تین طلبہ مدیران، ان میں دو اردو کے لیے اور ایک انگریزی کے لیے اس میں اردو اور انگریزی زبانوں میں علمی مضامین ہوتے تھے۔

رسالہ ''اردو'': سہ ماہی جنوری 1921ء اورنگ آباد دکن، مدیر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو کا ترجمان تھا۔ یہ خالص ادبی رسالہ تھا۔ اس میں زبان و ادب کے کا نہایت معیاری مقالے شائع ہوتے تھے۔

مجلّہ طیلسانین: سہ ماہی جنوری 1937ء، مجلس علمیہ طیلسانین حیدر آباد دکن مجلس ادارت میں ڈاکٹر زور (صدر)، اراکین میں عبدالمجید صدیقی، غلام دستگیر رشید، سید محمد معتمد اور منتظم اعزازی سید مہدی حسین تھے۔

رسالہ ''سب رس'': مصور ماہنامہ 1938ء، زیر نگرانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ خیریت آباد، حیدر آباد دکن، ابتدا میں اس کے مدیر صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش تھے مگر دوسرے سال 1939 میں ایک مجلس ادارت بنائی گئی جس میں میکش کے علاوہ خواجہ حمید الدین شاہد، سکینہ بیگم اور معین الدین احمد انصاری تھے اور نگران ڈاکٹر زور ہی تھے۔ انصاری صاحب بچوں کے مضامین اور سکینہ بیگم خواتین کے مضامین کی نگران کار تھیں۔ یہ ایک بہت ہی اہم علمی و ادبی اور تحقیقی رسالہ ہے جو ابھی تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد کا ترجمان ہے۔ اردو رسائل کی تاریخ میں ''سب رس'' وہ واحد رسالہ ہے جس نے نہ صرف اپنے معیار کو بلند رکھا بلکہ گزشتہ 84 سال سے برابر اشاعت پذیر ہے۔

رسالہ ''سیاست'': سہ ماہی جنوری 1904ء زیرادارت ڈاکٹر یوسف حسین خاں شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، خالص علمی رسالہ۔

رسالہ ''الموسیٰ'': سہ ماہی 1933ء سٹی کالج حیدرآباد دکن کی ادبی مجلس ''بزم ادب'' نے جاری کیا۔ اس کے نگران پروفیسر سید محمد اور مدیر طلبہ میں سے کوئی ہوا کرتے تھے۔

مجموعہ تحقیقات علمیہ: سالنامہ، خالص تحقیقی رسالہ اجرائی 1933ء مجلس تحقیقات علمیہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، ابتدا میں اس کی مجلس ادارت میں محمد عبدالرحمٰن خان، مولوی عبدالحق اور سید عبداللطیف شامل تھے۔

مذکورہ بالا رسائل کے علاوہ حیدرآباد سے قانون، زراعت، تعلیم و تدریس، خواتین، اطفال سے متعلق رسائل و نیز مختلف تعلیمی اداروں کے رسائل اور گلدستے بھی جاری کیے گئے۔ علمی رسائل میں تعلیمی و تدریسی رسائل کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ حیدرآباد میں عہد محبوبیہ سے تعلیمی و تدریسی رسائل کی ابتدا ہوئی۔

جس طرح ہندوستان میں مطبوعہ صحافت کا آغاز انگریزی زبان سے ہوا اسی طرح حیدرآباد میں بھی انگریزی زبان میں ہوا۔ ہندوستان میں اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ہے جو 27/مارچ 1822ء کو کلکتہ سے جاری ہوا۔ حیدرآباد کا پہلا اخبار ''دکن ٹائمز'' ہے جو 1864ء میں عبدالقادر نے سکندرآباد سے جاری کیا تھا۔ ذیل میں مملکت آصفیہ کے اوّلین اخبارات کا تعارف کرایا گیا ہے:

شوکت الاسلام: اس ہفتہ وار اخبار کے مالک اور ایڈیٹر حاجی محمد قاسم کرتان تاجر چھاؤنی سکندرآباد تھے۔ یہ اخبار 4 جولائی 1882ء کو سکرار پیٹ پونا سے جاری ہوا۔ پھر یہ مطبع مجیدی بمبئی سے آخر میں محلّہ بیگم گنج کوچہ ناصر بیگ حیدرآباد دکن سے شائع ہونے لگا۔

ہزارداستان: یہ اخبار 5/اپریل 1883ء کو جاری ہوا۔ مطبع ہزارداستان میں طبع ہوکر حمام باؤلی دارالشفاء حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے مالک سید احمد زید بلگرامی اور مہتمم سید حسن بلگرامی تھے۔ ایڈیٹر غالبؔ کے شاگرد مولوی محمد سلطان عاقل تھے۔

پیک آصفی: یہ روزنامہ ''ہزارداستان'' ہی کا زنجیرہ تھا۔ یکم جنوری 1884ء کو جاری ہوا۔ اس کا مطبع اور مالکین وہی تھے جو ہزارداستان کے تھے یہ اخبار حیدرآباد دکن کا پہلا اردو روزنامہ تھا۔

مشیر دکن: ابتدا میں اسے پنڈت کشن راؤ نے ''دکن پنچ'' کے نام سے فروری 1887ء میں بہ طور ہفتہ وار جاری کیا۔ مارچ 1892ء میں اسے ''مشیر دکن'' کے نام سے جاری کیا۔ یہ شروع میں ہفتہ وار لیکن 22/اپریل 1897ء سے روزنامے میں تبدیل ہوگیا۔

سفیر دکن: یہ اخبار 1888ء میں چادر گھاٹ رزیڈنسی حیدرآباد دکن سے جاری ہوا۔ اس کے مالک مولوی محمد ذکی الدین تھے اور مدیر سید امجد علی اشہری۔

علم و عمل: یہ روزنامہ 6/جون 1904ء کو مولوی صادق حسین نے جاری کیا۔ یہ اخبار مطبع نورافشاں حیدرآباد میں طبع ہوتا تھا۔ مدیر مولوی محبّ حسین تھے۔

صحیفہ: حیدرآباد کا یہ اہم اخبار ابتدا میں دوبار ماہنامے کی شکل میں جاری ہوا۔ لیکن 1912ء میں تیسری مرتبہ روزنامہ کی شکل میں شائع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی اکبر علی تھے۔

رہبر دکن: اس کا شمار مملکت آصفیہ کے اہم اخباروں میں ہوتا تھا۔ یہ اخبار یکم اگست 1921ء کو افضل گنج حیدرآباد سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سید احمد محی الدین تھے۔

نظام گزٹ: یہ ایک اعتدال پسند ہفتہ وار اخبار تھا، جسے یکم رجب 1927ء کو سید عبدالقادر تاجر کتب نے جاری کیا۔ یہ ہر دوشنبے کو دفتر نظام گزٹ اسٹیشن روڈ، ناملی، حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا۔ ابتدا میں اس کے دو مدیر تھے ایک سید وقار احمد اور دوسرے محمد حبیب اللہ رشدی، کچھ عرصہ بعد سید وقار احمد نے ادارت کی ذمہ داری سنبھال لی اور اسے سہ روزہ کر دیا۔

رعیت: یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا جسے نرسنگ راؤ نے 3/نومبر 1927ء کو محلّہ ترپ بازار، حیدرآباد دکن سے جاری کیا تھا۔

صبح دکن: یہ روزنامہ 28/اگست 1928ء کو مولوی احمد عارف اور مولوی علی اشرف کی ادارت میں محلّہ معظم شاہی حیدرآباد سے جاری ہوا۔

پیام: مدیر قاضی عبدالغفار نے 1935ء میں اس کا اجرا عمل میں لایا۔ یہ حیدرآباد کا ایک منفرد اردو اخبار تھا۔ قاضی عبدالغفار نے حیدرآباد کی اردو صحافت کو انگریزی صحافت کے اسالیب و معیارات سے ہم آہنگ کیا۔

میزان: 1943ء میں روزنامہ ''میزان'' حیدرآباد کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کے مالک غلام محمد کلکتہ والا نہایت مالدار تاجر تھے۔ ایڈیٹر حبیب اللہ اوج۔ حیدرآباد کی صحافتی تاریخ میں اس کی اہمیت اس لیے ہے کہ بیک وقت تین زبانوں اردو، تلگو اور انگریزی میں اس کے ایڈیشن نکلتے تھے۔

محولہ بالا اخبارات کے علاوہ حیدرآباد سے متعدد روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات جاری ہوئے لیکن یہاں صرف منتخب اخبارات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں آصفیہ دور خصوصاً اس مملکت کے آخری دو فرمانرواؤں یعنی میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس اور میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے دور حکومت کو مملکت حیدرآباد کی ہمہ گیر و ہمہ جہت ترقی خصوصاً اردو زبان کی اشاعت اور اردو صحافت کے فروغ کا سنہری عہد کہا جا سکتا ہے۔

8.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ آصفیہ دور کے آغاز ہی سے دکن میں اردو شعر و ادب کا بڑا چرچا تھا۔ اس کے پیچھے قطب شاہی دور کی شاندار ادبی روایات کارفرما تھیں۔

☆ دکن میں سلطنت آصفیہ کا قیام 1724ء میں عمل میں آیا۔ اس سلطنت کے بانی نواب میر قمر الدین خان نظام الملک آصف جاہ اول نے اورنگ آباد کو اپنا پایہ تخت قرار دیا لیکن بعد میں نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں (1148ھ/1768ء) میں پایہ تخت سلطنت کو اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کیا تو علمی چہل پہل اور شعر و سخن کی سرگرمیاں بھی یہیں منتقل ہو گئیں۔

☆ نواب میر محبوب علی خاں کا ایک عہد ساز کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے 1301ھ میں اپنی سلطنت میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا جس کی وجہ سے اردو زبان شعر و ادب کی زبان سے آگے بڑھ کر دفتری اور کاروباری زبان بن گئی۔

☆ اسی طرح آصف جاہی خاندان کے آخری فرمانروا میر عثمان علی خاں کے عہد میں اردو زبان کی پہلی یونیورسٹی ''جامعہ عثمانیہ'' کا قیام عمل میں آیا جس کی بدولت اردو علوم و فنون کی زبان بھی بن گئی۔

☆ آصفیہ دور کے آغاز ہی سے دکن میں اردو شعر و سخن کا بڑا چرچا تھا۔ اس کے پیچھے قطب شاہی دور کی طویل اور شاندار ادبی روایات کارفرما تھیں ۔ آصف جاہی سلطنت کے قیام کے بعد اس روایت کی توسیع ہوئی اور دکن میں بے شمار خوش فکر و خوش نغز شاعر پیدا ہوئے جن کی تفصیل ضخیم دفتر کی متقاضی ہے۔

8.7 کلیدی الفاظ

الفاظ		معنی
کفیل	:	ضامن، ذمہ دار
اتالیق	:	استاد، تربیت سکھانے والا
ضامن	:	ذمہ دار
فی البدیہہ	:	بے سوچے، فی الفور
نغز	:	عمدہ، اعلیٰ
متقاضی	:	تقاضہ کرنے والا، طلب کرنے والا
مخیّر	:	نہایت خیرات کرنے والا
داد و دہش	:	فیاضی، سخاوت
ملجا و ماویٰ	:	پناہ ملنے کی جگہ، پشت پناہ
مدارالمہام	:	وہ شخص جس پر امور سلطنت کا دار و مدار ہو، وزیر اعظم
بدرجہ اتم	:	مکمل درجے کا
مقربین	:	مقرب کی جمع، خاص دوست، مصاحب
معرکۃ الآرا	:	زبردست، زور آور
تادم زیست	:	زندگی کی آخری سانس تک، عمر بھر
مطبع	:	چھاپہ خانہ، پریس
مسکوکات	:	سرکاری سکوں سے متعلق
رو بہ زوال	:	زوال پذیر، انحطاط کی جانب مائل
اسالیب	:	اسلوب کی جمع، طور طریقے

8.8 نمونہ امتحانی سوالات

8.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ کس آصف جاہی حکمراں کے عہد میں اردو زبان کی پہلی یونی ورسٹی ''جامعہ عثمانیہ'' کا قیام عمل میں آیا؟

2۔ رسالہ ''سب رس'' کا اجرا کب عمل میں آیا؟

3۔ چندؔا کا خطاب کیا تھا؟

4۔ فیضؔ کے کلام کے پہلے مجموعہ کا نام کیا ہے؟

5۔ جلیلؔ مانک پوری کن آصف جاہی سلاطین کے دربار سے وابستہ رہے؟

6۔ ''صوت تغزل'' کس شاعر کے دیوان کا نام ہے؟

7۔ ''معلم'' اور ''معلم نسواں'' کے مدیر کون تھے؟

8۔ دکنی دور سے متعلق پہلی مستند تحقیقی کتاب اور اس کے مولف کا نام بتائیے۔

9۔ حیدرآباد کا پہلا مطبع کب اور کس نے قائم کیا؟

10۔ مملکت آصفیہ کے پہلے روزنامے کا نام بتائیے۔

8.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نواب میر محبوب علی خان کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ امجدؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات قلم بند کیجیے۔

3۔ ''انوار سہیلی'' کس کی تصنیف ہے اور اس تصنیف کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں لکھیے۔

4۔ کسی دو رسائل پر اپنے خیالات بیان کیجیے۔

5۔ اردو زبان کی ترقی اور فروغ میں آصف جاہی حکمرانوں کے کارناموں پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

8.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مابعد دکنی ادب شعرا پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

2۔ عہد آصفیہ کی صحافتی خدمات بیان کیجیے۔

3۔ مابعد دکنی ادب نثر نگاروں کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی
2۔ تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر جمیل جالبی
3۔ داستان وادب، حیدرآباد	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ
4۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

بلاک III: دکنی شاعری کا مطالعہ

اکائی 9 : مثنوی ''گلشن عشق''

(نصرتی کا تعارف اور مثنوی نگاری کی خصوصیات)

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید
9.1 مقاصد
9.2 نصرتی کا عہد
9.3 نصرتی کے حالاتِ زندگی
9.4 مثنوی گلشنِ عشق کا قصہ
9.5 مثنوی گلشنِ عشق کے قصے کا ماخذ
9.6 منتخب اشعار
9.7 نصرتی کی مثنوی نگاری
9.8 مثنوی گلشن عشق کا مطالعہ
9.8.1 اسلوب
9.8.2 کردار نگاری
9.8.3 جذبات نگاری
9.8.4 منظر نگاری
9.8.5 فوق فطری عناصر
9.8.6 مکالمہ نگاری
9.8.7 تہذیبی عناصر
9.9 اکتسابی نتائج
9.10 کلیدی الفاظ

9.11 نمونہ امتحانی سوالات

9.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

9.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

9.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

9.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

نصرتی عادل شاہی عہد کا مشہور ومعروف قادرالکلام شاعر ہے۔اس نے 'گلشنِ عشق' 'علی نامہ' اور' تاریخِ اسکندری' جیسی مثنویاں لکھیں۔ 'گلشنِ عشق' نصرتی کی لکھی بزمیہ مثنوی ہے۔اس مثنوی میں منوہر اور مدمالتی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔اسلوبِ بیان، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری اور تہذیبی عناصر سے مالا مال مثنوی 'گلشنِ عشق' دکنی ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔اگلے سطور میں ہم مثنوی 'گلشنِ عشق' کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

☆ نصرتی کے عہد اور اس کے حالاتِ زندگی بیان کرسکیں۔

☆ نصرتی کی مثنوی نگاری کی خصوصیات واضح کرسکیں۔

☆ مثنوی 'گلشنِ عشق' کی خوبیوں پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ مثنوی 'گلشنِ عشق' کا تجزیہ کرسکیں۔

9.2 نصرتی کا عہد

نصرتی کا تعلق بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت سے ہے۔بہمنی سلطنت کے زوال اور اس کے پانچ حصوں میں تقسیم کے بعد وجود میں آنے والی عادل شاہی سلطنت دکن کی سب سے زیادہ مشہور ومعروف ریاست تھی۔بانیٔ سلطنت یوسف عادل خاں سلطنتِ عثمانیہ کا شہزادہ تھا۔محمد شاہ بہمنی کے دور میں ایران سے ہوتا ہوا دکن پہنچا اور اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر بہمنی دربار تک رسائی حاصل کرلی۔محمد شاہ بہمنی کے بعد محمود شاہ بہمنی تخت نشین ہوا تو یوسف عادل شاہ کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اسے 'مجلس رفیع وملک الشرق' کے خطابات سے نوازا۔اپنی خوبیوں اور اوصاف کی بدولت یوسف عادل شاہ ترقی کرتا رہا۔یہاں تک کہ 1485ء میں اسے عادل خاں کے خطاب سے نواز کر صوبۂ بیجاپور کا حاکم بنایا گیا۔بہمنی سلطنت روبہ زوال ہونے لگی تو دیگر صوبہ داروں کی طرح یوسف عادل خان نے بھی اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا اور 1490ء میں عادل شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔یہ دکن کی ایک وسیع سلطنت تھی۔بیجاپور اس کا پایہ تخت تھا۔یوسف عادل خاں ایک قابل سپہ سالار و بہتر منتظم ہی نہیں تھا بلکہ ایک علم دوست اور علما پرور حکمراں بھی تھا۔ریاست کے استحکام کے بعد اس نے اپنے دربار کو علما اور فضلا سے سجائے رکھا۔خود بھی فارسی میں شعر کہتا تھا۔اس کے بعد آنے والے بادشاہوں نے بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنے دربار میں علما ادبا اور شعرا کی قدر ومنزلت اور سرپرستی کا سلسلہ جاری رکھا۔اس خاندان میں جملہ نو با

دشاہ ہوئے۔ عادل شاہی سلاطین فنونِ لطیفہ کے دلدادہ تھے۔انہوں نے قلعے، برج، فصیلیں، بے شمار مقبرے، مسجدیں، محلات، سرائے تعمیر کیں۔ مشہور توپ ملک میدان جو دنیا کی سب سے بڑی توپ ہے۔ بیجا پور میں موجود ہے۔ساتھ ہی موسیقی، مصوری اور ادب کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی۔ بادشاہ علی عادل شاہ اول علم و ہنر کا قدر دان تھا۔اس نے بیجا پور کا قلعہ، جامع مسجد، آب رسانی کی نہریں اور کئی خوبصورت عمارتیں تعمیر کروائیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی دکنی کا اچھا شاعر تھا۔جگت گرو کے نام سے مشہور ہوا۔اس نے مختلف راگ راگنیوں پر مبنی گیتوں کا مجموعہ ''کتاب نورس'' تصنیف کیا۔ابراہیم عادل شاہ کا مقبرہ جو ابراہیم روضہ کے نام سے مشہور ہے۔تاج محل کے بعد دنیا کی سب سے خوب صورت عمارت مانی جاتی ہے۔محمد عادل شاہ علم دوست بادشاہ تھا۔اس کے عہد میں فارسی کے کئی ادب پاروں کے دکنی میں ترجمے ہوئے۔سلطان محمد عادل شاہ کا مقبرہ بیجا پور میں گول گنبد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عظیم الشان گنبد سارے عالم میں اپنی مثال آپ ہے۔محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان جو گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کی شہزادی تھی، بڑی علم دوست خاتون تھیں۔وہ فارسی کے شعرا کے ساتھ ساتھ مقامی زبان دکنی کے شعراء کی بھی سرپرستی کیا کرتی تھیں۔عادل شاہی سلطنت کا آٹھواں حکمران سلطان علی عادل شاہ ثانی ایک قادرالکلام بادشاہ تھا۔شاہی اس کا تخلص تھا۔اپنی علم دوستی اور ادب نوازی کی وجہہ سے استادِ عالم کہلاتا تھا۔دکنی میں اس کی کلیات موجود ہے۔علی عادل شاہ ثانی کے دور میں شعر وسخن کا گھر گھر چرچہ تھا۔

شاہوں کی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی اور ادب نوازی کی وجہہ سے دکنی کے کئی شعراء ان کے دربار سے وابستہ تھے تو کئی شعرا دربار سے دور رہ کر دادِ تحسین حاصل کر رہے تھے۔عبدل، مقیم، مقیمی، صنعتی، رستمی، شوقی، ملک خوشنود، ہاشمی، بحری وغیرہ عادل شاہی عہد کے اہم شعرا ہیں۔عادل شاہی عہد دکنی ادب کا عہدِ زرین ہے۔عادل شاہی خاندان نے قریباً دوسو سال تک شاندار طریقے سے حکمرانی کی۔اس کے بعد سلطنت کے نویں سلطان سکندر عادل شاہ کے عہد میں 1686ء میں مغلوں کے ہاتھوں اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔شاعر نصرتی کا تعلق دکنی ادب کے اسی عہدِ زرین سے ہے۔جس نے گلشنِ عشق جیسی عشقیہ مثنوی لکھ کر اپنا نام ادب کی تاریخ میں روشن کیا۔

9.3 نصرتی کے حالاتِ زندگی

نصرتی کا پورا نام شیخ نصرت اور تخلص نصرتی ہے۔ والد کا نام شیخ مخدوم، اور دادا کا نام شیخ ملک تھا۔وہ محمد عادل شاہ کے عہد میں بیجا پور میں پیدا ہوا۔نصرتی کے آبا و اجداد فنِ سپہ گری سے وابستہ تھے۔نصرتی کے والد شیخ مخدوم شاہی سلحدار اور بیجا پور کی ایک ذی عزت اور مقتدر شخصیت تھے۔مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے نصرتی کو برہمن بتایا ہے۔مولوی عبدالحق گارساں دتاسی کے اس بیان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' گارساں دتاسی نے گلشنِ عشق کے ایک قلمی نسخے کی سند پر جو کانجی ورم میں لکھا گیا تھا اسے برہمن بتایا ہے۔یہ بیان بھی مبہم ہے اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خود کتاب میں اس قسم کا کوئی اشارہ ہے یا کاتب نے آخر میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔اس کتاب کے متعدد نسخے میری نظر سے گذرے ہیں۔ان میں کہیں اشارتاً بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے، جس سے یہ استنباط کیا جائے کہ نصرتی برہمن تھا بلکہ خود نصرتی نے اپنے متعلق گلشنِ عشق میں ایک آدھ جگہ جو سرسری ساذکر کیا ہے اس سے اس قول کی تردید ہوتی ہے حضرت بندہ نواز گیسودراز کی مدح میں لکھتے لکھتے ایک شعر یہ لکھا ہے۔

بحمداللہ کرسی بہ کرسی مری
چلی آئی ہے بندگی میں تیری

''یہاں کرسی سے مراد پیڑھی یا پشت ہے یعنی میں پشت در پشت یا نسلاً بعد نسل تیری بندگی میں ہوں،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے باپ دادا مسلمان تھے۔'' (نصرتی، مولوی عبدالحق، ص 10)

مثنوی ''گلشنِ عشق''، میں نصرتی لکھتا ہے کہ اس کے والد نے اس کی تربیت میں کوئی کمی نہ کی۔ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ اپنے وقت کے مشہور علماء سے تعلیم دلوائی۔ والد اور اساتذہ کی تربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ نصرتی کی علمیت کا شہرہ ہر جگہ ہونے لگا۔ علومِ متداولہ میں اس نے ایسا کمال حاصل کیا کہ لوگ اسے ملا نصرتی اور میاں نصرتی کہنے لگے۔

کہ تھا مج پدر سو شجاعت مآب ۔۔۔ قدیم یک سلحدار جمع رکاب
وہ شہ کام پر زندگانی منے ۔۔۔ کمر بستہ تھا جاں فشانی منے
بچا نے جنم آپنا نیک نام ۔۔۔ اپس زندگی میں کیا خوب کام
ادک تھیچ لگ مج میں نھنوادگی ۔۔۔ مرے حق میں اندیش استادگی
نظر دھر کے مج تربیت میں سدا ۔۔۔ رکھا نیں کدھیں مج اپس سے جدا
سکچ مج تے جانے کو نسدن منے ۔۔۔ پھرے لے بزرگاں کی مجلس منے
معلم جو میرے جتے خاص تھے ۔۔۔ دھرنہار وہ مج پہ اخلاص تھے
نجانے سبق کوئی مرا بار دل ۔۔۔ دھرنہار تھے یار ہور پیار دل
کچ یک میں سنبھالیا جب اپنا شعور ۔۔۔ کیا کرکتاباں پہ اکثر عبور
نجھایا ہر یک طرح کا پھول بن ۔۔۔ رکھیا دل میں تس باغباناں کے فن
یہی مج پہ معشوق ہو شوق تھا ۔۔۔ اسی کے نظارے میں نت ذوق تھا
مرے سر یو دولت جب آنے منگی ۔۔۔ سودے جگ میں شہرت دکھانے منگی

بیجاپور کے بڑے بڑے علماء جیسے قاضی کریم اللہ شاہ ابوالمعالی، سید کریم اللہ اور تاریخ عادل شاہی کے مصنف نوراللہ نصرتی کے رفقاء میں شامل تھے۔ نصرتی عادل شاہی سلطنت کے آٹھویں سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی کا مصاحبِ خاص تھا۔ اسے ولی عہدی کے زمانے سے اس کی ہم نشینی و صحبت حاصل تھی۔ جب علی عادل شاہ ثانی تخت نشیں ہوا تو اس نے نصرتی کو شاہی دربار میں جگہ دی اور ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا۔

نصرتی کے بھائی شیخ منصور اور شیخ عبدالرحمٰن ہیں۔ شیخ منصور علم دعوات میں کمال رکھتے تھے تو شیخ عبدالرحمٰن سپہ گری میں یکتا تھے۔ یہ تینوں بھائی اپنے اپنے فن میں بے مثال تھے۔ نصرتی کا انتقال 1674ء میں ہوا۔ نصرتی کی موت طبعی نہیں ہوئی بلکہ اسے قتل کر دیا گیا۔ نصرتی کے حاسدوں نے جو نصرتی کی علمیت اور اس کی شہرت کے آگے خود کو کمتر محسوس کر رہے تھے۔ سازش کر کے نصرتی کو قتل کروا دیا۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ نصرتی سکندر عادل شاہ کے زمانے میں شہید ہوا۔ اس کی وفات کا قطعہ تاریخ یہ ہے۔

ضرب شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ ۔۔۔ جا کے جنت میں خوش ہور ہے
سال تاریخ آملائک نے ۔۔۔ یوں کہے ''نصرتی شہید اہے''

''نصرتی شہید اہے'' سے نصرتی سنہ وفات 1085ھ مطابق 1674ء نکلتا ہے۔ نگینہ باغ بیجاپور میں نصرتی کی آخری آرام گاہ موجود ہے۔

نصرتی نے مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، مخمس، چہرخیات وغیرہ تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔

'گلشنِ عشق'، 'علی نامہ' اور 'تاریخ اسکندری'، اس کی لکھی مثنویاں ہیں جو دکنی ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ 'علی نامہ' اور 'تاریخِ اسکندری' رزمیہ مثنویاں ہیں تو 'گلشنِ عشق' بزمیہ وعشقیہ مثنوی ہے۔

9.4 مثنوی گلشنِ عشق کا قصہ

مثنوی گلشن عشق کا قصہ اس طرح ہے کہ کنگ گیر کا راجا بکرم بڑا ہی نیک، رحم دل اور بہادر بادشاہ تھا۔ مگر اس کے کوئی اولاد نہ تھی اور یہ غم اسے ہمیشہ ستائے رہتا تھا۔ ایک دن راجا کھانا کھانے بیٹھا ہی تھا کہ ایک فقیر نے آکر دروازے پر صدا لگائی۔ راجا نے اپنے کھانے کا برتن اٹھا کر اس کے آگے رکھ دیا۔ فقیر نے کھانا لینے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ میں بانجھ کے گھر کا کھانا نہیں کھاتا۔ فقیر کی باتیں سن کر راجا غمگین ہو گیا اور سلطنت کے کسی بھی کام اس کا دل نہیں لگنے لگا۔ مگر رانی اسے دلاسہ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ غمگین نہ ہوں بلکہ فقیر کو ڈھونڈیں اور اس کی دعائیں لیں۔ راجا فقیر کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ بڑی مشکلوں کے بعد پریوں کی مدد سے وہ فقیر کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ فقیر راجا کو ایک پھل دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ پھل رانی کو کھلائے۔ رانی فقیر کے دیے پھل کو کھاتی ہے اور نو ماہ بعد اس کے یہاں چاند سا بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ شہزادہ کی پیدائش پر کنگ گیر میں دل کھول کر خوشیاں منائیں جاتی ہیں۔ نجومی شہزادہ کا نام منوہر تجویز کرتے ہیں اور زائچہ دیکھ کر اس کی قسمت کا حال معلوم کر کے کہتے ہیں کہ شہزادہ تو بہت خوش نصیب ہے۔ مگر چودہ برس کی عمر میں اس پر مصیبت آئے گی۔ لیکن اس مصیبت سے وہ صحیح وسالم نکل آئے گا۔ غرض شہزادہ کی پرورش بڑے ناز ونعم میں ہونے لگی۔ شہزادہ چودہ برس کا ہوا تو سب نے یہ سمجھا کہ شہزادہ پر جو مصیبت کی گھڑی تھی وہ ٹل گئی۔ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا تھا۔ مصیبت کی گھڑی ابھی ٹلی نہیں تھی۔ شہزادہ چاندی رات میں کھلے آسمان کے نیچے سو رہا تھا کہ نو پریاں آسمان کی سیر کرتی نکلیں اور محل کی خوبصورتی دیکھ کر نیچے اتر آئیں اس وقت شہزادہ پلنگ پر محوخواب تھا۔ پریاں اس کے حسن وجمال کو دیکھ کر سُدبُد گنوا بیٹھیں اور آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگیں کہ اس جیسا حسین نوجوان اس جہاں میں کہیں نہیں ہے۔ ویسے تو اسے حسینائیں بہت مل جائیں گی لیکن اس کا جوڑ اس دنیا میں کہیں نہیں ملے گی۔ پریوں کی باتیں سن کر سب سے چھوٹی پری کہنے لگی کہ اسے اس کا جوڑ کیوں نہیں ملے گا۔ خدا نے جب انسان کو بنایا اسی وقت اس کا جوڑ بھی پیدا کیا۔ کیا تم سب خدا کی قدرت کو بھول گئیں۔ اس حسین کا جوڑ کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ چھوٹی پری کی باتیں سن کر پریوں نے منوہر کا جوڑ تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور نو پریاں نوکھنڈ کی جانب نکل پڑیں۔ نکلنے سے پہلے آپس میں انہوں نے عہد کیا کہ جوڑ دیکھنے کے بعد سب واپس اسی محل میں ملیں گی۔ ساری پریاں تلاش کے بعد واپس محل آگئیں۔ مگر سب سے چھوٹی پری واپس نہیں آئی۔ پریاں چھوٹی پری کا انتظار کرنے لگیں۔ اتنے میں چھوٹی پری محل میں داخل ہوئی۔ آٹھوں پریوں نے اپنی ناکامی ظاہر کی، لیکن چھوٹی پری کہنے لگی کہ سمندر پار مہارس نگر کے راجا دھرم راج کی بیٹی مدمالتی نہایت حسین ہے۔ دونوں کا جوڑ بہت ہی موزوں ہے۔ پریوں کو مہارس نگر جانے اور مدمالتی کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ انہوں نے مہارس نگر جا کر مدمالتی کو دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ جاتے جاتے پریاں منوہر کا پلنگ بھی اپنے ساتھ اڑا لے گئیں۔ مہارس نگر مدمالتی کے محل پہنچ کر پریوں نے منوہر کا پلنگ مدمالتی کے پلنگ کے ساتھ لگا دیا اور دونوں کو دیکھ کر خوش ہونے لگیں۔ پریاں منوہر اور مدمالتی کو سوتا چھوڑ محل کی سیر کے لیے نکل پڑیں۔ پریاں چلی گئیں ادھر منوہر اور مدمالتی دونوں جاگ گئے۔ منوہر پہلو میں اجنبی لڑکی کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ مدمالتی بھی اپنی خواب گاہ میں نوجوان کو دیکھ کر ڈر گئی۔ ہمت جٹا کر منوہر سے پوچھنے لگی کہ تم کون ہو۔ اور یہاں کیا کرنے آئے ہو۔ دونوں کی آپس میں بحث وتکرار ہونے لگی۔ بحث وتکرار میں دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا

اور اپنا دل دے بیٹھے۔

دونوں نے ایک دوسرے سے محبت کا اقرار کیا۔اپنی محبت کی نشانی کے طور پہ دونوں نے اپنی اپنی انگوٹھیاں بدل لیں اور سو گئے۔ پریاں محل کی سیر سے واپس آئیں اور دونوں کو دیکھ کر خوش ہونے لگیں۔ان کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ دونوں ہمیشہ ساتھ رہیں۔کبھی جدا نہ ہوں۔ پھر آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگیں کہ شہزادے کے ماں باپ صبح جاگیں گے اور اپنے جگر گوشہ کو نہ دیکھیں گے تو پریشان ہو جائیں گے۔اس خیال کے آتے ہی پریوں نے منوہر کو پلنگ سمیت اٹھالیا اور واپس اسے اس کے محل کنگ گیر پہنچا دیا۔صبح منوہر کی آنکھ کھلی تو اسے مدمالتی کی یاد آنے لگی وہ مدمالتی کو ڈھونڈنے لگا۔منوہر مدمالتی کے عشق میں پوری طرح ڈوب چکا تھا۔وہ ہر لمحہ اور ہر پل صرف مدمالتی ہی کو یاد کرتا تھا۔اس کی جدائی میں اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔راجا بکرم کو منوہر کی اس حالت کا پتہ چلا تو وہ پریشان ہوا تھا۔منوہر کی دائی سے جب اسے پتہ چلا کہ منوہر مہارس نگر کی شہزادی کے عشق میں مبتلا ہے اور اسے پانے کے لیے مہارس نگر جانا چاہتا ہے اور اسے پانے کی خاطر بڑی سے بڑی مصیبت اور پریشانیوں کا سامنا کرنے تیار ہے تو وہ بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگا کہ تو جس چیز کی خواہش کر رہا ہے وہ ایک سراب ہے، دھوکہ ہے۔اور تو اس دھوکے میں نہ پڑ اور مہارس نگر جانے کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔باپ کی باتیں سن کر منوہر کہنے لگا کہ اگر آپ مجھے مہارس نگر جانے کی اجازت نہیں دیں گے تو میری جان چلی جائے گی اور میری موت کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔راجا بکرم نے بیٹے کی خوشی کی خاطر اسے مہارس نگر جانے کی اجازت دے دی۔منوہر مدمالتی کی تلاش میں نکل پڑا۔وہ جنگل، بیاباں، صحرا، پہاڑ سر کرتے، سمندر اور بڑے بڑے دریا پار کرتے، دکھ اور تکلیفیں برداشت کرتے مدمالتی کو تلاش کرنے لگا۔ایک جگہ گھنے جنگل میں اسے ایک سنیاسی نظر آیا۔سنیاسی نے منوہر سے پوچھا تو یہاں اس گھنے جنگل میں کیا کرنے آیا ہے۔منوہر اسے اپنی ساری داستاں سناتا ہے۔سنیاسی منوہر کو آفتوں اور مصیبتوں سے بچنے کے لیے ایک حفاظتی چکر دیتا ہے۔منوہر سنیاسی سے اجازت لے کر پھر مہارس نگر کی تلاش میں نکل پڑا۔سردی اور گرمی کی صعوبتیں برداشت کرتے آگے بڑھنے لگا۔ایک جنگل میں اسے ایک محل نظر آیا۔منوہر گھنے جنگل میں محل دیکھ کر حیرت زدہ ہوگیا ۔محل کے اندر جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔لڑکی نے منوہر کو دیکھ کر پوچھا کہ تم کون ہو اور یہاں کیا کرنے آئے ہو۔ یہاں کسی آدم زاد کا گذر نہیں ہوتا۔ سچ سچ بتاؤ کہ تم یہاں اس محل میں کیسے آئے؟ منوہر کہتا ہے کہ میں مدمالتی سے محبت کرتا ہوں اور اس کی تلاش میں نکلا ہوں۔اپنی آپ بیتی سنا کر منوہر رونے لگا۔لڑکی اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولی کہ تم فکر نہ کرو، میں مدمالتی کو جانتی ہوں، میں اس کی بہن ہوں، اس کی سہیلی ہوں۔ میں تمہیں اس سے ضرور ملاؤں گی۔میرا نام چمپاوتی ہے۔اور میں کنچن نگر کے راجا سوربل کی بیٹی ہوں۔ مجھے یہاں ایک دیو نے قید کر رکھا ہے۔دیو نے اس کے باغ سے اس کی سہیلیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے اٹھایا، یہاں محل میں لے آیا اور قیدی بنا کر رکھا ہے۔منوہر چمپاوتی کی مدد کرتا ہے۔دیو کا قتل کر کے اسے اس کے ماں باپ سے ملاتا ہے۔چمپاوتی کے ماں باپ اپنی بیٹی سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ اور منوہر کو دعائیں دیتے ہیں۔ چمپاوتی کے ماں باپ منوہر کے احسان مند ہوتے ہیں۔اور اس سے کہتے ہیں کہ تم نے ہماری مدد کی ہے اب ہم پر واجب ہے کہ ہم تمہاری مدد کریں۔ چمپاوتی اپنے والدین کو منوہر اور مدمالتی کے عشق کی داستان سناتی ہے۔ چمپاوتی کی ماں اور مدمالتی کی ماں دونوں آپس میں بہنیں اور ایک دوسرے کی غم خوار تھیں۔ مدمالتی کی ماں کو چمپاوتی کی واپسی کا جیسے ہی پتہ چلا وہ مدمالتی کو ساتھ لے کر کنچن نگر پہنچتی ہے۔وہ چمپاوتی کو سلامت دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔دن گذرنے لگے۔مدمالتی کی ماں چمپاوتی کی ماں سے روانگی کی اجازت مانگی تو چمپاوتی کی ماں نے کہا کہ مدمالتی کچھ دن اور رہ لے تو ہمیں خوشی ہوگی۔ مدمالتی کی ماں اجازت دیتی ہے اور واپس مہارس نگر چلی جاتی ہے۔ چمپاوتی کی ماں موقع دیکھ کر مدمالتی

کے سامنے منوہر کا ذکر چھیڑ دیتی ہے۔ مد مالتی منوہر کا نام سن کر پہلے تو انکار کرتی ہے پھر اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ چمپاوتی کی ماں منوہر اور مد مالتی کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔منوہر اور مد مالتی ایک دوسرے کو پا کر خوش ہوتے ہیں اور دنیا جہاں سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔دن اسی طرح گذرنے لگے۔کافی دن بیت گئے تو مد مالتی کی ماں کو اپنی بیٹی کی یاد آنے لگی۔اور وہ بیٹی سے ملنے کے لیے اچانک کنچن نگر پہنچ گئی اور بے تابی سے مد مالتی کے محل میں داخل ہوئی۔وہاں اس نے دیکھا کہ منوہر اور مد مالتی دنیا جہاں سے بے خبر ایک دوسرے میں مگن ہیں۔یہ دیکھ کر وہ آگ بگولہ ہو جاتی ہے اور منتر پڑھ کر گلاب کا پانی مد مالتی پر چھڑک دیتی ہے۔منتر کے اثر سے مد مالتی طوطی بن کر اڑ جاتی ہے اور جنگلوں، بیابانوں میں آنسو بہاتی پھرنے لگتی ہے۔ایک شہزادہ چندرسین نامی اسے قید کر لیتا ہے۔چندرسین دیکھتا ہے کہ طوطی نہ کچھ کھاتی ہے اور نہ کچھ بولتی ہے۔ہمشہ اداس رہتی ہے۔ چندرسین اس کی اداسی کی وجہ پوچھتا ہے تو طوطی اسے ہمدرد جان کر اپنا سارا حال سناتی ہے۔چندرسین طوطی کی مدد کرتا ہے۔اسے اس کے ماں باپ سے ملاتا ہے۔مد مالتی کی ماں فوراً اپنی بیٹی کو پہچان لیتی ہے۔اور منتر پڑھ کر گلاب کا پانی اس پر چھڑک دیتی ہے۔منتر کے اثر سے مد مالتی اپنی اصل شکل میں واپس آ جاتی ہے۔مد مالتی اصل شکل میں واپس آ تو جاتی ہے لیکن ہر وقت منوہر کو یاد کرتی اور اس کی یاد میں آنسو بہاتے رہتی ہے۔منوہر بھی مد مالتی کی جدائی میں شہروں شہروں مارا مارا پھرنے لگا تھا۔چندرسین منوہر کو تلاش کرتا ہے اور اسے مد مالتی سے ملاتا ہے۔منوہر اور مد مالتی کے ماں باپ دونوں کی سچی محبت اور قربانیوں کو دیکھتے ہوئے دونوں کی شادی طے کر دیتے ہیں۔شادی بڑی دھوم دھام اور تمام رسوم اور رواجوں کے ساتھ انجام پاتی ہے۔ادھر چندرسین اور چمپاوتی بھی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔منوہر چمپاوتی اور چندرسین کی شادی کروا دیتا ہے۔آخر میں منوہر، مد مالتی، چندرسین اور چمپاوتی سب ہنسی خوشی اپنے اپنے ملک روانہ ہوتے ہیں۔

9.5 مثنوی گلشن عشق کے قصے کا ماخذ

مثنوی گلشن عشق میں نصرتی نے منوہر اور مد مالتی کے عشق کا قصہ بیان کیا ہے۔یہ قصہ نصرتی کا طبع زاد ہے یا پھر اس نے کہیں سے اسے اخذ کیا ہے اس طرف اس نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔اس دور میں لکھے گئے قصوں میں بہت سی باتیں مشترک ہوا کرتی تھیں۔جیسے، اولاد کا نہ ہونا، منتوں مرادوں کے بعد شہزادے کا پیدا ہونا، نجومیوں کا زائچہ دیکھ کر ایک خاص وقت پر کٹھن گھڑی کے آنے کی پیشن گوئی کرنا، عشق میں مبتلا ہونا، بلاؤں اور مصیبتوں میں گھر نا اپنی جدوجہد اور غیبی امداد سے کامیاب اور کامران ہونا وغیرہ۔

مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب نصرتی میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔لکھتے ہیں کہ قصہ کہاں سے لیا گیا ہے اس کا معلوم کرنا دشوار ہے کیونکہ نصرتی نے اس کا کہیں اشارہ نہیں کیا صرف اس قدر لکھا ہے کہ ان کے ایک دوست مسمی نبی ابن عبدالصمد نے اس قصے کو لکھنے کی ترغیب دی۔تحقیق سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس سے قبل بھی تحریر میں آ چکا تھا۔شیخ منجھن نے اسے ہندی میں لکھا تھا۔لیکن شیخ منجھن کی کتاب اب کہیں دستیاب نہیں ہے۔اس کا حوالہ ایک دوسری کتاب ''قصہ کنور منوہر و مد مالت'' میں ملتا ہے۔یہ فارسی مثنوی ہے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوا البتہ تصنیف 1059 ہجری ہے اس میں مصنف نے شیخ منجھن کی ہندی کتاب کا ذکر کیا ہے۔اور اپنے قصے کی بنیاد اسی پر رکھی ہے۔

تیسری کتاب عاقل خان رازی نامی عہد عالم گیر کے شاعر کی فارسی مثنوی مہر و ماہ ہے جو 1065 کی تصنیف ہے نصرتی کے گلشن عشق کے بعد بھی بعض شعرا نے اس فسانے کو نظم کیا ہے ان میں سے ایک حسام الدین حصار کا رہنے والا عالمگیر کے عہد میں ہوا ہے یہ بھی فارسی مثنوی ہے کتاب کا نام حسن و عشق اور اس کا سنہ تصنیف 1071 ہجری ہے اگر چہ ان سب کتابوں میں قصہ ایک ہے لیکن ہر مصنف نے کسی قدر رد و بدل یا اختصار سے

بیان کیا ہے ان سب میں گلشن عشق بہت جامع اور ضخیم ہے یہ کہنا دشوار ہے کہ کس نے کس سے اس قصے کو لیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ قصہ بہت مقبول و مشہور تھا اور ہر مصنف نے اسے اسی طرح بیان کر دیا ہے جیسا کہ مقامی طور پر مشہور چلا آ رہا تھا۔ (نصرتی، مولوی عبدالحق، ص20)

مولوی عبدالحق کی رائے سے اتفاق کریں تو یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ منوہر اور مد مالتی کے عشق کا افسانہ اس دور میں مقبول عام قصہ تھا۔ اور نصرتی نے اس مشہور و معروف قصے کو لے کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے ایک شاہکار کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اور اس قصے پر مبنی جتنی بھی داستانیں لکھی گئیں ان میں نصرتی کی مثنوی گلشن عشق کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ۔ یہ نصرتی کی پہلی تصنیف ہے۔ اس داستان کو لکھ کر نصرتی نے بادشاہ علی عادل شاہ ثانی کی خدمت میں پیش کیا۔

الٰہی یو شہ کوں مبارک اچھو　　نگہباں اسے حق تبا رک اچھو
محبت کی پا باس جس ٹھانوں میں　　رکھیا گلشنِ عشق کر نانوں میں
کھیا اس کی تاریخ یو ہجرتی　　مبارک یو ہے ہدیۂ نصرتی

ہدیۂ نصرتی سے 1068ھ مطابق 1657ء مثنوی کا سنہ تصنیف بر آمد ہوتا ہے۔ اس مثنوی میں اشعار کی جملہ تعداد 4406 ہے۔

9.6 منتخب اشعار

پنکھی ہو ماں کے ہت سوں جب اوڑی مد مالتی بعد از
وہ یک شہزادہ ہت سنپڑی دکھوں کرنے اپس فانی

زباں کھول طوطی شکّر مقال　　کہی داستاں سِرتے یوں حسب حال
کہ جیوں وہ چنچل تھی سلکّھن بشر　　اُسی دھات اپروپ بنی جانور
دسی دیکھتے گرچہ طوطی نمن　　ہر ایک پر میں پن تس کے کئی لکھ لکھن
چڑیا تھا سو بس برہ کا بے درنگ　　ہوا تھا فلک ساہر یا کاچ رنگ
اتھے یوں منوّر ہر یک پرخیال　　سٹنہار سورج کوں تاریاں سوں حال
منقّش ہر اک پر میں کئی بھانت رنگ　　سٹنہار مانی کے ہر رنگ پہ زنگ
سرنگ نین یا قوت سے آبدار　　جگا جوت مریخ تے تاب دار
برہ سات ہردم درد نے کوں کھونچ　　رگت بھر سُہے لعل سی لال چونچ
کُھلے تے بی چندر کے دیتے سوز دق　　سہاوے گلے میں محبّت کا طوق
دو باز و سرنگ سورتے لعل تر　　سٹنہار نت عکس مریخ پر
بلوریں نہ پگ بلکہ الماس کے　　نکھاں جیوں نوے چاند آکاس کے
دھری خوش بچن میں فصاحت تمام　　سو بلبل سوں پرسوز شیریں کلام
سُہے کھن جواہر کا سینہ امول　　دسے درفشانی اٹھے جب وہ بول

ہنسے بخت پر جب وہ جوش گل پڑیں
جو طالع پہ رودے تو موتی جھڑیں

کرے سیر جس وہ بیابان پر
سٹے خاروخس کو گلستاں کر

صباساکرے سیر گلشن پہ جاں
تو شبنم کی جاگاکرے درفشاں

کرے یادپیوکے دَرَسؒ کا سبق
ہراک بن کے دفتر کے پھیرے ورق

مُکت بھرِدسین برگ و گل ہورچمن
صدف ہوردُرج وطبق کے نمن

پراگندہ ہوں بُھیں پہ موتیاں کی راس
دِسے دیس کوں دھرت نس کا اکاس

دسے دھوپ کی ناراگر جس رخن
ہنسی سورپرتس تو ہوئی پھول بن

پڑے حسن تس جس نظرکے تلھار
گرفتار ہوتس پہ بے اختیار

جب اس روپ دیکھیا نظرسوں گگن
ہو بادل پریشاں کراس کاج من

اپس رام کرنے بدل سر بسر
پکڑنے ہِنگا ہو نوایا کمر

سورج بچہّ اس کا کوا نے منگے
سداطعمہ تس مکھ تے کھانے منگے

جب آوے وہ مشرق کے بیضے تے بھار
منگے طعمہ پر کھولتا مکھ پسار

جو اس روپ دیکھانظرسوں چندر
فلک بیچ ہالے کانت دام دھر

جگا جوت تاریاں کے دانے بکھیر
دہ چنتا اُجالا کرے چک کے زیر

زہے مرغ زیرک نہ راکھے نظر
بجز عین کس غیر کے دام پر

اچھے رات دن بیم کے پئے منے
دھنڈے پیوکوں اپنے ہر یک شئے منے

اپس بخت پرنت اچھے روس میں
کرے رُت زیاں آہ وافسوس میں

سوکرقوت اپنی رگت ماس کوں
گھٹے غم میں جم بھوک ہو رپیاس سوں

نہ تل ٹھارکیں باؤ کی دھرکے گت
کتک دن کرے تل اوپر شش جہت

ولے وصل کا کیں بھی پاکرچمن
سکے کر نے پروردہ تس گل سوں من

رھیانیں سو کوئی پات بن کے منجھار
تو انجھواں سوں نئیں دھوئی تس کا غبار

ہوباول پکڑات پریشان حال
چلی تھی جب یک ملک تے بے خیال

تلگ یک نگرکے سو شہ کاکنور
جسے ناُ نوتھا سو چندرسین کر

اپس شہرتے بھارسوں آکے بھار
چلیاتھاوہ رن بن میں کرتاشکار

قضااللہ ویسے میں اس کی نظر
پڑی جایکایک وہ طوطی اوپر

ادک روپ پراس کے ہومبتلا
کھیاشہ شکاریاں کوسگلے بلا

که اپنے په لازم سمج کریو کام
وه طوطی کوں ہر کیوں دھرودھر کے دام

که مج جیو کے پنکھی سوں ہو ہم نفس
اچھے تو سہاوے یو تن کا قفس

مبادا کدھیں ہت تے جاوے چھکل
مرا جیو بھی جانو چلیا تس اگل

جب اس دھات کی شه تلگ مات ہوئی
تمن لھوسوں فی الحال وه ہات دھوئی

وگر جس تے ہو یو سرانجام کام
دکھاؤں کر اس سرفرازی تمام

چندرسین تے جیوں سنے یو بچن
پراگنده ہو بُھیں په تاریاں نمن

جتا دھرت و پربت رُکھے رُکھ تمام
لگے مانڈنے تین بہوت بھات دام

کتک تڑکے کاڑاوٹ سوں دھر چھڑیاں
کریں دام سٹنے کیاں چونڈیاں بڑیاں

کتک پر سینکاں ہور اوپر جوڑ کھانپ
شلم سوں منگے کھو چنے اپسے جھانپ

کتک پائے دامن کھوٹے ٹھار ٹھار
کتے آن مکریاں منڈے بے شمار

ہر یک تن بھی رن بن میں لگ پاتے پات
چلاویں چھتیاں مکر سوں دھات دھات

ولے ان سو بھاندے طرف آئے نه
سو چارے په کس جیو دکھلائے نه

کیا جب شکاریاں تے یو بل گزر
اپیں تب وه شہزاده تازی اوتر

بچھائو رتن دانے لکھ دھات سوں
منڈیا دام زرتار کا ہات سوں

که تا ئو رتن پر تو بی دھر طلب
اُتر رُکھ تے پھاندے پڑے ہر سبب

برہنی جو دیکھی طلب سوں تمام
اپس ہت سوں مانڈیا ہے شہزاده دام

اول تے جو اُن سب جگت پر بھٹک
ہو مندی جو یک رُکھ په رہئی تھی اٹک

برہنی ادک دُکھ تے بیمار ہو
کہی دل میں جیونے تے بیزار ہو

که روزِ ازل تے قضا کا رقیب
لکھا تھا سُتے بخت میرے نصیب

دکھایا سُکھ یک پل جو مانند خواب
جنم وینچ حسرت کا پاڑیا عذاب

بره کی چُھریاں سوں مرے جیو کا تن
کیا پھانچتانت مربّے نمن

ہوا جیوں کتک دن کوں مج دل فگار
وه لیا مج سے گھائیل په فرحت کا بار

تل یک آن جان بخش مرہم کوں پاس
دکھا زخم وه خوب کرنے کی آس

ستم کے سونیبوں کوں دو پھانک کر
سٹیا پھر جدائی کا رس زخم بھر

وه جب رس بھریا آبندے بند منجھار
لگے جیو په چرکے ہزاراں ہزار

نه سه سک وه چرکیاں تے کاری عذاب
کیا جیوں نکل سب مرے جیو تے تاب

وہ جیوں بھول کا بھول پر دُھم کیا
جو مج تے وہ مرہم کوں پھر گم کیا

رہنا کیوں پکڑاب مرادل قرار
کہ ہر دکھ میں درداں بسے کئی ہزار

دھرد کیا اب آرام کی میں ہوس
تلپنے جو نہ آئے مج بُھیں پہ بس

جو دیکھوں تو تلتل ادک ہوے گھات
کہ بد تر ہے دھونا اتا جیوتے ہات

ولے ہووَں اسی خوب لوگاں میں فوت
کہ بدتر ہے سب میں غریبی کی موت

سو یوں بول امید کا ہار توڑ
کرے ریز موتی سوتس رشتہ چھوڑ

کری رُکھ تے یوں بُھیں تلگ درفشاں
کہ مابین دسنے لگیا کہکشاں

سچیں ہے زنانی یوریت آشکار
پڑے سخت ٹک دکھ تو ہوں جیو اُدھار

یو ہمّت ہے مردانچ بانٹے تمام
پھوٹے جیو کوں گُھٹ کر کریں دل کا کام

وہیں شاہزادے کے بھاندے منے
پڑی آ کے یک چھب کے ساندے منے

اپیں دوڑ شہزادہ خوشیاں سنگات
نکالیا اسے دام تے سٹ کے ہات

جڑت کاچ پنجرا خوش یک آن کر
چلیا شہر کوں لے اُسے تس میں دھر

کیا جیوں وہ اپنے وطن کوں گون
نہ دیکھ یک رتی چک کسی کے رخن

وہیں لے کے پنجرا سو یک کنج دھر
لگایا اُسے سات جیو کی نظر

ہراک جنس کے پَھل پُھلا نے نول
اپس ہت سوں یک یک سٹے تس اگل

ولے کچ بی یو یک رتی کھائے نہ
کسی پر بھی ٹک جیو دکھلائے نہ

نپٹ پر پُھلا دکھ سوں معذور اچھے
لجاسیس بازو میں رنجور اچھے

اچھے تلخ جا بھول مِٹھ بولنا
جھکے طرح دے سُکھ کا مر غولنا

کبھیں چک صدف کھول ڈھالے گہر
کدھیں گل فشانی کرے بخت پر

نپٹ بے وفا جان دور قمر
سو رکھ دور پر مشتری کے نظر

یو کل جوگ اوچھے کوں اپ دل تے تج
دھر اس پانچ دن کے سو جیونے تے لج

جنم جگ کی لیا وصل کے جُگ کوں یاد
وہ لے رھئی اچھی برہ سوں نت سماد

سچیں جن جو بیٹھے جنم تال مار
اسی دم اُچا ناچ ہے لاکھ عار

دیکھ اس حال شہزادہ دل سرد ہو
اپیں بھی رھیا اس سوں ہمدرد ہو

دیا یوں اپس دل میں نیّت کوں ٹھانو
کہ اُن کھائے بن کچ اپیں اَن نہ کھانو

دیکھے جیوں اُسے غم میں ان بے قرار
اپیں و نچ روتا رہے زار زار

ادک دیکھ تس تن میں جم سوز وتاب
اپیں ہواسی اگ پہ جل جل کباب

نپٹ جیوکی پرواکوں سٹ صبح وشام
لگیاٹالنے سخت غم میں تمام

نپٹ داٹ رہ دل پہ ویساچ سوز
ٹلے نس سوں جب تین تل تین روز

برہنی کا دل پھر اُچاٹیاوہیں
ہوراس دکھ کا افسوس داٹیاوہیں

کہی یوں وہ پچتاپھر آپس میں آپ
کہ ہے کیا جو مرتے کے سرحپ یو پاپ

گنہگار طالع کا ہونہ تباہ
براہے جو چپکے مرے بے گناہ

برہنی نہ رہ سک ادھر کھول کر
یکا یک اٹھی اس سوں یوں بول کر

کہ ائے بوالہوس نو جوان کیا سبب
جھوٹیں مفت جیو ہارلیتا ہے اب

مرے بخت کے آکے شطرنج میں
نظرکرکے پڑتاہے صدرنج میں

پڑیاہے مجے کھیل درکارسوں
سرب جگ سوں بازی کر نہا رسوں

پیا دے چلا برہ کی کر کے چھند
مروڑیا ہے مج دل کے فرزیں کا بند

ادک رنج کی فیل بندی سوں داٹ
سو کونڈیاہے مج عقل کے شہ کی باٹ

ستم کی ترنگ گھال سج کھیل پھوڑ
لیا لوٹ سب ہست چنتیا کی چھوڑ

بساط اب سرب سکھ کی پامال کر
دھریاشہ کوں منصوبہ یک ڈال کر

اچھے دنگ مج دل کادانا وزیر
ترڈّدکارُخ نہ سکے آن پھیر

نپٹ سک رکھے فکرکے فیل پاس
نہ دوڑاسکے چک ترنگ بے قیاس

نہ پاٹک خیالاں کے بیدق کوں بل
پڑوں بخت ہوربندھ کی ضدمیں کو بل

بغیرِصَبرُکچ نہ مج کام آئے
دوگن زورتے اُس کے مہرہ پھرائے

دسے اب کہ یک تل میں شہ مات کر
مراجیوہرے جیت سوں گھات کر

اگر مج مدد آئے لیلاج آج
نہ سکسے یو کوئی کھیل کا کر علاج

مرے جیو کی بازی نہیں جیت چُک
اپس سکھ کے جیوکوں نہ دے دکھ پہ دُک

مرا طورتن پل میں اب جائے جل
تو منگتا کی چپ سرمہ ہونے بدل

خداتئیں مراچھوڑدے اب دنبال
توں اٹھ یہاں تے جاہوردھرا اپنا خیال

کہ میں عمر کے دل کا مریم تے چڑ
رہی تھی جو جیوکاچ روزہ پکڑ

وہ نیّت کوں تیرے تے تٹناپڑیا
کفارت دوگن پھر کے مج پر گھڑ یا

ابد وصل کی اب دسے باج شام
تلگ نہ کروں میں یوروزہ تمام

تو پھر کر خطرناک یوپنتھ جو
تو تج خون تے توں گنہ گار ہو

برہنی نے اُتینچ خوش بات کر
جو پی کارہی پھر کے وَیں روزہ دھر

چندؔرسین سُنتیچ اس کا سبب
لگیا دل میں مطلق تماشا عجب

کھیااے خداکی سنواری امول
تراکیا ہے احوال سو کھول بول

نہ بولے تو گر مج سوں یوکھول بات
یدی میں مرے جیوپہ کرتا ہوں گھات

وہیں دیکھنے مینچ خنجر کو کھینچ
کھیا پیٹ میں مارلیتاہوں مینچ

برہنی جو دیکھی بچن جی پہ آئی
چندؔرسین کوں بیگ سوگندبھائی

کھیا اے جواں مت اپس کر ہلاک
کتی ہوں مج احوال سن دردناک

وہیں داٹ چھاتی میں دکھ کا ابھال
گرج آہ سوں جل برس بے مثال

اپس گودمیں بحرقلزم بھری
جہازاس پہ قصّے کا چلتا کری

سرب سُکھ کے سکّان کامکھ مروڑ
ہنکاری سو برہ کے اوزار چھوڑ

کہیں فکر کی آڑہوں سوترنگ
چلی جائے بدھ سوں النگتے النگ

کہیں عشق کے بخت گرداب تے
سنبھالے تباہی کرے تاب تے

ہراک ٹھارپاتی ہزاراں فریب
کری سربسرسیرسب دھرشکیب

ہوا جیوں اپس حال کا سب سفر
کھڑاکی چوبے کادے آخرلنگر

یوتب بخت ورشاہزادہ سعید
متاع اس سفینے تے کر نے خرید

دلاسے کے بی نقد کاپلّہ تول
لگیا دیکھنے غم کے بستاں کوں کھول

ہریک بست بستیاں تے پابے بہا
کہاچھب کے تجّارپرمرحَبا

دواکچ دلا سے کا لانا اسے
نہ دیکھارتی کام آنا اسے

اپس بیچ تس کام پرور سعید
محبت سوں کیتا سب اس غم خرید

کہاتب کہ اے بانوئے مہربان
مجے اب تے بندہ تو مخلص پچھان

ترے حال کی مج ہے شرمندگی
کروں میں جوکچ مج تے ہوبندگی

کہ پہلیں لجاتج وطن کو ملاؤں
پچھیں تج پیارے کے دھندنے کو جاؤں

سُرب جگ میں زیرو زبرچو کُدن
دھونڈوں تس چلا سورنمنے نین

جوہودھرت وافلاک کے بیچ تے
نہ چک چو کنے دیوں نظرینچ تے

نبھاخوب خدمت کی میں ریت سوں
ملا دیوں ہر کیوں ترے میت کوں

جو ہووے گی مقصود پاشادتوں	تو اس وقت کر مج کو آزادتوں
چندرسین دکھلا محبت کی ریت	دلاسادیا سوکرے دل نچیت
اٹھیاواں تے کر نیم اُس سوں سگل	سفر کاچ سامان کرنے بدل
عجب کچ ہے قدرت تری اے دھنی	دکھایا کبھی دوستی دُشمنی
پھر اس پر منگیا دیکھنے پیار کر	تواغیار کوں کردیایار کر
پچھانویقین اے سو گیانی سگل	اسی ہات ہے دوست دشمن کا بل
کرے وہ کبھیں دل یگانیاں کے سخت	کبھیں اجنبی سوں کُھلاتا ہے بخت

9.7 نصرتی کی مثنوی نگاری

نصرتی دکنی کا مایہ ناز شاعر ہے۔ جس نے بزمیہ اور رزمیہ دونوں قسم کی طویل مثنویاں لکھ کر اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوایا ہے۔ مثنوی کی ابتدا نصرتی حمدیہ اشعار سے کرتا ہے۔ گلشنِ عشق چونکہ ایک عشقیہ مثنوی ہے اس لیے اس کے حمدیہ اشعار عشقیہ رنگ میں ملتے ہیں۔

صفت اس کی قدرت کی اول سراؤں	دھریا جس نے یو گلشنِ عشق ناؤں
کیا گرم عشق کا تس ابدال	یو باغ آفرینش کا پکڑ یا جمال
رنگا رنگ جے گل یو بن باس ہے	اوہر گل میں تجھ عشق کی باس ہے

مثنوی میں حمد، مناجات، نعت، معراج کا بیان، مدح سید محمد حسینی، مدح علی عادل شاہ ثانی، حسبِ حال اور صفتِ عشق کے ابواب سبب تصنیف کی سبب تصنیف کی وضاحت بھی ایک باب کے تحت کی گئی ہے۔

سبب ہے باغ تے قصے کے پھولاں لڑ میں گوندنے کا

جو لیائے شوق پر مج اس ہنر پر اہل عرفانی

کے عنوان سے نصرتی مثنوی لکھنے کا سبب بیان کرتا ہے کہ عید کے دن یاران خوش باش کی محفل سجی تھی۔ سب خوش تھے۔ میں کچھ زیادہ ہی خوش تھا ہمارے بزرگ دوست نے کہا کہ فارسی زبان میں کئی بلند پایہ شعری کارنامے سامنے آئے ہیں۔ لیکن دکنی میں ایسا کوئی کارنامہ فارسی کے پایہ کا نہیں ملتا۔ اسی وقت نبی ابن عبدالصمد نے مجھ سے کہا کہ تو تو ایسے استاد کا شاگرد ہے جسے سارا عالم استاد عالم کہتا ہے۔ دکن میں آج تیری شاعری کا بول بالا ہے۔ مدمالتی کا قصہ سارے عالم میں شہرت پا چکا ہے تو بسم اللہ کہہ کر اس قصے کو لکھنا شروع کردے۔

سبوں میں اگرچہ خماری اتھی	مرے میں تو مستیچ بھاری اتھی
عزیزاں جو دھر آئے حب الوطن	منگے کرنے یاراں نے یک انجمن
ہمارے میں تھا یک جو یار بزرگ	شرف ناک، عالی نسب، ات سترگ
کہ کیا شاعراں فارسی خوش کلام	گئے کر اپس فن میں حکمت تمام
یک یک عشق کی بات کیتے سونقل	سنے پر نہ رہ کس کی جاگا پہ عقل

ولیکن دکھن یو رھیا ہو کہن　　نہ کوئی خوب قصہ کھیا نیک فن

تب اس میں تے یک مرد صاحب خرد　　مسمی نبی ابن عبد الصمد

دیکھت مج رخن ان زبان کھول کر　　جو کچ بات تھی سو اٹھیا بول کر

کہ تو آج ایسے کا شاگرد ہے　　جسے جگ کے استاد پر برد ہے

دکھن میں توں ہی آج نصرت قریں　　بلند شعر کے فن میں سحر آفریں

چنے جگ کے قصیاں میں قصہ نول　　جو مد مالتی کاچ ہے بے بدل

تو بسم اللہ کہہ کر توں قصہ شروع　　کہ اب فیض فیاض تج ہے رجوع

نصرتی نے مثنوی کومختلف حصوں میں تقسیم کیا ہےاور ہر حصے کے شروع میں بطورِعنوان ایک یا دوشعر لکھے ہیں۔جن میں اس باب کا خلاصہ آجاتا ہے۔عنوانات کے یہ شعرایک ہی بحراور ایک ہی زمین میں لکھے گئے ہیں۔اگران تمام اشعارکو یکجا کرلیا جائےتو ایک قصیدہ ہوجاتا ہےاور سارے قصے کا خلاصہ آجاتا ہے۔ بیجاپورکی مثنویوں کی مشترکہ خصوصیت یہ رہی ہے کہ یہاں کے شعراء سارا زور قصے پرلگاتے ہیں۔اور تیزی کے ساتھ قصےکو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔مثنوی'گلشنِ عشق'میں نصرتی نے پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ منوہراور مد مالتی کے عشقیہ قصےکو بیان کیا ہے۔زبان وبیان اورفن کے اعتبار سےاس نے دکنی زبان کوفارسی زبان کے معیار پرلانے کی کوشش کی ہے۔نصرتی دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے دکنی شاعری کواتنا سنوارااورنکھارااوراسےاس طرح جلابخشی کہ وہ فارسی شاعری کےہم پلہ بن گئی ہے۔

معا نی کی صورت تے ہو آرسی　　کیا شعر دکھنی کوں جیوں فا رسی

میں اس دو ہنر کے خلا صیاں کوں پا　　کہا شعر ایسا دونوں فن ملا

جزئیات نگاری اور کردارنگاری کے ساتھ ساتھ ماحول کی کیفیت سردی گرمی،چاندنی،تمازتِ آفتاب،طلوع وغروبِ آفتاب،محلات اور باغوں کی مرقع کشی،صحراؤں اورجنگلوں کی منظرکشی،تقریبات ورسم ورواج کی تصویرکشی وغیرہ پراس نے زوردیا ہے۔خوبصورت تشبیہات،استعارات اوراشارات سےنصرتی نےاپنےتوضیحی بیان کواثرآفرینی اوردلکشی عطا کی ہے۔

9.8 مثنوی'گلشنِ عشق'کا مطالعہ

9.8.1 اسلوب:

نصرتی قدیم اردو کےعظیم ترین شاعروں میں سےایک ہے بیجاپوری اسلوب کا وہ سب سے بڑانمائندہ شاعر ہے،جس نے بزمیہ اوررزمیہ دونوں قسم کی طویل مثنویاں لکھ کراپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوایا ہے۔لطف بیان کی شیرینی،تخیل کی پرواز اور چندلفظوں میں معنی کا دفتر بیان کردینا نصرتی کی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں جو بہت کم شعرا کے یہاں نظرآتی ہیں۔نصرتی تشبیہات اوراستعارات کا بےتاج بادشاہ ہے۔مثنوی گلشن عشق میں اس نےتشبیہات اوراستعارات کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔حسن بیان اورزورکلام اس کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔

فرح بخش یک سبز تر باغ تھا　　فلک کو ہر یک پھول جس داغ تھا

سٹیں عکس سو تس منور چمن　　ستارے بھریا ہوئے ہریا گگن

بنفشہ دھڑی لالہ لعل بتاں سرنگ گال جیسے گل ارغواں

9.8.2 کردارنگاری:

نصرتی نے کنور منوہر اور مدمالتی کو قصے کے ہیرو ہیروئن کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یہ کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ چندرسین اور چمپاوتی بھی اہم کردار ہیں اگر یہ کردار نہ رہیں تو قصہ میں کوئی مزہ نہ رہے۔ یہ کردار اور ان کا قصہ، اصل قصہ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ان کرداروں کے علاوہ منوہر کا باپ، فقیر، مدمالتی کی ماں، چمپاوتی کی ماں قابلِ ذکر ہیں۔ ضمنی کرداروں میں مدمالتی کا باپ، منوہر کی ماں اور دائی، پریاں، دیو، سنیاسی شامل ہیں۔ مثنوی ''گلشنِ عشق'' کے کردار جو ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ وہ منوہر، مدمالتی، چندرسین، اور چمپاوتی کے ہیں۔ منوہر اور مدمالتی، عاشق ومعشوق دونوں میں عشق کی شدت نظر آتی ہے۔

منوہر کنک گیر کے راجا بکرم کا بیٹا ہے۔ اس کی پرورش بڑے ناز ونعم میں ہوئی۔ چودہ سال کی عمر تک اس کی سخت نگرانی کی گئی۔ اس کی بڑے ناز ونعم میں ہوئی۔ اس کے باوجود نجومیوں کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی اور وہ مصیبتوں میں گرفتار ہو گیا۔ یعنی وہ مدمالتی کے عشق میں گرفتار ہو کر عیش و عشرت کی زندگی کو چھوڑ اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ وہ صحرا، بیابان، پہاڑ، سمندر اور دریا کا سفر کرتا اپنی جان کو جوکھم میں ڈالتا آگے بڑھتا رہا۔ مدمالتی کو پانے کی خاطر خطرناک دیو سے مقابلہ بھی کرتا ہے۔ منوہر اور مدمالتی دونوں ملتے ہیں اور پھر بچھڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنی محبوبہ کی جدائی برداشت نہ کر سکا اور اس کے فراق میں دیوانہ ہو کر پھرنے لگا۔ وہ دکھ اور تکلیفیں برداشت کرتا ہے اور اپنی چاہت کو حاصل کر لیتا ہے۔ منوہر ایک عاشق صادق ہے وہ مدمالتی سے سچی محبت کرتا ہے اس کے غم میں رونے دھونے اور آنسو بہانے کے بجائے اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے اور آخر اسے حاصل کر ہی لیتا ہے۔

مدمالتی مہارس نگر کے راجا دھرم راج کی حسین وجمیل بیٹی ہے۔ منوہر کو اپنی خواب گاہ میں دیکھ کر دل ہار جاتی ہے۔ اور جب منوہر چمپاوتی کو دیو کی قید سے آزاد کروا کر صحیح وسالم گھر لے آتا ہے تو وہ اس کی بہادری پر ہزار جان سے فدا ہو جاتی ہے۔ مدمالتی کی ماں جب اس پر جادو کرتی ہے۔ تو وہ طوطی بن کر اڑ جاتی ہے اور منوہر کی جدائی میں آنسو بہاتے پھرتی ہے۔ اور جب جادو کا اثر ختم ہو جاتا ہے تو منوہر سے بیاہ رچاتی ہے۔ مدمالتی کا کردار ایک مشرقی لڑکی کا کردار ہے۔ جب چمپاوتی کی ماں اس کے سامنے منوہر کا ذکر چھیڑتی ہے تو لاج کے مارے پہلے تو انکار کرتی ہے۔ پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اقرار کرتی ہے۔

چندرسین بھی اس مثنوی کا اہم کردار ہے۔ چندرسین منوہر اور مدمالتی کی مدد کرتا ہے۔ مدمالتی طوطی بن کر چندرسین کے ہاتھوں قید ہو جاتی ہے۔ طوطی کی زبانی ساری کہانی سن کر وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ چندرسین طوطی کو اس کے ماں باپ سے ملاتا ہے اور منوہر کو ڈھونڈ لاتا ہے۔ منوہر اور مدمالتی کی شادی کرواتا ہے۔ چندرسین کا کردار ایک نیک اور ہمدرد شہزادے کا کردار ہے۔

چمپاوتی کنچن نگر کے راجہ سوربل کی بیٹی، مدمالتی کی خالہ زاد بہن اور سہیلی ہے۔ چمپاوتی نہایت ہی حسین شہزادی ہے۔ ایک دیو اسے اپنا قیدی بنا تا ہے۔ چمپاوتی کی مدد منوہر کرتا ہے دیو کا خاتمہ کر کے اسے ماں باپ سے ملاتا ہے۔ چمپاوتی ایک رحم دل شہزادی ہے۔ منوہر جب اسے دیو سے آزادی کی بات کرتا ہے تو، وہ دیو کے عتاب سے منوہر کو بچانے کی خاطر اسے واپس چلے جانے کو کہتی ہے۔ چمپاوتی، چندرسین کی اپنائیت و ہمدردی سے متاثر ہو کر اسے دل دے بیٹھتی ہے اور اس سے شادی کے لیے رضامند ہو جاتی ہے۔

منوہر کا باپ راجہ سوربل ایک نیک، رحم دل اور رعایا پرور حکمران ہے۔فقیر کے کھانا لینے سے انکار پر وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ایک طرف رعایا دوسری طرف اولاد کی آرزو، وہ فکر مند ہو جاتا ہے مگر رانی کے تسلی دینے پر وہ فقیر کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔صحرا، جنگل، بیابان کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔بیٹے کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش سخت نگرانی اور ناز و نعم میں کرتا ہے۔منوہر اس سے مدمالتی کی تلاش کے لیے اجازت مانگتا ہے تو اپنے منتوں مرادوں والے جگر کے ٹکڑے کو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اجازت دیتا ہے۔اور بیٹے کی خوشی اور اس کی قربانیاں دیکھتے ہوئے اس کی شادی مدمالتی سے کروا دیتا ہے۔

9.8.3 جذبات نگاری:

مثنوی ''گلشنِ عشق'' میں نصرتی نے اس بات کا خصوصی اہتمام کیا کہ جذبات کا اظہار عین انسانی فکر و فہم کے مطابق ہو۔نصرتی نے اپنی فنکاری سے کہانی میں استعجاب و تحیر کی فضا بنائے رکھی ہے۔توازن اور تناسب کا خیال رکھ کر بڑی حد تک اثر انگیزی کو برقرار رکھا ہے نصرتی نے کرداروں کو سجانے سنوارنے کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات کی بھی بڑی چابکدستی سے ترجمانی ہے۔نصرتی نے موقع بہ موقع جذبات کے دل پذیر مرقعے کھینچے ہیں۔خاص طور سے غمِ فراق کا اثر انگیز بیان بڑا غیر معمولی نظر آتا ہے۔اس نے لفظوں سے مصوری کی ہے۔غم واندوہ کی ترجمانی حالات وواقعات کے پس منظر، فطرت کے عین مطابق دکھائی دیتے ہیں۔مثنوی ''گلشنِ عشق'' میں ایسے مناظر نظر آتے ہیں جن کے تصور سے کرداروں کے جذبات کی کیفیت کا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔رنج و غم کے، خوشی کے مواقع، عیش و طرب کی صحبتیں وغیرہ دیدنی ہیں۔

منوہر مدمالتی کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔راجا اسے لاکھ سمجھاتا ہے کہ یہ صرف ایک دھوکا ہے اور تو اس دھوکے میں نہ پڑ۔منوہر شدتِ جذبات میں راجا سے کہتا ہے۔اے بادشاہ! آپ مجھے نصیحت نہ کیجیے میں اس واقعہ کو حقیقت مانتا ہوں۔یہ قدرت کا فیصلہ ہے کہ اس نے ہم دونوں کو ملایا ہے۔اب میرا سب کچھ وہی ہے میری زندگی بھی میرے جینے کی امید بھی۔آپ مجھے اس سے ملنے سے نہ روکیں، میرے دل میں جو عشق کی آگ لگی ہے اسے کم نہ کریں۔میں وفا میں کسی سے کم نہیں ہوں۔اے میرے پدر میری بات سنیں۔مجھے میری معشوقہ کو ڈھونڈنے اور اس سے ملنے سے نہ روکیں۔اگر آپ مجھے جانے سے روکیں گے تو میری زندگی ختم ہو جائے گی اور سب کچھ ختم ہو جائے گا۔آپ عمر بھر پچھتائیں گے اور پچھتاوے کے سوا آپ کو کچھ نہ ملے گا۔

کھیا مج نہ کہہ پند اے بادشاہ — یو قصے پہ ہے سب مرا دل گواہ
کہ جس وقت خالق ازل کا عیاں — جو بے جسم سرجیا اتھا سب کی جاں
ہمن دو کوں کریک وہ سرجیا ہے پن — وہ معشوق جاں ہور مرا جسم تن
یقین جان ہرتن کو ہے جابجا — جو یک روح علوی وسفلی دوجا
اتافی الحقیقت بی ہے مج یہ خواب — سوتے پر نصیحت نکو کر خراب
رہنے عشق بازی میں جانیا زغم — نہ میں فاختے سے وفا میں ہوں کم
سن اے باپ میرے بچپن تو اتال — نکو رکھ ہو مج کونڈے میں خیال
میرا جیو ترے ہاتھ تے جائیگا — پچھیں پھر جنم جگ توں پچتائیگا

مد مالتی چمپاوتی کی ماں سے منوہر کی جدائی کا غم بیان کرتے کہتی ہے۔اے ماں تونے میرے سامنے کس دشمن کا ذکر چھیڑ دیا۔اس نے تو مجھے دھوکہ دیا ہے۔اوراسی نے مجھے غم دیا ہے۔تم اسے اچھا کہتی ہو۔وہ تو دلوں کو لوٹنے والا لٹیرا ہے۔آدھی رات کو آکر اس نے میرا دل لوٹا ہے۔وہ ایک جادوگر ہے۔سامری بھی جادوگری میں اس کا شاگرد ہے۔عشق کی آگ لگا کر اس نے میرے دل کو بے قرار کیا ہے۔اس کی جدائی سے میرے تن بدن میں آگ لگی ہے۔میرا دل اسی کی جانب لگا رہتا ہے۔نہ میں منہ سے آہ نکال سکتی ہوں اور نہ ہی آنکھ سے آنسو بہا سکتی ہوں۔ہمیشہ اس کی یاد میں تنہا اور غمگین رہتی ہوں۔کوئی ایسا نہیں ملتا جس سے میں اپنا دکھ درد بانٹ سکوں۔جی کا بوجھ اتار سکوں۔دن تو جیسے تیسے سہیلیوں کے ساتھ کٹ جاتا ہے لیکن رات پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔زیورات بدن پر آگ لگتے ہیں اور سیج کے پھول مجھے انگارے لگتے ہیں۔میرے ماہ و سال اسی طرح گذر رہے ہیں۔خدا کے سوا میرے دل کا حال سننے والا کوئی نہیں ہے۔

کہ اے مائی کیاری کری اب توں گھات ۔۔۔ جو کاڑی میرے پاس دشمن کی بات

نہ کہہ ساؤاس بل گھنوری اہے ۔۔۔ دلاں کی چھپے اس کوں چوری اہے

سمجھتا ہے ایسی وہ جادو گری ۔۔۔ نھنا جس کا شاگرد اچھے سامری

نہ جانوں کہ کیا کر سحر بے نظیر ۔۔۔ یکایک دروڑا سٹیا مجھ مندھیر

جگا کر اپس مکھ کے شعلے کی تاب ۔۔۔ ستم چھین لیتا مٹھے مج تے خواب

وہیں عشق کی سوز لا بار بار ۔۔۔ مرے دل کوں کیتا ادک بے قرار

کھنوری پن اس دھات حالی کیا ۔۔۔ سرب لوٹ من تن کوں خالی کیا

ولے ان لگایا سو مشعل کی سوز ۔۔۔ ادک ہووے پل پل کوں مج تن میں روز

کسے دکھ یو کہنا نہ دیکھی روا ۔۔۔ لگی من میں جلنیچ ہو لا دوا

او سا ساں نہ چک مکھ ستی بھا سکوں ۔۔۔ نہ چک تے انجھو بھا رلے آ سکوں

یکٹ نت رہوں غم سوں کر سر تلھار ۔۔۔ نہ کوئی بانٹ لیوے مرے دل کا بار

ٹلے دن تو ہر کیوں سہیلیاں کے سات ۔۔۔ پڑے پن بجرسل ہو سینے پہ رات

زرینے اگن تن پہ سارے لگیں ۔۔۔ گلاں سیج کے مج انگارے لگیں

مرے سر ٹلیں یوں کٹھن ماہ و سال ۔۔۔ خدا بن کہوں کس سوں مج دل کا حال

9.8.4 منظر نگاری:

مثنویوں میں منظر نگاری کا اپنا ایک الگ جادو ہوتا ہے۔نصرتی کو منظر نگاری میں کمال حاصل ہے۔چاہے رزمیہ ہو یا بزمیہ وہ موقع کی مناسبت سے تفصیل سے منظر کشی کرتا ہے۔مثنوی ''گلشنِ عشق'' میں کسی بھی جگہ خشکی یا پھیکا پن نہیں ہے۔بلکہ شگفتگی ہے۔جنگل کا منظر،شادی بیاہ کے مناظر وغیرہ میں نصرتی نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال کیا۔نصرتی کی منظر نگاری قاری کے ذہن کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔مثلاً دریا میں کشتیوں کے چلنے کا منظر نصرتی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ سمندر میں کشتیاں ایسے رواں تھیں جیسے پارہ کسی تھال میں ڈھلتا ہے۔سارا سمندر کالے بادل کی

مانند نظر آ رہا تھا۔سمندر میں تیرتی کشتیاں تیز بجلیوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ کشتیوں کی تیزی بحر کی موج سے بھی زیادہ تھی۔ اگر موج ان سے شرط باندھ کر دوڑے تو تھک کر کنارے پر جا لگے۔ اور منہ سے کف آنے لگے۔ جب تیز ہوائیں چلتی ہیں تو ہوا کے زور سے سمندر کی اونچی اونچی موجیں چڑھنے اترنے کی سیڑھیاں بن جاتی ہیں۔ موجیں اونچائی پر چڑھتیں ہیں تو ماہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور جب نیچے اترتی ہیں تو سمندر کی تہہ تک چلی جاتی ہیں۔ پانی کی موجیں کشتی کو آگے ڈھکیلتی ہیں تو دریا کی روانی کے لیے کشتی ہنڈولہ بن جاتی ہے۔ جہاں بھی نظر ڈالیں چاروں طرف پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔

چلیاں جل پہ کشتیاں ڈھل اس حال میں	ڈھلاتے ہیں پارے کو جوں تھال میں
کہیں بحر کو خلق کالا بدل	ہوراس تیز کشتیاں کو بجلیاں چپل
سبک مہ کی کشتی فلک بحر پر	چلے کیا کہ اس تھے بھی یہ جلد تر
اٹھے موج کوھاسنے کف بکف	کنارے پڑے لیا اپس مکھ میں کف
بندی باو جب یک بیکس سوں بھڑیاں	بلند موج سے چڑاُترتیاں سیڑیاں
چڑہت میں یو چڑتے چلیں ماہ لگ	اترنے میں اتریں سوماہی تلگ
جتا کچ جو کشتی کو جھولا لگے	وہ جھولا دریا کوں ہنڈولا لگے
دس آوے سو دیکھیں تو چوپھیر جب	اُپر آسماں ہور تلے نیرسب

چمپاوتی کے باغ کا منظر جہاں پھولوں کی دلآویزی اور پرندوں کی چہچہاہٹ کا منظر نصرتی اس طرح بیان کرتا ہے: باغ نہایت سرسبزو شاداب اور فرحت بخش تھا۔ اس باغ کا ہر پھول آسمان کے لیے داغ تھا۔ اگر یہ سرسبز و شاداب چمن اپنا عکس ڈالے تو ستاروں سے بھرا آسمان ہرا ہو جائے۔ باغ کی کلیوں کو دیکھ کر گل رخ مسکرانے لگتی ہیں۔ اور اس کے پھول حسینوں کے دل میں گدگدی پیدا کرتے ہیں۔ چندرمکھی کے پھول سے چاند کے سینے پر داغ تھا۔ اور سورج مکھی کی زردی سے سورج کا باغ زرد تھا۔ گل اورنگ کے تختے پر ایسی رونق اور بہار تھی جیسے زمرد میں یاقوت کے جڑنے سے ہوتی ہے۔ پیلک نے زرد ریشم کے کپڑے پہن رکھے ہیں دھنور نے اپنے بال سنوار کر شال اوڑھ رکھی ہے۔ کالی سلونی خوش الحان کوئل سیاہ دلکش و دلفریب لباس پہنے بیٹھی ہے۔ تیتر نے اپنے پاوں مہندی سے رنگے ہیں اور طوطی نے پان کھا کر اپنے لب رنگین کر لیے ہیں۔

فرح بخش یک سبز تر باغ تھا	فلک کو ہر یک پھول جس داغ تھا
سٹیں عکس سوتس منور چمن	ستارے بھریا ہووے ہریا گگن
دیکھت مسکٹیں گل رخاں ہر گلی	کریں دل کو خوباں کے گل گدگلی
چندر گل تے چندر کی چھاتی پہ داغ	گُل سورتے سور کا زرد باغ
گل اور نگ کا تختہ یوں اوت کا	کہ جوں پاچ میں کام یاقوت کا
پتمبر بندی زرد پیلک نے کھول	پٹیاں گھوٹ اوڑی دھنورشال کھول
سلونی خوش الحان کویل سیاہ	کری سام کسوت ادک خوش نگاہ

ٹیٹوری رنگی پاوں مہندی سوں سب کری پان طوطی نے کھا لعل لب

9.8.5 فوق فطری عناصر:

مثنویوں میں ابتدا ہی سے فوق فطری عناصر کی چھاپ نظر آتی ہے۔ یہ ایک روایتی انداز ہے، جو داستانوں کے تحت ہمیں مثنویوں میں ملتا ہے۔ دراصل انسانی خیالات، لاشعوری طور پر فوق فطری عناصر سے وابستہ ہوتے ہیں۔ مادی طاقتوں کے برعکس ہماری فہم وفراست غیبی قوتوں پر انحصار کرتی ہے اور ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کے ذریعے ہمارے درمیان انہونے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مزید اس طرح کی قوتوں اور ان کے ذریعے ہونے والے کاموں سے انسانی فکر ونظر ایک طرح کا سکون پاتے ہیں یا پھر ان کی خواہشات کی پذیرائی ہوتی ہے اس لیے مختلف موقعوں پر مختلف طریقوں سے فوق فطری عناصر کا تذکرہ مثنویوں میں ہوتا ہے یہ فوق فطری عناصر انسانی تمناؤں پر کمندیں ڈالتے ہیں۔ ''گلشنِ عشق''، میں فوق فطری عناصر کی کمی نہیں ہے۔ پریوں کی پروازیں، ان کے جادوئی بال، دیو کی کرامت، مدمالتی کا طوطی بننا، عشق ورقابت وغیرہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ راجا بکرم فقیر کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اس کی مدد پریاں کرتی ہیں۔ پریاں راجا بکرم کو اپنے سر کے بال دیتی ہیں۔

یک یک زلف کا تار ہرتن اُتال جودیں گیان سو جیوسون جتن رکھ سنبھال

چمپاوتی منوہر کو بتاتی ہے کہ کس طرح دیو باغ سے اسے اٹھا کر اپنے محل لے آیا۔ کہتی ہے زمیں سے آسمان تک گرد وغبار کا ایک پہاڑ اٹھا۔ میری سہیلیاں جو میرے ساتھ تھیں ان کی آنکھیں گرد وغبار سے بھر گئیں اور وہ سب اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھیں۔ اس غبار سے ایک دیو نکلا اور مجھے اٹھا کر اپنے محل لے آیا۔ اس دیو کے کئی روپ ہیں اور وہ ہمیشہ روپ بدلتے رہتا ہے۔ کبھی دجال بنتا ہے تو کبھی ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اور کبھی چاروں طرف نظر آنے لگتا ہے۔ اصل میں اس کے پانچ سر اور دس ہاتھ ہیں۔

زمین پر تے یک دھات سوں تا گگن کھڑا دھول کا تھام ڈونگر نمن
بھری سب سہیلیاں کی آنکھیاں میں دھول کمل پھول سیاں سب پڑیاں ہوش بھول
نکل دھول میں تے تب اک دیو زاد اڑا کر مجے واں تے خاشاک ناد
سو لیا کر اتاراس محل کے منجھار پھرا بھیس آ ج نظر کے تلھار
گپت روپ دھرتا ہے کئی اپے پاس پھراتا ہے بھیساں بورے بے قیاس
کبھیں روپ بدلا کے دجال ہو کبھیں دابۃ الارض فی الحال ہو
کبھیں دھڑ چوراآپنا ہو پون پھر آتا ہے ہر پل میں چاروں رخن
ولے اصل اس کا جو اک قد ہے بس اسے پانچ سر، ہور ہیں ہات دس

9.8.6 مکالمہ نگاری:

عام طور پر ایک آدمی جب کسی دوسرے سے مخاطب ہوتا ہے یا اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے تو مکالمہ کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ مکالمہ میں دراصل احساسات اور جذبات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ادب میں مکالمہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اسے کرداروں اور واقعات کی تہہ در تہہ تک رسائیوں کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مثنوی 'گلشنِ عشق' میں مکالمہ نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ نصرتی نے کرداروں کے ذریعہ مکالمے پیش کر کے مثنوی کی اہمیت

میں اضافہ کیا ہے۔مثنوی میں پریاں منوہر کے چاند سے چہرے کو دیکھ کر آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگتی ہیں۔

لگیاں بولنے سب بی کر اتفاق — کہ نیں جفت اسے ہے یو عالم میں طاق
ملیں گیاں اسے گرچہ ناریاں سروپ — ولے اس برابر اچھے کاں انوپ
نھنی سب تے یو بات نہ کر قبول — کہی کیا گیاں حق کی قدرت کوں بھول
کہ کرتار جس تن کوں سر جاے جب — کرے جفت کا اس کے اول سبب
اہے وہ نرنکار نیں جوڑ تس — اچھے سب کوں جوڑاچ دیکھے تو جس
کھیاں ہم سوں سب تج سوں اب ہوڑ ہے — کہ یو پرس تو جگ میں بے جوڑ ہے
یو سن بات ہو پھر کے رنجیدہ دل — کہی اب کریں آو یک شرط مل
ہمیں نو پریاں جائیں نو کھنڈ پر — ڈھونڈیں خوب ہر ٹھار میں دھر نظر
دسے جفت اس کا جو کرتے تلاش — مجے تو کہو سب جنیاں شاد باش
کھنڈے کھنڈ ڈھونڈنے کوں جیوں بھار جائیں — سو تیوں سب خبر لے کے پھر یانچ آئیں

منوہر اور مدمالتی دونوں ایک دوسرے کو خواب گاہ میں دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں۔ان دونوں کے درمیان ہوئے مکالموں کو نصرتی اس طرح بیان کرتا ہے۔مدمالتی کہتی ہے کون ہے تو، کوئی سایہ ہے۔دیو ہے یا پھر کوئی انسان ہے۔جو شکل بدل کر مجھے ستانے آیا ہے۔میرا باپ یہاں بہادر اور طاقتور مانا جاتا ہے۔اس نے ساری دنیا سے ظلم وستم کا خاتمہ کیا ہے۔اب تو اپنی جان گنوانے کے لیے یہاں آیا ہے۔مدمالتی کی باتیں سن کر منوہر کہتا ہے۔تم کون ہو اور مجھے کیوں ڈرا دھمکا رہی ہو۔تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے تم کیا کہہ رہی ہوں۔یہ تمہارا نہیں یہ ہمارا شہر کنگ گیر ہے۔میرا باپ بکرم یہاں کا راجا ہے۔اور یہاں راج کرتا ہے۔وہ سارے راجاؤں کا راجا ہے۔یہ شاندار محل جو تم دیکھ رہی ہو یہ میرا محل ہے۔مدمالتی کہنے لگی تم ہوش کی باتیں کرو، دیوانوں جیسی باتیں نہ کرو۔اس شہر کا نام تو مہارس نگر ہے۔یہ محل میرا ہے۔یہاں کا بادشاہ میرا باپ دھرم راج ہے۔جو سارے جگ میں مشہور ہے۔اور میرا نام مدمالتی ہے۔

کہی کون ہے تو ں سو اظہار کر — پرا ہے کہ یا دیو یا ہے بشر
گپت روپ کایا ہے بی کچ بلا — ستر نے مج آیا ہے کر مبتلا
مرا باپ ورکش ہے اس دھات کا — کہ کاڑیا ہے جڑ جگ تے آفات کا
مگر جاں جیو تج کوں فاضل اتھا — یو سکھ زندگانی کا مشکل اتھا
تو کھونے بدل جیو نا کام میں — اپستے اپیں آپڑادام میں
کھیا سن کے یو بات منہر کنور — کہ توں کون اپیں کیا دکھاتی سو ڈر
کنا اس روش کیا ہے اندازہ تج — کہ ہے یو کنگ گیر کر شہر مج
مرا باپ بکرم کرے راج یاں — کہا تا ہے راجاں کا سر تاج یاں

اتھا یو محل اصل اجلا تمام — اسی ٹھار میرا ہے نس دن مقام
کہی بے ہشی کی توں کھایا اہے — ہو دیوانہ چپ من گنوایا اہے
مہارس نگر اس شہر کا ہے نانو — اہے اس محل میں سو میراچ ٹھانو
دھرم راج مج باپ ہے جگ پتی — اہے نانو میرا سو مد ھ مالتی

9.8.7 تہذیبی عناصر:

مثنوی ''گلشنِ عشق'' میں نصرتی نے مختلف رسم ورواج کی عکاسی کر کے اس زمانے کی معاشرت کی نشاندہی کی ہے، جیسے شہزادے کی ولادت پر نجومیوں سے زائچہ بنوانا، فقیروں کی دعائیں لینا، شادی بیاہ کی رسومات مثلاً ہلدی، مہندی، سانچق، چوک، بری، سمدھاوے، نیوتے، پان، جلوہ کی رسم، آرسی مصحف کی رسم، رخصتی اور بھوڑے کی رسم وغیرہ۔ چندرسین اور چمپاوتی کی شادی طے پاتی ہے۔ دونوں جانب سے شادی کی تیاریاں زور وشور سے ہونے لگیں۔ دولہے اور دلہن والوں نے ایک دوسرے کو پان اور قیمتی کپڑوں کے تحائف ونذرانے دیے۔ روزانہ شادی کی رسمیں انجام دی جانے لگیں۔ چندرسین کے گھر سے دلہن کے لیے بری کا سامان گیا تو دلہن چمپاوتی کے گھر سے ڈھیر سارا جہیز چندرسین کے گھر پہنچا۔ دھرم راج دولہے چندرسین کو لے کر دلہن چمپاوتی کے گھر پہنچا تو دولہے کے استقبال کے لیے منوہر آگے بڑھا اور بڑی شان وشوکت کے ساتھ اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اور قاضی نے چندرسین اور چمپاوتی کا عقد پڑھا۔

یکس گھر تے یک تا زہ رسما نہ روز — لجا ویں ادک چا ؤں سوں دل فروز
بری شو کے جا نے میں آیا جہیز — کئی ساز سر گشت ادک تیز تیز
دھرم را ج اپنے منا سب ستی — اپس شا ن کے ات مرا تب ستی
اجا لے سوں پر نور کر کوہ و دشت — چلیا لے چندر سین کا شہر گشت
مروتے ہر ایک چوک بازار تے — بنی گھر کو انپڑی پڑے بھارتے
جو منہرا تھا سوربل کی طرف — انگے شو کے آیا سرب لے کے صف
عزیزاں کی تعظیم رکھ ما ن سوں — چلیا لے کے ویں شوکت و شان سوں

نصرتی نے ''گلشنِ عشق'' میں عادل شاہی عہد کے تہذیب وتمدن کے مرقعے جگہ جگہ پیش کیے ہیں۔ اس نے مختلف کھان پان، لباس، زیورات، محفلوں کی سجاوٹ وغیرہ کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔

مدمالتی کی خواب گاہ کی سجاوٹ نصرتی اس طرح بیان کرتا ہے: محل دیدہ زیب آرائش وزیبائش سے جگمگا رہا تھا۔ جگہ جگہ چراغ روشن تھے۔ اور ان کی روشنی آسمان پر موجود ستاروں کو مات دے رہی تھی۔ جگہ جگہ تخت بچھائے گئے تھے۔ ستون، چھت، دیوار اور پردے سب رنگے ہوئے تھے۔ اور پھولوں کی خوشبو ہر سو مہک رہی تھی۔

عروسی محل سرخ دِستا ہے زیب — کیے ہیں سو آرایش دل فریب
لگا جا بجا نورتن شب چراغ — دیے ہیں سو افلاک کے تن پہ داغ

سہاویں سریاں سوہرٹھار ٹھار سر نگ صدر ہر ٹھانوپر رزنگار
ستوں ،سقف ودیوار وپردیاں کوں سب رنگ آمیز سہتے تماشاں عجب
پھولاں کیا اندھاریاں سوخوش باس سوں دیویں زیب بہتر نو آکاس سوں

منوہراور مد مالتی کی شادی کے موقع پر مہمانوں کی ضیافت کے لیے انواع اقسام کے پکوان پکائے گئے، جیسے مزعفر، قبولی، خشکا، کھچڑی، کوفتے، کاک، کماچاں، ملیدہ اورسیویاں وغیرہ۔نصرتی ان پکوانوں کی لذت اورذائقے کواس طرح بیان کرتا ہے۔

ہوئے تھے کندوریاں تے رنگین چمن کھلے تھے سو پکوان کے پھول بن
مزعفرنہ کہہ،زعفراں زار تھا قبولی میں سوسن کا مہکار تھا
پھرا راچ خشکا اتھا سوسوباس دیا موگرے کے کلیاں کو اداس
سہاتی تھی کھچڑی مسالے کی یوں نشمین ہے پھل ،پھول ،پاتاں کا جیوں
اچھے کوفتے ہور لنوآس پاس گلِ اورنگ ہور گیند مخمل اداس
گل چاند کاکاک پائے خطاب کماچاں دسے جیوں گل آفتاب
ملیدے کے جن ٹیک پر رخ کرے چھوٹیں بھوت چینی تے گھیوے کے جھرے
جو سنپڑیا سو سیویاں کے سیوال میں گونتیا دودھ ہور گھیوکے جنجال میں

9.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ گلشن عشق عادل شاہی عہد میں لکھی گئی ایک شاہکار مثنوی ہے۔اس کا مصنف نصرتی ہے۔
☆ عادل شاہی سلطنت دکن کی ایک وسیع سلطنت تھی اس کا بانی یوسف عادل خاں تھا۔
☆ عادل شاہی سلاطین علم دوست اورفیاض تھے۔عادل شاہی عہد دکنی زبان وادب کا عہد زریں ہے۔
☆ نصرتی علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔
☆ نصرتی نے تین مثنویاں لکھیں۔گلشن عشق، علی نامہ اورتاریخ اسکندری۔یہ تینوں دکنی ادب کی شاہکار مثنویاں ہیں۔
☆ گلشن عشق کا سنہ تصنیف 1656ء ہے۔
☆ گلشن عشق میں اشعار کی تعداد 4406 ہے۔
☆ گلشن عشق میں منوہراور مد مالتی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے
☆ مثنوی میں نصرتی نے قصہ نگاری، کردارنگاری، جذبات نگاری، منظرنگاری فوق فطری عناصراور مکالمہ نگاری میں اپنا کمال دکھایا ہے۔
☆ مثنوی گلشن عشق میں عادل شاہی عہد کی تہذیب وتمدن اوررسم ورواج کی مرقع کشی ملتی ہے۔

9.10 کلیدی الفاظ

الفاظ		معنی
چھند	:	فن،فریب،ہنر
ڈھل	:	عماری
سٹیں	:	پھینکنا
بھیساں	:	شکلیں
ڈھیٹر	:	جسم
کندوریاں	:	کندوری (دسترخوان) (ضیافت)
پھرار	:	پرچم،جھنڈا
کاک	:	روٹ،میٹھی روٹی
کماچاں	:	نان کی ایک قسم
سرپوش	:	وہ کپڑا جو خوان پر ڈالتے ہیں،ڈھکنا
نوکھنڈ	:	سات آسمان مع عرش وکرسی
کونڈے	:	شرمندہ
گھنوری	:	غارت گری
اچنبک	:	عجیب،انوکھا
مندھیر	:	مکان
کاڑنا	:	نکالنا
نھاٹیا	:	بھاگ گیا
نسنگ	:	الگ،تنہا
آرسی	:	آئینہ
قماشاں	:	ریشمی کپڑے
بھیتر	:	اندر

9.11 نمونہ امتحانی سوالات

9.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ عادل شاہی سلطنت کب قائم ہوئی؟

2۔ عادل شاہی سلطنت کا بانی کون ہے؟

3۔ عادل شاہی سلطنت دکن کی کس سلطنت کے زوال کے بعد وجود میں آئی ؟

4۔ عادل شاہی سلطنت میں کتنے بادشاہ گذرے؟

5۔ ابراہیم عادل شاہ کس نام سے مشہور تھا؟

6۔ کس عادل شاہی بادشاہ کو استاد عالم کہا جاتا ہے؟

7۔ علی عادل شاہ ثانی کا تخلص کیا ہے؟

8۔ مثنوی گلشن عشق کا سنہ تصنیف کیا ہے؟

9۔ مثنوی گلشن عشق میں جملہ اشعار کی تعداد کتنی ہے؟

10۔ مثنوی گلشن عشق کے کرداروں کے نام بتایئے۔

9.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ عادل شاہی عہد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

2۔ نصرتی کی مثنوی نگاری کا جائزہ لیجیے۔

3۔ مثنوی گلشن عشق میں نصرتی کی جذبات نگاری پر بحث کیجیے۔

4۔ نصرتی کو منظر نگاری میں کمال حاصل تھا ثابت کیجیے۔

5۔ مثنوی گلشن عشق کا قصہ بیان کیجیے۔

9..11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نصرتی کے حالات زندگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ بیان کیجیے۔

2۔ مثنوی گلشن عشق میں نصرتی نے عادل شاہی عہد کی تہذیب وتمدن اور رسم ورواج کو کس طرح پیش کیا ہے؟ تفصیل بیان کیجیے۔

3۔ ثابت کیجیے کہ مثنوی گلشن عشق عادل شاہی عہد کی ایک شاہکار عشقیہ مثنوی ہے۔

9.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	نصرتی	ڈاکٹر عبدالحق
2۔	تاریخ ادب اردو	پروفیسر سیدہ جعفر
3۔	تاریخ ادب اردو ،جلد اول ،حصہ اول	ڈاکٹر جمیل جالبی
4۔	گلشن عشق	سید محمد

اکائی 10: سلطان محمد قلی قطب شاہ کی غزل گوئی

(شاعر کا تعارف، منتخبہ دو غزلوں کی تشریح)

اکائی کے اجزا

10.0		تمہید
10.1		مقاصد
10.2		سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات زندگی
10.3		سلطان محمد قلی قطب شاہ کی غزل گوئی
	10.3.1	تصور محبوب
	10.3.2	ہندوستانیت
	10.3.3	مذہبی رنگ
	10.3.4	ریختی گوئی
	10.3.5	صنائع بدائع اور صوتی تکرار
10.4		منتخبہ دو غزلوں کا متن مع تشریح
	10.4.1	غزل نمبر 1: دلا منگ خدا کن کہ خدا کام دویگا
	10.4.2	غزل نمبر 2: خبر لیا ہے ہد ہد میرے تیئیں اس یار جانی کا
10.5		اکتسابی نتائج
10.6		کلیدی الفاظ
10.7		نمونۂ امتحانی سوالات
	10.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	10.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	10.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
10.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

محمد قلی قطب شاہ، مملکتِ گولکنڈہ کا پانچواں حکمران تھا۔ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے بعد وہ 15 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا

اوراکتیس سال حکومت کرنے کے بعد سینتالیس سال کی عمر میں فوت ہوا۔اپنی مملکت میں بسنے والے مختلف طبقات کے مابین بھائی چارگی کے جذبات کی نشو ونما اور شہر حیدرآباد کا قیام اس کے دورِ حکومت کے کارہائے نمایاں ہیں۔

محمد قلی، قطب شاہی سلطنت کا ایک رعایا پرور حکمران ہی نہیں تھا بلکہ اقلیمِ سخن کا تاج دار بھی تھا۔اس کے دور میں شعر وسخن اور علم وادب کے پہلو بہ پہلو فنونِ لطیفہ کو بھی فروغ حاصل ہوا۔محمد قلی نہ صرف اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے بلکہ وہی پہلا غزل گو بھی ہے جس نے ایک ایسے دور میں صنفِ غزل پر خصوصی توجہ کی جب کہ دیگر تمام دکنی شعرا مثنوی نگاری میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

محمد قلی کی غزلوں میں ایک طرف اندازِ بیان کی سادگی، سلاست، روانی اور برجستگی نظر آتی ہے تو دوسری طرف ہندوستانی رسم ورواج، مقامی ماحول، مقامی طرزِ معاشرت اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کی عکاسی وترجمانی بھی نظر آتی ہے۔اردو شاعری پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہمارے شعرا ہندوستان میں بیٹھ کر شیراز واصفہان کے راگ الاپتے ہیں۔ یہ اعتراض شمالی ہند میں نشو ونما پانے والی شاعری کے لیے کسی حد تک درست ہوسکتا ہے لیکن محمد قلی اور دکنی کے دیگر شعرا اس سے بری ہیں کیوں کہ محمد قلی کی شاعری میں ایران کے لالہ زاروں، وہاں کے دریاؤں، پہاڑوں یا قصوں کے بجائے ہندوستانی موسموں، نظاروں، پھولوں، پھلوں، پرندوں، جانوروں، رسوم ورواج، مقامی اقدار، روایات اور رجحانات سے اثر پذیری اور ان کی ترجمانی ملتی ہے۔اس اکائی میں ہم سلطان قلی قطب شاہ کے حالات زندگی اور اس کی غزل گوئی کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اس کی دو غزلوں کا مطالعہ بھی کریں گے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات زندگی کو بیان کر سکیں۔
- ☆ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کر سکیں۔
- ☆ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی منتخب غزلوں کی تشریح کر سکیں۔

10.2 سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات زندگی

ابوالمظفر سلطان محمد قلی قطب شاہ، بانیِ مملکت گولکنڈہ سلطان قلی قطب الملک کا پوتا، ابراہیم قطب شاہ کا تیسرا فرزند اور قطب شاہی سلطنت کا پانچواں فرماں روا تھا۔وہ 14 رمضان المبارک 973 ھ مطابق 14 اپریل 1565ء کو بروز جمعہ گولکنڈے میں پیدا ہوا۔اس کی ولادت کے موقع پر گولکنڈے میں کئی دنوں تک جشن کا اہتمام کیا گیا اور مسکینوں اور فقیروں کو انعام واکرام اور خلعت سے نوازا گیا۔مورخین کا بیان ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کی ماں ''بھاگیہ رتی'' ایک ہندو خاتون تھی۔محمد قلی کی تخت نشینی 15 سال کی عمر میں 988ھ/1580ء میں عمل میں آئی۔اس نے کم وبیش اکتیس برس تک نہایت تزک واحتشام کے ساتھ حکمرانی کی اور 47 سینتالیس سال کی عمر میں 1020ھ/1611ء میں انتقال کیا۔محمد قلی کے معاصرین میں یہ عہد شمالی ہند میں مغل فرماں روا اکبرِ اعظم اور جنوبی ہند میں عادل شاہی حکمران ابراہیم عادل شاہ ثانی ''جگت گرو'' کا تھا۔انگلستان میں یہ دور ملکہ ایلزبیتھ کا تھا جسے شیکسپیئرین دور بھی کہتے ہیں۔اول الذکر دو سلاطین، محمد قلی کی طرح ہندوستانی تہذیب وتمدن کے فروغ اور اپنی مملکت میں بسنے والے تمام طبقات کے مابین یک جہتی، اتحاد اور رواداری کے جذبات کی ترویج کے سلسلے میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ مورخین جس

تہذیب وتمدن کو ''ہندلمانی کلچر'' کے نام سے یاد کرتے ہیں اس کے نمایاں خدوخال' اکبر اعظم' محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے دور میں نظر آتے ہیں۔

مختلف تذکروں اور تاریخوں میں محمد قلی کے پانچ بھائیوں شاہ عبدالقادر حسین قلی' عبدالفتاح' خدابندہ' محمد امین اور دو بہنوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک بہن دکن کے مشہور صوفی حضرت حسین شاہ ولی سے بیاہی گئی تھیں اور دوسری شاہ مظہرالدین کی اہلیہ تھیں۔

محمد قلی قطب شاہ کو خوش قسمتی سے ایک مستحکم اور طاقتور حکومت اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ اس کا دورِ حکومت دو ایک معمولی لڑائیوں کو چھوڑ کر بڑی حد تک امن وامان میں گزرا۔ یہ ضرور ہے کہ اندرونِ ملک اس کے مخالفین نے وقتاً فوقتاً سازشیں کیں اور کبھی کبھی ہنگامے بھی کھڑے کیے لیکن محمد قلی کو انھیں کچلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ محمد قلی کی سخاوت اور کشادہ دلی کا تذکرہ کم وبیش تمام مورخین نے کیا ہے۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے دربار کے امیروں' فوجی افسروں' شاعروں اور اہلِ کمال کو بلاتفریقِ مذہب وملت بڑے بڑے انعامات اور اعزازات عطا کیے۔ اس کے دورِ حکومت میں ایران کے مشہور عالم میر مومن حیدرآباد آئے تھے جنھیں بادشاہ نے اپنا مشیر مقرر کیا تھا۔ سلطنت کے بیشتر کاروبار کی عام نگرانی میر مومن ہی کے سپرد تھی۔ یہی سبب تھا کہ محمد قلی کو سیاسی فکروں سے آزاد رہ کر عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔

محمد قلی کی تعلیم وتربیت اس کے بڑے بھائیوں شاہ عبدالقادر اور حسین قلی کے مقابلے میں ادھوری اور ناقص رہ گئی تھی۔ اس نے متعدد اشعار میں اپنے آپ کو ''اُمّی'' (ان پڑھ) لکھا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تعلیم سے بالکل محروم تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی تعلیم وتربیت اس کے بھائیوں کے نہج پر نہیں ہوئی تھی اور وہ علومِ عربیہ' فقہ' تصوف' منطق وغیرہ میں مہارت نہیں رکھتا تھا تاہم فنِ شاعری کے رموز وآداب سے کما حقہ واقفیت رکھتا تھا اور اس نے اساتذۂ فارسی خاقانی' انوری' عنصری اور خصوصاً حافظ شیرازی کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ حافظ شیرازی کا وہ پہلا مترجم ہے ۔اس نے خواجہ حافظ کی متعدد غزلوں کا دکنی اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ نموتاً دو اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

گل بے رخِ یار خوش نہ باشد　　پُھل بن رخِ یار خوش نہ دیسے
بے بادہ بہار خوش نہ باشد　　بنِ مد پھلی جھاڑ خوش نہ دیسے
با یارِ شکر لب و گل اندام　　مو یارِ شکر لب و چنپا رنگ
بے بوس و کنار خوش نہ باشد　　بن چمّنِ یار خوش نہ دیسے

محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا ایک یادگار کارنامہ شہر حیدرآباد کا قیام ہے۔ محمد قلی کی بلند خیالی' ایک وسیع اور متمدن شہر کی طلب گار تھی۔ اس زمانے میں قلعۂ گولکنڈہ کے اطراف آبادی بے ہنگم طور پر پھیلتی جارہی تھی۔ آبادی کی ضروریات کے لحاظ سے یہ شہر ناکافی تھا۔ چناں چہ محمد قلی نے شہر گولکنڈہ کے قریب ایک وسیع اور منصوبہ بند شہر کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا۔ چار مینار اس شہر کا مرکزی مقام قرار پایا۔ اس کے اطراف چاروں جانب سیدھی سڑکیں بنائی گئیں اور قرب وجوار میں شاہی محل تعمیر کروائے گئے۔ محمد قلی نے شہر کے قیام کے ساتھ ہی اس بات کا پورا لحاظ رکھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں موجود ہوں۔ چناں چہ اس شہر میں بے شمار مسجدیں' خانقاہیں' مدرسے' عاشور خانے' لنگر خانے' مہمان خانے اور کاروان سرائیں بنائی گئیں۔

محمد قلی نے حیدرآباد کو دنیا کا ایک بارونق شہر بنانے کے لیے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس کو اپنے شہر سے اس قدر محبت تھی کہ وہ اس کی آبادی

کے لیے خدا سے دعا کرتا ہے کہ ''اے خدا میرے شہر کو تو لوگوں سے اس طرح معمور کر دے جس طرح تو نے دریا کو مچھلیوں سے بھر دیا ہے۔''

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

تمدنی اور سماجی نقطۂ نظر سے محمد قلی کا عہدِ حکومت تاریخ دکن میں ایک یادگار دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ محمد قلی نے اس بات کی خاص طور پر کوشش کی کہ اس کی مملکت میں بسنے والے مختلف فرقوں کے درمیان یگانگت اور بھائی چارگی کے جذبات نشو ونما پائیں۔

10.3 سلطان محمد قلی کی غزل گوئی

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ گولکنڈے کے چھٹے حکمراں اور محمد قلی کے بھتیجے اور داماد سلطان محمد قطب شاہ نے 1616ء میں کلیاتِ محمد قلی کو مرتب کر کے اس پر ایک منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔ محمد قلی کو اردو کے پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کے علاوہ یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس نے صنفِ غزل پر سب سے پہلے باقاعدہ طبع آزمائی کی۔ تعداد اور تنوع کے اعتبار سے جتنی غزلیں محمد قلی قطب شاہ کے یہاں ملتی ہیں اتنی دکنی اردو کے کسی اور شاعر کے دیوان میں نہیں ملتیں۔

محمد قلی نے ایک ایسے دور میں غزل کی صنف پر خصوصی توجہ دی جب کہ دبستانِ دکن میں مثنوی کا طوطی بول رہا تھا۔ محمد قلی سے قبل دکنی اردو میں غزل کی روایت نہایت کمزور تھی۔ صرف مشتاقؔ، لطفیؔ، فیروزؔ، محمودؔ اور ملا خیالیؔ کی اکا دکا اور متفرق غزلیں ہی کل کائناتِ غزل تھی۔ محمد قلی نے یوں تو تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کا شاعر ہے۔ مثنویوں اور رباعیوں کو چھوڑ کر اس کا سارا کلام غزل کی ہئیت میں ہے یہاں تک کہ اس کی وہ تخلیقات بھی جنھیں ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر سیدہ جعفر نے عنوانات قائم کر کے نظم سے تعبیر کیا ہے، دراصل مسلسل اور مربوط غزلیں ہی ہیں اور خود محمد قلی نے ایسی تخلیقات کے لیے 'غزل' ہی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ جیسے ''غزل مرگ''، ''غزل سوری''، 'مبعث کا غزل' وغیرہ۔

نبی صدقے کھیا ہے قطب مبعث کا غزل رنگیں
کہ اس کی تازگی ہور روشنی تھے ہے جہاں روشن

محمد قلی ایک پرگو اور قادر الکلام شاعر تھا اس کی ضخیم کلیات پچاس ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ اس کی موزونیِ طبع کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر روز اسی طرح شعر کہنے پر قادر تھا جس طرح دریا میں روز موجیں اٹھتی ہیں اس کے باوجود دریا کی روانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ چناں چہ خود محمد قلی کہتا ہے:

صدقے نبی قطب شہ یوں شعر بولے ہر دن
دریا کوں روز جوں ہے موجاب کا طلوع

محمد قلی کی غزل گوئی کی سب سے نمایاں خصوصیت اظہارِ بیان کی سادگی ہے۔ وہ اپنے جذبات واحساسات اور مشاہداتِ زندگی کو سیدھے سادے انداز اور سہل زبان میں پیش کرتا ہے۔

نین تیرے دو پھول نرگس تھے زیبا نزاکت ہے تج مکھ میں رنگیں چمن کی
صباحی او مکھ دیکھ پینا شراب فرح بخش ساعت میں لینا شراب
ترے نیہہ بن جیونا منج نہ بھاوے مسیحا نمن آپ دم سوں جلا منج
خبر لیایا ہے ہد ہد میرے تئیں اس یارِ جانی کا خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں رازِ نہانی کا

ٹک آ کے کرو گشت چمن جی اٹھے سارا بن سیر تمن ساری کلیاں سوک رہی ہیں

محمد قلی کی زندگی سراسر عیش کی زندگی تھی۔شراب نوشی اور عشق بازی اس کے محبوب مشاغل تھے۔

شراب ہور عشق بازی باج منج تھے نارھیا جائے

کہ یو دو کام کرنا کر لئی سوگند کھایا ہوں

محمد قلی ایک کثیر المحبوب شاعر ہے۔اس کے محلوں میں کئی ملکوں کی متعدد حسینائیں موجود تھیں۔بادشاہِ وقت ہونے کی وجہ سے اس کو کبھی کسی محبوبہ کا انتظار نہیں کرنا پڑا بلکہ اس کی محبوبائیں خود اس کے درشن کے لیے ہمیشہ آنکھیں بچھائے رہتی تھیں۔اس لیے اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کے پورا نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔محمد قلی کے کلام میں فکر کی گہرائی یا رنج والم کے جذبات ملیں گے اور نہ بدنصیبی یا ناکامی کا شکوہ ملے گا۔اس نے اپنی زندگی کی بہاریں عیش ونشاط اور راگ رنگ میں گزاریں اس لیے اس کی شاعری میں رنگ رلیاں اور مستیاں ہیں' رنگینی و رعنائی ہے' سیرابی و سرمستی ہے' تازگی و شگفتگی ہے۔غرض آسودگی کے تمام روپ اس کی غزلوں میں جلوہ گر ہیں۔اس نے اپنے آپ کو مسرور رکھا اور خوشی کے اظہار کے لیے جھوم جھوم کر گیت گائے ہیں۔

سجن کے ہونٹ امرت کا لذت یک دیس چاکے تھے سو او لذت کوں اجنوں لک کیا ہے مج رسن تعویذ

پیاسوں رات جاگی ہے سو دستی ہے سودھن سرخوش مدن سرخوش' سین سرخوش' انجن سرخوش' نین سرخوش

ساقیا آشراب ناب کہاں چند کے پیالے میں آفتاب کہاں

سودھن جا' عیش' کوں پوچھی کہ توں آیا ہے کس خاطر کھیا ہنس عیش ازل تھے میں قطب شہ خاطر آیا ہوں

ترے دو نین ہیں مد مست متوال ترے دو گال ہیں خوبی کے گلال

10.3.1 تصورِ محبوب:

دکنی اردو کے دوسرے متغزلین کی طرح محمد قلی کا تصورِ محبوب اردو شاعری میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ محبوب تصوری و خیالی پیکر نہیں بلکہ اسی عالم رنگ و بو میں رہنے بسنے والا گوشت پوست کا مادی اور مجازی محبوب ہے۔محمد قلی کے یہاں محبوب کی جنس مبہم نہیں رہتی بلکہ برملا انداز میں وہ اس کے لیے صیغۂ تانیث کا استعمال کرتا ہے اور سکی' سہیلی' دھن' سودھن' ناری' پیاری' پدمنی' سندری' ٹھنی' سانولی' گوری' چھبیلی' کنولی' پدمنی' ہندی چھوری وغیرہ ناموں سے یاد کرتا ہے۔چند شعر دیکھیے:

دھن سیس پر پھولاں جڑے انبر پہ جوں تارے جڑے حوراں ملک دیکھن کھڑے دستا تماشا یو بڑا

ایسی سندر کوں پایا ہوں خدا کے رحم تھے قطبا جو حوراں ہور ملک دیکھ کر ہوے حیران سارے ہیں

عشق کی پتلی ہے گوری رنگیلی چتر نیناں میں دستی ہے چھبیلی

برستا سیس تیرے نور جلوہ نہ دیکھی تجھ سی کوئی سندر سہیلی

رنگیلی سائیں تھے یوں رنگ بھری ہے سگڑ سندر سہیلی گن بھری ہے

10.3.2 ہندوستانیت:

محمد قلی قطب شاہ ہندوستانیت کا بہت بڑا پرستار ہے۔اس کی رگ وپے میں ہندوستان کی تہذیب سرایت کرگئی ہے۔وہ ہندوستان کی

ہر نمایاں اور مشہور رسم اور تہوار کے علاوہ وضع قطع کو اپنے فکر و عمل میں بسا لینا چاہتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اس نے اپنے آبا و اجداد کی روش سے ہٹ کر دکنی وضع قطع اور لباس اختیار کیا۔ قطب شاہی سلاطین میں وہ پہلا بادشاہ ہے جس نے ڈاڑھی کے بجائے مونچھ رکھی۔ گلے میں ہندوؤں کی طرح کپڑا (انگ وسترم) ڈالا اور قاقم و سنجاف و سمور کے کوٹ اور کنچوں کی جگہ دکن کے موسم کے لحاظ سے دیسی ململ کے سادہ کپڑے زیب تن کیے۔ محمد قلی کی غزلیں نہ صرف ہندوستانی عیدوں، تہواروں، موسموں، پھلوں، پھولوں، پرندوں، کھیلوں وغیرہ کی مکمل ترجمانی کرتی ہیں بلکہ ہندوستانی عوام کے طور طریقوں، رسومات، معتقدات اور توہمات کی آئینہ دار بھی ہیں۔ محمد قلی کی تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں میں بھی ہندوستانی تہذیب کی روح رچی بسی ہوئی ہے۔ محمد قلی کی تخلیقات کا بیشتر مواد اس کے گرد و پیش کے حالات اور مقامی ماحول کے گوناگوں تجربات سے حاصل کیا ہوا ہے جو تشبیہوں، استعاروں، تلمیحوں اور اظہارِ بیان کے پیکروں، علامتوں اور کنایوں کے سہارے شعری صورت اختیار کر لیتا ہے۔

کمل پھول پر تو بھنور ہے لذیذ — ولے مکھ پہ تجھ تل بھنور تھے لذیذ
توں سب میں اتم ناری تج سم نہیں — کویل تیرے بولاں تھے ہاری دسے
تری چال بدمست تھے لاجیں گج — نہیں ان میں اے بھید ہور اے شتاب
اپن قد سرو دکھلاکر کیے شرمندہ سرواں کوں — توں اپنی چال دکھلا کر ہنساں کی چال بسرائی
بت خانہ نین تیرے ہور بت نین کیاں پتلیاں — مج نین ہیں پوجاری پوجا ادھان ہمارا
کیس کھولے کرنے کنگی رات ہے ہمناں کو وہ — مانگ کاڑے جب سکی وو دیس ہمناں کوں صبا
کجل نیناں سہیلیاں کے سوپر مل سیام باداماں — تھڈی ہے سیب دسناں جوں کہ چارولیاں ہیں چاریاں کی

ان اشعار میں محبوب کے حسین چہرے کو کنول، تل کو بھنور (بھنورا) آواز کو کویل کی سریلی آواز، خرام یار کو کبھی مست ہاتھی اور کبھی ہنس کی چال، قد کو سرو، بکھری ہوئی زلفوں کو رات، مانگ کو صبح، کجراری آنکھوں کو گہرے نیلے رنگ کے بادام، ٹھوڑی کو سیب اور دانتوں کو چارولیوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

10.3.3 مذہبی رنگ:

محمد قلی کی غزلوں میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ مذہبی رنگ بھی شدت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی بیش تر غزلیں ''نبی صدقے'' اور علی صدقے'' سے شروع ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ محمد قلی مذہب پر بھرپور عقیدہ رکھتا ہے اور مذہبی ریت رسوم پر بھی چلتا ہے لیکن مذہب کی حقیقی روح سے اس کی شخصیت اور شاعری دونوں عاری ہیں۔ اسے صرف مذہب کے تہذیبی پہلوؤں سے دلچسپی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ اپنی عیش کوشی کو بھی ''نبی'' اور ''علی'' کا صدقہ قرار دیتا ہے۔ مذہبی نظموں کے علاوہ اس کی غزلوں میں ''نبی صدقے'' اور ''علی صدقے'' سے شروع ہونے والے بے شمار مقطعے موجود ہیں:

نبی صدقے قطب جم عیش کر عیش — کہ تج در پر کھڑے ہیں فتح و اقبال
محمد ہور علی کا ناؤں لے کر قطب شہہِ جینیا — سو چنچل کے دو جوبن گڑ وہ تس اوپر کے بھی تن تعویذ
نبی صدقے بارہ اماماں کرم تھے — کرو عیش جم بارہ پیاریاں سوں پیارے

محمد قلی کو مذہب اس لیے عزیز ہے کہ اس کی مدد سے اسے زندگی، حکومت، دولت، عروج اور دنیوی اعزاز حاصل ہوا۔ حمد ونعت، مناجات اور منقبت کے علاوہ اس نے عیدِ میلاد، شبِ معراج، شب برات، رمضان، بقر عید اور دوسری عیدوں پر متعدد غزل نما نظمیں لکھی ہیں اور ایامِ عزاداری کا اہتمام بھی کیا ہے۔ لیکن کہیں بھی وہ ایک متقی یا پرہیز گار کی طرح عبادت کرتا نہیں نظر آتا بلکہ ہر عید اور تقریب میں اسے یہ فکر رہتی ہے کہ اس کی پیاریوں نے آج کون سا لباس زیب تن کیا ہے اور نبی کے صدقے سے آج وہ کتنی حسین دکھائی دے رہی ہیں۔

نبی صدقے قطب بہو گن رین دن عیش کرنے تھے	یوَن سرخوش، مدن سرخوش، جگن سرخوش مکن سرخوش
نبی صدقے کہی قطبا کی پیاری	رجھا دم دم اُدھر پیالا پلاتی
نبی صدقے قطب شہہ لگیا ہے دھن کے گلے	جوں لام الف نمن مل رہے الف ہور لام
نبی صدقے قطب سرمست ہوکر	پیاریاں سوں گمائے رات ساری

10.3.4 ریختی گوئی:

محمد قلی کے کلام میں ریختی کے نمونے بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اس قبیل کی غزلوں کے مطالعے سے محمد قلی کی قادر البیانی اور بے پناہ شعری صلاحیتوں کے علاوہ عورتوں کی نفسیات کے بارے میں اس کے شعور کا بھی پتہ چلتا ہے۔ محمد قلی نے نسوانی زبان اور نسائی لب و لہجے میں صنفِ نازک کے جذبات واحساسات کی بڑی موثر ترجمانی کی ہے۔ اس نے غزلوں کے مقابلے میں ریختیاں زیادہ ڈوب کر کہی ہیں اس لیے ان میں زیادہ نکھار اور تاثر کی فراوانی نظر آتی ہے۔ موزوں الفاظ، دل کش تراکیب، حسین استعارات اور خوب صورت تشبیہات کے ذریعے اس نے اپنی محبوباؤں کو گویائی عطا کی ہے:

جن پیو تھے بچھڑے اسے سنسار میں نئیں کچ حظ	جس ٹھار میں وو پیو نئیں اس ٹھار میں نئیں کچ حظ
مرے سیج آرے مرے ساجنا	دو ہاتھوں میں لے لے یہ دو جوبناں
پیا بچھڑا ہے منج کوں دکھ گھنیرا	نہ جانو کب ملے گا پیو میرا
ترے درسن کی ہوں میں سائیں ماتی	مجھے لاؤ پیا چھاتی سوں چھاتی

10.3.5 صنائع بدائع اور صوتی تکرار:

محمد قلی کی بیش تر غزلیں صنائع بدائع کے حسن سے آراستہ ہیں۔ اس کے کلام میں مراعات النظیر، حسنِ تعلیل، تضاد، سوال وجواب وغیرہ کی صنعتیں موجود ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

کجل نیناں سہیلیاں کے سو پر مل سیام باداماں
ٹھڈی ہے سیب دستاں جوں کہ چارولیاں ہیں چاریاں کی

(مراعات النظیر)

تج کتا ہوں اے شمع اپ روشنی تھے سر نہ کھینچ
مارتے ہیں دم بہ دم گردن کہ توں ہے بے حیا

(حسنِ تعلیل)

سب مست گج گنبھیر جوں، قد راست دھرتے تیر جوں
آہستگی میں نیر جوں، بیگی منے بارے اہیں

(تضاد)

کھیا کہ عاشقاں کو دکھانے کا بھید کیا
کہئی کہ عاشقی منے گونگی زبان کرو

(سوال وجواب)

صنائع وبدائع کے استعمال کے علاوہ محمد قلی نے اپنی غزلوں میں تکرارصوتی (Alliteration) اوراندرونی قوافی کی مدد سے بھی ایک لے یا جھنکار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔اس نے متعدد غزلوں میں چارچاراوراس سے زائد قافیوں کا بڑے سلیقے سے استعمال کر کے نغمگی اور موسیقیت کا احساس پیدا کیا ہے:

سہیلیاں جب بچن بولیں ، نچھل نرمل رتن رولیں
پنکھی جیواں کے مرغولیں دیکھت کھولیں پراں خوشیاں

چندر غواص ہو آیا، گگن سُمدر بھیتر دھایا
بنی پروار نے لیا یا ڈھلک موتیاں سو تا رے ہیں

سو لکھن چھند بھری چنچل کھسائے سیس تے انچل
متی ہوئے مست جوں منگل سو مدپی پیو کی پیاری کا

پیاسوں سوں رات جاگی ہے سو دستی ہے سودھن سرخوش
مدن سرخوش ، سین سرخوش ، انجن سرخوش ، نین سرخوش

محمد قلی نے بعض اشعار میں ایک مخصوص حرف کی تکرار سے خاص صوتی آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی :

ک = سودھن لٹک کی جب جھلک دونوں الک کی سومہک
مہکیا فلک پر تھے فلک بے سد ہولک لک آئے ہیں

ق = قرب سوں قطب شہہ قدرت قدر سوں
قزح قوس تھے قاف تا قاف پایا

اسی طرح بعض اشعار کے دونوں مصرعوں میں دومختلف حرفوں کی تکرار سے ایک خاص کیفیت پیدا کی ہے۔

م = محمد کے میم تھے مدد مانگ کر میں ع = علی عین عادل علم کوا چایا
ق = قمرقاف قبے اپر جگ جگایا پ = پرم پی کا پیالا پیا منج پلایا

10.4 منتخبہ دوغزلوں کا متن مع تشریح

10.4.1 غزل نمبر 1: دلا منگ خدا کن کہ خدا کام دویگا:

دلا منگ خدا کن کہ خدا کام دِوے گا
تمن من کے مراداں کے بھرے جام دِوے گا

خوارج کی اگن قہر کے پانی سوں بوجھا گا
براہیم نمن مجکوں سُکھ آرام دِوے گا

دو عالم کے دوارے کھلے ہیں عیش کی خاطر
جے کوئی نبیؐ نام سوں دل رام دِوے گا

جے دل میں محبت علی و آلِ علی ناہ
اسے خونِ جگر داروئے ناکام دِوے گا

نہ کھا غم توں زمانے کا ترا کام خدا سوں
ہر اک پستی منے تجکوں بلند نام دِوے گا

اپن بخت حقیرے تھے کدیں دل میں نکر غم
تجے داروئے صحت سوں شفا جام دِوے گا

رقیباں کے دکھوں سیتی قطب شہ توں نکر غم
خدا سارے رقیباں کے گلے دام دِوے گا

غزل نمبر 1: کی تشریح:

دلا منگ خدا کن کہ خدا کام دِوے گا
تمن من کے مراداں کے بھرے جام دِوے گا

اس شعر میں قلی قطب شاہ اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے دل خدا کی بارگاہ میں سوال کر، دعا کر وہ تمہارے من کی تمام مرادیں بر لائے گا اور تمہیں شاد کرے گا۔

خوارج کی اگن قہر کے پانی سوں بوجھا گا
براہیم نمن مجکوں سُکھ آرام دِوے گا

جن خوارج (مخالفین) نے تمہاری زندگی میں آگ لگائی ہے خدا ان پر اپنا قہر وغضب نازل کرے گا اور اس آگ کو بجھا دے گا۔جس طرح حضرت ابراہیم پر آگ گلزار ہو گئی تھی اسی طرح خدا تمہیں بھی راحت وآرام عطا کرے گا۔اس شعر میں حضرت ابراہیمؑ کی تلمیح لائی گئی ہے۔

دو عالم کے دوارے کھلے ہیں عیش کے خاطر

جے کوئی نبیؐ نام سوں دل رام دِوے گا

جو شخص بھی نبی کریمؐ کے اسم مبارک کے ورد سے اپنے دل کو قرار د پہنچائے گا اس کے لیے دو جہاں کے عیش وعشرت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔یعنی ختمی مرتبتؐ کے نام کا ورد کرنے سے دنیا کی تمام نعمتیں اور راحتیں میسر ہو سکتی ہیں۔ددوسرے مصرعے میں دل رام سے مراد دل کا آرام ہے۔

جے دل میں محبت علی و آلِ علی ناہ

اسے خونِ جگر داروئے ناکام دِوے گا

جس دل میں حضرت علیؑ اور ان کی آل کی محبت نہیں اس پر کوئی دوا اثر نہیں کر سکتی۔یعنی اس کے درد کا درماں کہیں نہیں مل سکتا۔اس کی دوا خون جگر پینا ہے اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

نہ کھا غم توں زمانے کا ترا کام خدا سوں

ہر اک پستی منے تجکوں بلند نام دِوے گا

اس شعر میں کہتے ہیں کہ تو زمانے کا کوئی غم نہ کھا۔تیرا معاملہ تو خدا سے ہے۔خدا تجھے ہر عالم پستی سے نکالے گا اور بلندی و کامیابی سے سرفراز کرے گا۔

اپن بخت حقیرے تھے کدیں دلمیں نکر غم

تجے داروئے صحت سوں شفا جام دِوے گا

اس بات کا کبھی بھی اپنے دل میں ملال نہ کر کہ ہم تو کم نصیب ہیں۔تقدیر بنانے والا مشکل کشائی کرے گا اور تیرے مرض کو صحت بخش دوا کے ذریعے دور کرے گا۔یعنی خواہ کوئی مرض ہو یا کوئی پریشانی انسان کو غمگین ہو کر اپنی بدبختی کا رونا نہیں رونا چاہیے۔خدا اس کی مشکل ضرور آسان کرے گا۔

رقیباں کے دکھوں سیتی قطب شہ توں نکر غم

خدا سارے رقیباں کے گلے دام دِوے گا

اے قطب شاہ! رقیبوں کے دیے ہوئے دکھوں کے سبب تم آزردہ نہ ہو۔خدائے کارساز تمہارے تمام رقیبوں کے گلے میں اپنی حکمت کا پھندا ڈالے گا اور انہیں اپنے دام حکمت میں گرفتار کر دے گا پھر وہ رقیب اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔

10.4.2 غزل نمبر2: خبر لیا ہے ہدہد میرے تئیں اس یار جانی کا:

خبر لیایا ہے ہدہد میرے تئیں اس یار جانی کا

خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں راز نہانی کا

مرے جیو آرسی میں خیال تج مکھ کا سو دستا ہے
کرے او خیال منج دل میں نشانی زر فشانی کا

چتا ہو عشق کے جنگل میں بیٹھا ہے دری لے کر
لیا ہے جھانپ سوں آہو نمن دل منج ایانی کا

خدا کا شکر ہے تج سلطنت تھے کام پایا ہوں
دندے دشمن کے مکھ پر پیوتا مئے ارغوانی کا

دوتن افسوں کے بارے تھے ہمن کوں کچ نہیں ڈر ہے
ہمارے دیوے کوں ہے روشنی صاحب قرانی کا

ہمیں ہیں عشق کے پنتھ میں دونوں عالم تھے بے پروا
لگیا ہے داغ منج دل پرسو اس ہندوستانی کا

پڑے دنبال میں میرے سو اس نیناں کے دنبالے
خدایا عشق مشکل ہے بھرم رکھ توں معانی کا

غزل نمبر 2: کی تشریح:

خبر لیایا ہے ہدہد میرے تیئں اس یار جانی کا
خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں راز نہانی کا

میرے پاس ہدہدیعنی قاصد میرے جانی دوست یعنی محبوب کی خبر لایا ہے۔ یہ خوشی کا وقت ہے میں اس سے چھپا ہوا راز اس پر ظاہر کر دوں کہ مجھے اس سے محبت ہے۔

مرے جیو آرسی میں خیال تج مکھ کا سو دستا ہے
کرے او خیال منج دل میں نشانی زر فشانی کا

اے میرے محبوب! میرے دل کے آئینہ میں تیرے چہرے کی یاد بسی ہوئی ہے۔ وہ یاد میرے دل میں رنگین جگمگاہٹ کا سامان کیے ہوئے ہے، جس سے میرا دل روشن ہے۔

چیتا ہو عشق کے جنگل میں بیٹھا ہے دری لے کر
لیا ہے جھانپ سوں آ ہو نمن دل منج ایانی کا

ہمارے محبوب نے ہمارے دل کی کیفیت کو بھانپ لیا ہے کہ وہ چیتے کی طرح عشق کے جنگل میں شکار کی تاک میں بیٹھا ہوا ہے اور مجھ نادان کا دل اپنے قبضے میں کر لیا ہے جیسے چیتا ہرن کو دبوچ لیتا ہے

خدا کا شکر ہے تج سلطنت تھے کام پایا ہوں
دندی دشمن کے مکھ پر پیوتا مئے ارغوانی کا

خدا کا شکر ہے کہ مجھے تیرے عشق کی سلطنت میں کامیابی نصیب ہوئی، میری آرزو پوری ہوئی۔ اب میں عیار دشمن کے سامنے سرخ شراب سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

دو تن افسوں کے بارے تھے ہمن کوں کچ نہیں ڈر ہے
ہمارے دیوے کوں ہے روشنی صاحب قرانی کا

ہمیں دشمنوں کے جادو اور سحر کی ہوا سے کوئی خوف نہیں ہے۔ ہمارے چراغ میں صاحب قرآنی کی روشنی ہے۔ اس پر کسی دشمن یا رقیب کی کسی تدبیر کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

ہمیں ہیں عشق کے پنتھ میں دونو عالم تھے بے پروا
لگیا ہے داغ منج دل پر اس ہندوستانی کا

عشق کے راستے میں ہم دونوں عالم سے بے پرواہیں۔ میرے دل پر اس ہندوستانی یعنی سانولے معشوق کی محبت کا نشان ثبت ہو چکا ہے۔

پڑے دنبال میں میرے سو اس نیناں کے دنبالے
خدایا عشق مشکل ہے بھرم رکھ توں معانی کا

اس کی آنکھ کی سرمہ کی لکیر میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے اے خدا! کار عشق بہت دشوار ہے۔ تو میرے جذبات کا بھرم رکھ لے۔ مجھے سرخ روئی عطا فرما۔

10.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ محمد قلی قطب شاہ نہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان بادشاہ، رقص و موسیقی، فن خطاطی اور فن تعمیر کا دل دادہ تھا بلکہ خود بھی ایک با کمال شاعر تھا۔

☆ محمد قلی قطب شاہ اپنے دور کے شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کا قدردان اور سرپرست بھی تھا۔

☆ ملا وجہی، محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا اور اس نے دیگر ملکوں اور شہروں کے اہل کمال کو بھی اپنے دربار سے وابستہ کیا تھا۔

☆ محمد قلی قطب شاہ کے ضخیم کلیات میں کم و بیش سبھی اصناف سخن موجود ہیں، لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کا شاعر تھا۔

☆ محمد قلی قطب شاہ سے پہلے دکن کے بہت کم شاعروں نے غزلیں کہی ہیں اور اس سے دکنی غزل کی ایک کمزور روایت ملی ہے، لیکن محمد قلی قطب شاہ نے اس صنف کی بڑے وسیع پیمانے پر پذیرائی کی ہے۔

☆ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں تعداد اور تنوع کے اعتبار سے جتنی غزلیں ملتی ہیں، اتنی کسی اور دکنی شاعر کے یہاں نہیں ملتیں۔

☆ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے کلام کی اولین خصوصیت اظہار بیان کی سادگی، سلاست اور روانی ہے۔

☆ محمد قلی قطب شاہ اپنے جذبات اور مشاہدات کو سیدھی سادی زبان میں حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کرنے کا عادی ہے۔

☆ محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں میں اپنے عہد اور ماحول کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور ہندوستانی روایات کی عکاسی بھی ملتی ہے و نیز اس کا کلام نغمگی و موسیقیت اور صنائع و بدائع کے حسن سے مالا مال ہے۔

10.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی	الفاظ	:	معنی
منگ	:	مانگ	کن	:	کے پاس
دِویگا	:	دیوے گا	تمن	:	تمہارے
من	:	دل	مراداں	:	مرادوں
اگن	:	آگ	سوں	:	سے
بوجھا گا	:	بجھائیگا	براہیم	:	حضرت ابراہیمؑ
نمن	:	مانند	مجکوں	:	مجھے
دوارے	:	دروازے	جے کوئی	:	جو کوئی
جے دل میں	:	جس دل میں	ناہ	:	نہیں
توں	:	تو	منے	:	میں
تجکوں	:	تجھے	اپن	:	اپنے
تھے	:	سے	کدیں	:	کبھی
تجے	:	تجھے	شفا جام	:	شفا کا جام
سیتی	:	سے/ساتھ	دام	:	جال، پھندا

10.7 نمونہ امتحانی سوالات

10.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت کا پانچواں حکمران کون تھا؟

2۔ محمد قلی قطب شاہ کے والد کا نام کیا تھا؟

3۔ محمد قلی قطب شاہ کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی ؟

4۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کون ہے؟

5۔ محمد قلی قطب شاہ کس عمر میں بادشاہ بنا؟

6۔ محمد قلی قطب شاہ نے کتنے سال تک حکومت کی؟

7۔ ''کلیات محمد قلی'' کو کس نے مرتب کیا؟

8۔ محمد قلی قطب شاہ کی والدہ کا کیا نام تھا؟

9۔ محمد قلی قطب شاہ کے کتنے بھائی بہن تھے؟

10۔ ''محمد قلی قطب شاہ'' کس کی تصنیف ہے؟

10.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

2۔ محمد قلی قطب شاہ کے تصور محبوب پر ایک نوٹ لکھیے ۔

3۔ محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں میں ہندستانی عناصر کی نشاندہی کیجیے۔

4۔ محمد قلی قطب شاہ کی ریختہ گوئی پر ایک نوٹ لکھیے ۔

5۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں صنائع و بدائع اور صوتی تکرار کی نشاندہی کیجیے۔

10.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ محمد قلی قطب شاہ کی حیات و شخصیت پر مضمون قلم بند کیجیے۔

2۔ محمد قلی قطب شاہ کی غزل گوئی کا جائزہ لیجیے۔

3۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام کی سادگی اور حقیقت پسندی پر روشنی ڈالیے۔

10.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	محمد قلی قطب شاہ	مسعود حسین خاں
2۔	دکنی غزل کی نشو ونما	سیدہ جعفر
3۔	کلیات محمد قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی
4۔	دکنی غزلوں کا انتخاب	محمد علی اثر
5۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	جمیل جالبی

اکائی 11: غواصی کی غزل گوئی

(شاعر کا تعارف، منتخبہ دو غزلوں کی تشریح)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 غواصی کے حالات زندگی

11.3 غواصی کی غزل گوئی

11.3.1 سادگی اور سلاست

11.3.2 حقیقت پسندی

11.3.3 تصور محبوب

11.3.4 اخلاقی عناصر

11.3.5 بلندی فکر اور شاعرانہ کمال

11.4 منتخبہ دو غزلوں کا متن مع تشریح

11.4.1 غزل نمبر 1: پلا مد مست اے ساقی کہ منج عادت ہے پینے کا

11.4.2 غزل نمبر 2: ہمن عاشق دیوانیاں کوں، چھبیلے سوتاں کیا کام

11.5 اکتسابی نتائج

11.6 کلیدی الفاظ

11.7 نمونہ امتحانی سوالات

11.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

11.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

11.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

11.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

غواصیؔ دکنی اردو کا ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں شاعری کا آغاز کیا۔ عہدِ محمد قطب شاہ میں دیگر دکنی شعرا کی طرح گم نام رہا لیکن عبداللہ قطب شاہ کے دور میں اس نے ایک باکمال سخنور کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ سلطان عبداللہ نے اس کو نہ صرف اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا بلکہ شاہی سفیر کی حیثیت سے بیجاپور روانہ کیا اور ''فصاحت آثار'' کے خطاب سے بھی نوازا۔

غواصی نے تین مثنویاں ''میناست ونتی''، ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' اور ''طوطی نامہ'' کے علاوہ ایک کلیات بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے جس میں قصیدے، غزلیں، رباعیاں، نظمیں اور مرثیے سبھی اصناف سخن موجود ہیں۔

جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے، غواصی دبستانِ دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اندازِ بیان کی سادگی، روانی اور سلاست، تاثر کی فراوانی، نغمگی و موسیقیت اور سوز و گداز اس کی غزلوں کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی عکاسی اپنے ماحول کی تصویر کشی اور حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے بھی اس کا کلام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ غواصی کے حالات زندگی کو بیان کر سکیں۔
- ☆ غواصی کی غزل گوئی کی خصوصیات کو سمجھ سکیں۔
- ☆ غواصی کی منتخب غزلوں کی تشریح کر سکیں۔

11.2 غواصی کے حالات زندگی

ملک الشعرا ابو محمد غواصیؔ قطب شاہی دور کا ایک عظیم المرتبت سخن ور ہے۔ اس کی شہرت اور نام وری کا یہ عالم ہے کہ میر حسن، میر تقی میر اور قائم نے اپنے تذکروں میں غواصیؔ کا ذکر کیا ہے جب کہ دکنی اردو کے دوسرے بلند پایہ شعرا جیسے محمد قلی قطب شاہ، ملک الشعرا وجہیؔ، ابن نشاطیؔ، نصرتیؔ وغیرہ ان تذکروں میں جگہ نہ پا سکے لیکن اِس کے باوجود اس کے واقعاتِ حیات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کا پورا نام، سنہِ ولادت، تعلیم و تربیت، عمر، سنہ وفات اور خاص طور پر آخری زمانے کے حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ درمیانی زندگی کے بارے میں کچھ واضح نقوش ضرور مل جاتے ہیں۔

قدیم تاریخوں، تذکروں اور خود شاعر کے کلام کی اندرونی شہادتوں سے اس کے حالاتِ زندگی کے بارے میں جو کچھ مواد حاصل ہو سکا ہے اسے ڈاکٹر زور نے ''اردو شہہ پارے'' اور ''کلیاتِ غواصی'' کے مقدمے میں، نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو'' میں، میر سعادت علی رضوی نے ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' اور ''طوطی نامہ'' میں ڈاکٹر غلام عمر خاں نے ''میناست ونتی'' میں اور پروفیسر محمد علی اثر نے ''غواصی شخصیت اور فن'' میں یک جا کر دیا ہے۔ مذکورہ کتب کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ غواصیؔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا۔ عمر میں وجہیؔ اور محمد قلی سے چھوٹا تھا۔ اس نے محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔

غواصی نے اپنے کلام میں محمد قلی قطب شاہ کے بعد سب سے زیادہ تخلصوں کا استعمال کیا ہے۔ شعری ضرورت کے اعتبار سے اس نے اپنے تخلص غواصؔ اور غواصی کو کبھی مشدد اور کبھی غیر مشدد باندھا ہے اور دکنی کے دوسرے شاعروں کی طرح ''الف'' کے اضافے کے ساتھ غواصیا بھی

استعمال کیا ہے۔اس طرح اس کے کلام میں تخلص کی درجِ ذیل شکلیں ملتی ہیں۔

1. غواصؔی　2. غوّاصی　3. غواصؔ　4. غوّاص　5- غوّاصیا

غواصؔی کی ابتدائی زندگی عسرت میں بسر ہوئی۔شاہی تقرب سے قبل وہ ایک سپاہی تھا اور رات کے وقت پہرے پر مامور تھا۔ یہ ملازمت اسے اس قدر ناگوار گزری کہ بادشاہِ وقت کو مخاطب کر کے اس نے اس ملازمت سے معافی کی گزارش کی تھی۔ چناں چہ اس قصیدے کی وجہ سے اس کو پہرے داری کی ملازمت سے چھٹکارا مل گیا۔

غواصی حضرت میراں شاہ حیدر ولی اللہ قادری (متوفی 1033ھ/1623ء) کا معتقد اور مرید تھا‘ جن کا مزار نلنگہ (ضلع لاتور‘ مہاراشٹر) میں ہے۔اسی مزار کے پائین میں سنگِ سیاہ سے بنی ہوئی غواصی کی قبر موجود ہے۔حضرت حیدر ولی اللہ کی مدح میں غواصی نے ایک نظم کے علاوہ متعدد اشعار کہے ہیں:

حیدر جو میرا پیر ہے کر سرفرازی کی نظر
ہو آپ تیزی سار منج غواص کوں تیزی کیا
اے پیر دست گیر جو حیدر ترا ہے نانوں
مج کوں کہاں وو جیب جو ہے تیوں تجے سراؤں

11.3 غواصی کی غزل گوئی

موجودہ معلومات کی روشنی میں غواصؔی ایک بلند پایہ غزل گو‘ بے مثال مثنوی نگار اور باکمال قصیدہ گو کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔اس کی تینوں مثنویاں ’’میناست ونتی‘‘، ’’سیف الملوک و بدیع الجمال‘‘ اور ’’طوطی نامہ‘‘ شائع ہو چکی ہیں۔ان کے علاوہ غزلوں‘ قصیدوں‘ رباعیوں‘ مرثیوں اور موضوعاتی نظموں پر مشتمل دیوان بھی شائع ہوا ہے۔غواصی نے اپنے کلام میں نہ کسی پیش رو شاعر کا تذکرہ کیا ہے اور نہ کسی ہم عصر شاعر کو وہ اپنا مدِ مقابل سمجھتا ہے جب کہ دکنی اردو کے دیگر بلند پایہ شاعروں نے اپنے کلام میں گزرے ہوئے یا ہم عصر شاعروں کا ذکر نہ صرف بڑی عزت و احترام سے کیا ہے بلکہ ان کو کامل الفن اور اپنا استادِ سخن بھی کہا ہے۔جیسے محمد قلی قطب شاہ اور وجہؔی نے اپنے پیش رو اساتذۂ سخن کی حیثیت سے فیروز اور محمود کو یاد کیا ہے۔یہی حال ابن نشاطی کا ہے جس نے اپنی مثنوی ’’پھول بن‘‘ میں دکنی اردو کے چار بلند پایہ شعرا فیروزؔ‘ سید محمودؔ‘ ملا خیالؔی اور شیخ احمدؔ کا ذکر بڑی عزت واحترام کے ساتھ کیا ہے۔خود غواصی کو اس کے ہم عصر شعرا میں مقیمی اور نصرتؔی نے اور زمانۂ مابعد کے سخن وروں میں غوثی بیجاپورؔی‘ عشرتؔی‘ سید اعظم اور فراقؔی بیجاپوری وغیرہ نے اپنے کلام میں استادِ سخن کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غواصی نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کے زمانے میں غواصؔی کو شاہی دربار میں رسائی حاصل نہ ہو سکی البتہ عبداللہ قطب شاہ کے دور میں غواصی کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا۔اس بادشاہ نے اسے نہ صرف اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا اور 1635ء میں اپنے سفیر کی حیثیت سے بیجاپور روانہ کیا بلکہ ’’فصاحت آثار‘‘ کے خطاب سے بھی نوازا۔

ہزار شکر کہ خوش ہو کے یہ شہہ عارف
خطاب منج کوں دیا ہے ’’فصاحت آثاری‘‘

ڈاکٹر محمد بن عمر نے غواصؔی کے کلیات کو 1959ء میں مرتب کر کے ادارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد) کی جانب سے شائع کیا تھا جس میں 21 قصائد'14 رباعیات'2 مختصر مثنویاں'2 مراثی اور ایک ترکیب بند کے علاوہ 129 غزلیں'19 نظمیں اور 9 ریختیاں شامل ہیں۔غواصی نے محمد قلی کی طرح' غزل کی ہیئت (Form) کو بڑے پیمانے پر عشقیہ (Lyrical) اور بیانیہ (Descriptive) دونوں قسم کی شاعری کے لیے برتا ہے۔ہر جگہ مطلع' مقطع اور قافیہ وردیف کی پابندی کی ہے۔البتہ موضوعات میں کہیں ربط وتسلسل ہے تو کہیں منتشر خیالی نظر آتی ہے۔ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کی طرح ڈاکٹر محمد بن عمر نے غواصی کی ایسی غزلوں کو جن میں تسلسلِ بیان پایا جاتا ہے' عنوان دے کر نظم کے دائرے میں داخل کر دیا ہے۔حالاں کہ غواصی کے قلمی دیوان میں کہیں بھی عنوانات نہیں ملتے۔خود غواصی بھی محمد قلی کی طرح ان تخلیقات کو غزل ہی کہتا ہے۔ چناں چہ اس کی ایک نظم (غزل)''بادشاہ کی سیر بھونگیر'' کا مقطع ہے:

غواصی ذوق پا اکثر جو بولیا یوں غزل خوش کر

دیا کی دھر نظر شہہ پر مدد حضرت امیر اہے

اگر کلیات غواصؔی کی اس قبیل کی نظموں اور ریختیوں کو غزلوں میں شمار کریں تو اس کی غزلوں کی تعداد 157 ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ راقم الحروف نے''غواصی شخصیت اور فن''اور''دکنی شاعری تحقیق وتنقید'' میں اس کی علی الترتیب 20 اور 29 غیر مطبوعہ غزلیں مرتب کر کے شائع کی ہیں۔اس طرح غواصی کی جملہ غزلوں کی تعداد 206 ہو جاتی ہے۔اگرچہ تعداد اور مضامین کے تنوع کے اعتبار سے غواصی کی غزلیں' محمد قلی کی غزلوں کی ہم پلہ نہیں لیکن جہاں تک سادگیِ بیان' تاثر کی فراوانی اور سوز وگداز کا تعلق ہے' دکنی اردو کا کوئی شاعر غواصی کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔ پروفیسر غلام عمر خاں لکھتے ہیں:

''عام قاری کے لیے زبان کی قدامت' غواصی کے کلام سے لطف اندوز ہونے میں حائل ہے ورنہ جہاں تک صنفِ غزل کا تعلق ہے' تغزل وسرمستی' جذبات کا سوز وگداز' زبان وبیان کی بے ساختگی اور لطافت وشگفتگی' بحروں کا ترنم' اشعار کی نغمگی اور موسیقیت' یہ وہ خصوصیات ہیں جہاں غواصی عہدِ حاضر کے مقبول متغزلین حسرتؔ اور جگرؔ کے مقابلے میں بھی منفرد اور ممتاز نظر آتا ہے۔اس کی بعض غزلیں جو علوئے جذبات' بلند آہنگی' کیف ومستی' سرخوشی وسرشاری اور شعورِ ذات کی رفیع جمالیاتی کیفیات کی عکاسی کرتی ہیں' غالبؔ' حافظؔ اور خسروؔ کی اسی رنگ وآہنگ کی غزلوں کی ہم پایہ ہیں۔''

(غواصی شخصیت اور فن صفحہ 10)

11.3.1 سادگی اور سلاست:

غواصی کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت اظہارِ بیان کی سادگی' سلاست اور بے ساختگی ہے لیکن جو چیز اس کو دکنی اردو کے غزل گو شعرا میں منفرد مقام بخشتی ہے اور اردو کے صفِ اول کے شعرا میں لا کھڑا کرتی ہے وہ تاثر کی فراوانی' سوز وگداز اور شعریت ہے۔غواصی کو زبان وبیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔اس کے کلام میں تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے،اس کے انداز میں ایک اعتدال' ٹھہراؤ اور توازن نظر آتا ہے۔اس کی آواز رچی ہوئی اور مصفا ہے۔اس کا لہجہ دل نشین اور اپنے پیش رو یا معاصرین سے مختلف ہے۔وہ دراصل دکنی غزل کے ایک نئے اسکول کا بانی ہے

جس کی زمانۂ مابعد کے بلند پایہ شاعروں خصوصاً ولی اور سراج نے پیروی کی ہے۔غواصی کی شاعری بنیادی طور پر حسن وعشق کی شاعری ہے۔جذبات و احساسات کی موثر تر جمانی اور قلبی واردات کی فن کارانہ عکاسی کی وجہ سے اس کی بیش تر غزلیں غنائیت کے کیف وسرور میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ باوجود انتہائی سادگی کے کلام میں بلا کا اثر ہے۔تاثر کے ساتھ اس کے کلام میں سوز ونشتریت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔وہ پردردسروں کو غزل کے ساز پر کچھ اس طرح چھیڑتا ہے کہ سننے والا بھی اپنے دل کے تاروں میں ارتعاش محسوس کرنے لگتا ہے :

ہماری وو چنچل سجانا کہاں لگی چٹپٹی تھیر پانا کہاں
منجے اس تھے دل توڑو کہتے ولے اسوں توڑ دل بی لگانا کہاں
آیا نہ ہات اجھوں وو پرس آہ کیا کروں سینے میں رہ گیا یوں ہوس آہ کیا کروں
کدھیں برکوں رو روئے کر بحر کر میں کدھیں آہ سوں بحر کوں بر کیا ہوں
گھڑی کوں دل، گھڑی کوں جان دونوں کھینچتے دو دھیر قرار یک تل نہیں مجھ کوں کہ باٹے باٹ پھرتا ہوں

غواصی ایک حسن پرست شاعر ہے۔اس کا رومانی جذبہ خارجی شاعری کی تصویرکشی میں زیادہ واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ اسے مناظرِ قدرت کی عکاسی میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔اس کی مثنویوں اور قصیدوں میں مناظرِ فطرت کی مرقع کشی کے متعدد نمونے موجود ہیں۔صنفِ غزل میں بھی اس نے منظر نگاری اور سراپا نگاری کا کمال دکھایا ہے۔محبوب کے حسن کو اجاگر کرنے یا اس کے جسمانی اعضا کی تعریف وتوصیف کے سلسلے میں اس نے مناظرِ قدرت سے طرح طرح سے کام لیا ہے:

بھنور کر جیو کوں میرے ادک لبدایا تیرا کمل مکھ ہور نین نرگس، رنگیلا گال گل لالہ
چمن کے جھاڑ سب خوش ہو سگل پھولاں منے تیرا سہیلا گاوتے پاتاں کے ہاتاں سوں بجا تالا
صراحی گردن اونچی کر اُمس سوں آئے خدمت میں کیا اپنی محبت ہور کرم کا جیوں نظر پیالا
کھوپنا جو گھالی پیچ کر بیٹھے مرا سد لیچ کر تو چاند اپس کوں ہیچ کر تج حسن انگے دکھلائیا
حیران ہوئے جمال ترا دیک ہر گھڑی چنتے ہیں آج چاند پہ تارے ہزار نقش
اے چھبیلی آج تیرے چھند ہور چھب کوں سلام تج گلابی گال کوں ہور اس مٹھے لب کوں سلام

اس میں شک نہیں کہ غواصی نے اپنے اردگرد کی اشیا کو آنکھ کھول کر دیکھا ہے۔مناظر قدرت کا غائر نظر سے مشاہدہ کیا ہے لیکن اس کے بیان کی خارجیت میں جذبے کی داخلیت بھی شامل ہے اور کہیں کہیں یہ داخلیت خود کلامی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔قلبی واردات کا بیان اس نے جس انداز سے کیا ہے اور اس میں سادگی و پرکاری نے جس طرح نئے نئے پہلو تراشے ہیں وہ بہ یک وقت اس کے جذبات کی گہرائی اور فنی پختگی کی دلیل ہیں۔چھوٹی اور مترنم بحروں میں غواصی کے اشعار میر تقی میر کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔

دل میں اک بات ہے کسے نہ کہوں کہ پھُٹے گی دو بات یاں واں پڑ
دل کی دیوانگی نہیں جاتی پھونکتا ہوں جتا دعایاں پڑ
اے سجن تجھ کوں یاد کر پل پل روؤں اپس میں اپیچ میں ڈھل ڈھل

نہ آسی نیند منج آج اس رین میں — کہ سلتی برہ کی کنکری نین میں
اگر تج سا سرو کیئں ہور ہوتا — بنے بن بلبلاں کا شور ہوتا
وو فتنے بھریا سو ہے فتنا عجب — اسی تھے یتاجگ میں فتنا ہوا
آج منج دل کوں کچ قرار نہیں — کیا کروں میں نزک وو یار نہیں
اے دل آرام میں جدھر جاؤں — دل کوں تیریچ پاس دھر جاوں
دیکھ تج مکھ کی شمع کوں یو جیو — دوڑتا جیوں پتنگ جاتا ہے
کھول ادھر منج سوں بول بارے توں — کس چمن کی ہے پھول کی ڈالی

11.3.2 حقیقت پسندی:

دکنی اردو کے دوسرے شاعروں کی طرح غواصی نے بھی اپنے کلام میں مقامی ماحول اور مقامی روایات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔اس کی غزلوں میں ہندوستانی ماحول، ہندوستانی طور طریقے اور تصورات، یہاں کے سبزہ وگل اور مناظرِ قدرت کی دل کش تصویریں ملتی ہیں۔اس کے ہاں یہ ہندوستانیت محض زبان تک محدود نہیں بلکہ اس کے خیال، سوچنے کے انداز اور طرزِ بیان میں بھی نمایاں ہے۔

اردو کے اکثر غزل گوشعرا کی طرح غواصی نے ہندوستان میں بیٹھ کر شیراز واصفہان کے راگ نہیں الاپے۔اس کے کلام میں عجمی لالہ زاروں وہاں کے پرندوں، جانوروں، دریاؤں، پہاڑوں یا قصوں کے حوالوں کے بجائے ہندوستانی پرندوں، پھولوں، پھلوں، یہاں کے موسموں، نظاروں، دریاؤں وغیرہ کا ذکر جا بہ جا ملے گا۔غواصی کی غزلوں میں ہندوستانی اقدار اور مقامی روایات ورجحانات کا احترام ملحوظ رکھا گیا ہے۔چنان چہ اس کے بیش تر اشعار میں حسن وعشق کے وہی مضامین اپنائے گئے ہیں جو ہندوستانی ذوق کے مطابق ہوں۔چند شعر ملاحظہ ہوں جن میں نہ صرف مقامی روایات کی ترجمانی کی گئی ہے بلکہ ان اشعار کے خالق کے طرزِ فکر اور متخیلہ پر بھی ہندوستانیت کی گہری چھاپ ہے :

اگر ہور برکی ، عنبر ، چندن ہور عود لوبھانی — یہ سب تج آنگ کی باسوں تھے پرمل پائے ہیں آلا
ملکِ دکھن میں حور تھے نادر ہوتوں پنچی ہے کر — ہے بے نہایت اے سکھی ملکِ دکھن کوں آج فرح
لال دو گال رنگ بھرے تیرے — عین جیوں نارنگیاں ہیں بنگالی
درس تیرا سو دین کا دیوا — لٹ تری کفر کی ہے دیوالی
حال یکساں نہیں کہ جیوں جمنا — گہہ بہوں پور گہہ اتر جاؤں
رنگ بھریا منج گھر میں آج آیا بسنت — غیب تھے تازا طرب لیایا بسنت
پانی میں چھپ رہیا نہ نکل لاج تے کمل — نازوک نرم دیک ترے دو ہنوارہات
کتا تج پھول کی خاطر کداں لگ — بھنور ہویوں پھروں ہر ڈال ہر پات
تری ناسک پہ تھے قربان ہوتا ہر گھڑی چنپا — ترے بالاں پہ تھے قربان ہوتا ہر گھڑی بالا
بھنور کر جیو کوں میرے ادک لبدائیا تیرا — کمل مکھ ہور نین نرگس رنگیلا گال گل لالہ

11.3.3 تصورِ محبوب:

غواصی کا محبوب ایک پیکرِ حسن و شباب اور نسوانی محاسن کا مجسمہ ہے جس کی چلتی پھرتی پر چھائیاں اس کی غزلوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ غواصی نے اپنی محبوبہ کے لیے واضح طور پر تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے اور برملا انداز میں اسے سکی، سندری، موہنی، سجانا، سجن، دھن وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے۔ اسی طرح ریختیوں میں چوں کہ اظہارِ عشق صنفِ نازک کی طرف سے ہوتا ہے اس لیے ان میں محبوب کو پیا، پیو، سائیں، یار، ساجنا، سجن، سجان، یار وغیرہ ناموں سے پکارا گیا ہے۔ غواصی کی ریختیوں کے مطالعے سے اس صنفِ سخن پر اس کی غیر معمولی قدرت اور عورتوں کی نفسیات کے شعور کا پتہ چلتا ہے۔ غواصی نے نسوانی زبان، نسوانی لب و لہجہ اور عورتوں کے طرزِ تکلم کو فنی چابک دستی اور نفاست کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غواصی کو صنفِ نازک اور اس کے مسائل سے غیر معمولی دلچسپی رہی ہے۔ اس کی مثنویاں خاص طور پر 'میناست ونتی'' اور ''طوطی نامہ'' اس کی طبیعت کے اس رجحان کی غمازی کرتی ہیں۔ غواصی کی ریختیوں میں ایک شریف النفس اور شوہر پرست ہندوستانی عورت جلوہ گر ہے جو اپنے ''پیا'' کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے، اس کی بانہوں کو نو سر ہار کہتی ہے اور اسے اپنے گلے کی زینت بنانا چاہتی ہے۔ وہ اپنے ''سائیں'' کے ساتھ ساری رات مل بیٹھنے اور اس کے ''ادھر'' کی ''امریت'' پینے کی آرزومند ہے۔

اے سکیاں بانھ پیا کا ہے سچا نو سر ہار	آج وو ہار مرے گل منے بھاویں تو بھلا
کدھاں وو دیس ہووے گا جو سائیں سات مل بیسوں	کروں حظ دل منگے تیوں ہور ساری رات مل بیسوں
ہے ادھر سائیں کے امریت ولے پیار کر منج	منج پیاسی کوں وو امریت پلاویں تو بھلا

11.3.4 اخلاقی عناصر:

غواصی ایک مرد قلندر اور آزاد منش انسان تھا۔ وہ ''فقر'' میں ''شاہی'' کرنے کے گُر سے بہ خوبی واقف ہے اور ''دنیا کے طمطراق'' کے مقابلے میں ''خلوت نشینی'' کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی بیش تر غزلوں میں اخلاقی اور روحانی عناصر کی کارفرمائی ہے۔ اس کی غزلوں میں متعدد ایسے اشعار موجود ہیں جن میں روحانی تعلیمات یا بلند اخلاقی معیاروں کو اپنانے اور مادّیت کی برائیوں سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

فقر میں کرتا ہوں شاہی اے غواص	تو نکو یوں جان جو مفلس ہوں میں
غواصی کے نمن ہو توں قلندر آج اے عابد	بڑی اس ٹوکری ایسی تجے دستار تھے کیا حظ
دنیا کے طمطراق تھے درمندگی بھلی	یعنی زمیں کے سار سر افگندگی بھلی
ہمن عاشق دوانیاں کوں چھبیلے کسوتاں کیا کام	ہمن دبلے فقیراں کوں دنیا ہور دولتاں کیا کام
ہمن سر کوں چندوٹی بس، بلش بھر کی لنگوٹی بس	سکی کھانے کوں روٹی بس قبولیاں نعمتاں کیا کام

11.3.5 بلندیِ فکر و شاعرانہ کمال:

غواصی کو اپنی بلندیِ فکر اور شاعرانہ کمال کا شدید احساس تھا۔ وہ اپنے پیش رو یا ہم عصر شعرا میں کسی کو اپنا مدِ مقابل نہیں سمجھتا۔ واقعہ یہ ہے کہ غزل گوئی کے میدان میں غواصی نہ صرف دبستانِ دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے بلکہ جدید غزل گو شعرا مومنؔ، حسرتؔ، جگرؔ اور فراقؔ سے بہت

قریب نظر آتا ہے۔اس کے کلام میں بیسیوں ایسے مقطع موجود ہیں جن میں اس نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور زمانے کی بے اعتنائی یا قدر نا شناسی کا تذکرہ کیا ہے۔وہ ایک بڑے فن کار کی طرح اپنے ہم عصروں سے اپنے فن کی داد چاہتا ہے۔

غواصیؔ جوہراں جوتی تو لئی دھرتا جنوں میں آ | کہاں وو جوہری پارکھ جو پرکھے جوہراں میرے
جکوئی عرفان کے صاحب سچے ہیں سو کتے ہیں یوں | کہ یاں تو کوئی نئیں دستا غواصیؔ کے قرینے کا
طوطیاں سب ہند کے رغبت کریں تیوں آج خوش | شکّر ستاں ہو غواصیؔ شکّر افشانی کیا

11.4 منتخبہ دوغزلوں کا متن مع تشریح

11.4.1 غزل نمبر 1: پلا مست اے ساقی کہ منج عادت ہے پینے کا:

پلا مد مست اے ساقی کہ منج عادت ہے پینے کا
ہو سرخوش دور یک دھرتے کروں گا زنگ سینے کا

مرا جیو پیو ہے اس جیو کے جیوں کوں بسروں کیوں
کدھیں بسروں تو مرجاؤں نہ پاؤں ذوق جینے کا

بچن میری زباں کے آج تارے ہو نہ کیوں جھمکیں
کہ ہے یو چرخ زنگاری ورق میرے سفینے کا

پدک ہے عین میرا نظم چندر سور کے گل کا
جڑت ہے عین میرا شعر خوباں کے زرینے کا

زمانے آج کے میں وو نگینہ بے بدل ہوں جو
سلیماں باج کوئی قیمت نہ دیوے منج نگینے کا

جکوئی عرفان کے صاحب سچے ہیں سو کتے ہیں یوں
کہ یاں تو کوئی نئیں دستا غواصیؔ کے قرینے کا

غزل نمبرایک(1) کی تشریح:

پلا مد مست اے ساقی کہ منج عادت ہے پینے کا
ہو سر خوش دور یک دھرتے کروں گا زنگ سینے کا

اے ساقی! مست کر دینے والی شراب پلا کہ مجھے شراب پینے کی عادت ہے۔شراب کے سرور میں ڈوب کر میں اپنے سینے کا زنگ دور کردوں گا جوایک مدت سے شراب نوشی نہ کرنے کے سبب جمع ہوگیا ہے۔ یہاں زنگ سے مرادغم اور پریشانیاں ہیں۔شاعرشراب کے نشے میں ڈوب کر پریشانیوں کوبھولنا چاہتا ہے۔

مرا جیو پیو ہے اس جیو کے جیوں کوں بسروں کیوں
کدھیں بسروں تو مرجاؤں نہ پاؤں ذوق جینے کا

میرا دل، میری جان میرا محبوب ہے۔اس کودل سے کیسے بھلاسکتا ہوں اگر کبھی میں اس کوبھول جاوں تو مرہی جاوں اورزندگی کی کوئی لذت باقی نہ رہے۔یعنی جینا بے معنی اور بے مطلب ہوجائے گا۔

بچن میری زباں کے آج تارے ہو نہ کیوں جھمکیں
کہ ہے یو چرخ زنگاری ورق میرے سفینے کا

میری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ یعنی میرے اشعار روشن ستارے ہوکر کیوں نہ چمکیں؟ میرا تخیل اتنا بلند ہے کہ آسمان بھی میری کتاب شعروسخن کے ایک ورق کی مانند ہے۔ اس شعر میں غواصؔی نے تعلّی سے کام لیا ہےاوراپنی شاعری کوسراہا ہے۔

پدک ہے عین میرا نظم چندر سور کے گل کا
جڑت ہے عین میرا شعر خوباں کے زرینے کا

میری ہرنظم، چانداورسورج کے گلے کا ہار ہے۔میرا ہرشعرحسینوں کے طلائی زیورات میں جڑا ہوا قیمتی نگینہ ہے۔اس شعر میں بھی غواصؔی نے اپنی شاعری کی تعریف وتوصیف کی ہے۔

زمانے آج کے میں وو نگینہ بے بدل ہوں جو
سلیماں باج کوئی قیمت نہ دیوے منج نگینے کا

آج کے زمانے میں خود میں وہ نایاب نگینہ ہوں جس کا کوئی بدل نہیں اور جس کی قیمت کوئی ایسا سلطان ادانہیں کرسکتا سوائے حضرت سلیمان کے، جوسب سے بڑے بادشاہ تھے۔

جکوئی عرفان کے صاحب سچے ہیں سو کتے ہیں یوں
کہ یاں تو کوئی نئیں دستا غواصؔی کے قرینے کا

جوکوئی شاعری کےفن اوراس کی نزاکتوں کا سچا عرفان یاعلم رکھتے ہیں وہ اس بات کے قائل ہیں کہ یہاں دکن میں کوئی بھی شخص غواصی جیسی شعری صلاحیت کا حامل نظر نہیں آتا۔

11.4.2 غزل نمبر2: ہمن عاشق دیوانیاں، چھبیلے کسوتاں کیا کام:

ہمن عاشق دیوانیاں کوں چھبیلے کسوتاں کیا کام
ہمن دبلے فقیراں کوں دنیا ہور دولتاں کیا کام

ہمن سر کوں چندوٹی بس بلش بھر کی لنگوٹی بس
سکی کھانے کو روٹی بس قبولیاں نعمتاں کیا کام

نہ دھرتے خویش سے ہم جم پکڑ لیتے ہیں غربت ہم
پھرن ہارے ہیں پربت ہم گھراں عمارتاں کیا کام

دنیا سوں کام نئیں ہمنا یہاں آرام نئیں ہمنا
ہمارا فام نئیں ہمنا کسی سوں جتاں کیا کام

صبوری خوش کیے ہیں سچ کہ جیتے جیو موئے ہیں سچ
بڑا یاں سٹ دیے ہیں سچ بھی ہمناں حرمتاں کیا کام

ہمیں دائم جلن ہارے پیا بن تلملنہارے
دکھیاریاں سوں ملن ہارے ہمن کوں عشرتاں کیا کام

غواصؔی توں خبر پارے تماشا دیک دنیا کارے
اندیش اپنا اندیشہ رے کسی سوں منتاں کیا کام

غزل نمبر دو(2) کی تشریح:

ہمن عاشق دیوانیاں کوں چھبیلے کسوتاں کیا کام
ہمن دبلے فقیراں کوں دنیا ہور دولتاں کیا کام

اس غزل میں دنیا کی محبت اور مادیت پسندی سے دور رہنے کی تلقین ملتی ہے۔ ہم اپنے آپ سے بے خبر عاشقوں کو رنگا رنگ، دیدہ زیب اور

خوب صورت ملبوسات سے کیا کام؟ بھلا ہم ناتوان درویشوں کو ناپائدار دنیا کی فانی دولت سے کیا تعلق؟

ہمن سرکوں چندوٹی بس بلش بھر کی لنگوٹی بس

سکی کھانے کوں روٹی بس قبولیاں نعمتاں کیا کام

ہمارے سر کے لیے معمولی کپڑا کفایت کرتا ہے۔ ہمارے بدن کے لیے چھوٹی سی لنگوٹی کافی ہے۔ ہم تو اسی میں خوش ہیں کہ کھانے کو روکھی سوکھی روٹی دستیاب ہے لذت بخش اور دیگر نفیس غذاوں کی تمنا ہمیں کیوں ہو؟ قبولی دکن کا ایک خاص پکوان ہے۔

نہ دھرتے خویش سے ہم جم پکڑ لیتے ہیں غربت ہم

پھرن ہارے ہیں پربت ہم گھراں عمارتاں یا کام

ہم قلندر ہیں گھر بار اور عزیز و اقارب سے ہمیں زیادہ لگاؤ نہیں۔ اس لیے ہم ان کے ساتھ لمبا عرصہ نہیں گزارتے بلکہ جلد ہی پردیس اختیار کر لیتے ہیں۔ ہم تو غاروں اور پہاڑوں میں پھرتے رہتے ہیں اور یہی ہمیں پسند ہے ہمیں گھروں، رہائش گاہوں اور بڑی بڑی عمارتوں سے کیا تعلق۔

دنیا سوں کام نئیں ہمنا یہاں آرام نئیں ہمنا

ہمارا فام نئیں ہمنا کسی سوں جھتاں کیا کام

دنیا اور دنیا کے جھگڑوں سے ہمیں کوئی کام نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا مصائب اور آلام کا گھر ہے۔ اس لیے دنیا میں ہمیں آرام نہیں ملتا۔ ہمیں خود اپنی خبر نہیں ہے تو پھر اپنی بات منوانے کی خاطر کسی سے بحث و مباحثہ ہم کیوں کریں۔

صبوری خوش کیے ہیں سچ کہ جیتے جیو موے ہیں سچ

بڑا یاں سٹ دیے ہیں سچ بھی ہمناں حرمتاں کیا کام

صوفیا میں کہا جاتا ہے کہ موت سے پہلے مرجاؤ۔ یعنی اپنی تمام خواہشات کو ختم کر دو۔ نفس کے تقاضوں کو مار دو اور اپنی مرضی اور ارادے کو ترک کر دو۔ جب یہ ساری چیزیں ختم ہو جائیں گی تو آدمی مردے کی مانند ہو جائے گا جس کی کوئی خواہش نہیں، کوئی مرضی نہیں۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے بڑے صبر اور مجاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس شعر میں یہی کہا گیا ہے کہ ہم نے خوشی خوشی کسی کے دباؤ کے بغیر صبر اختیار کیا ہے۔ نفس کی ہر خواہش کو دباتے ہیں اور صبر کرتے ہیں گویا جیتے جی مر گئے ہیں تو ہمیں بڑائی، عزت، اعزاز کی کوئی آرزو نہیں ہے۔

ہمیں دائم جلن ہارے ، پیا بن تلملاہارے

دکھیاریاں سوں ملن ہارے ہمن کوں عشرتاں کیا کام

ہم دائمی غم اور فراق والے ہیں۔ ہم اپنے معشوق کے بغیر مسلسل اضطراب میں رہنے والے ہیں۔ چوں کہ ہم خود درد میں مبتلا ہیں اس لیے دوسرے لوگوں کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں اور انہیں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہم کو عیش و عشرت کی زندگی سے کیا واسطہ۔

غواصیؔ توں خبر پارے تماشا دیک دنیا کارے

اندیش اپنا اندیشہ رے کسی سوں منتاں کیا کام

اے غواصی! تو اپنی بصیرت سے زمانے کے نشیب و فراز کی آگہی حاصل کر۔ اور اپنی بصارت سے دنیا کا تماشا دیکھتا رہ۔ اپنی قوت فکر سے کام لے۔ معتبر سوچ تو اپنی ہی سوچ ہوتی ہے۔ کسی غیر کی منت سماجت سے تجھے کیا لینا دینا۔

11.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ غواصیؔ مملکتِ گولکنڈہ کے چوتھے حکمران ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوا۔ محمد قطب شاہ کے دور میں اس نے اپنی بے مثال مثنوی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' لکھی۔ اس مثنوی سے قبل بھی اس نے ایک مثنوی ''میناست ونتی'' تصنیف کی تھی۔

☆ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں اس کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا۔ اس بادشاہ نے اس کی سرپرستی کی اور اپنے دربار کا ملک الشعرا بنایا۔ اسی دور میں غواصی نے ایک اور شاہکار مثنوی ''طوطی نامہ'' قلم بند کی۔

☆ مثنویوں کے علاوہ غواصی نے قصیدے، رباعیاں، غزلیں، نظمیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کا شاعر ہے۔ دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں اس کی شاعری کے جوہر غزل میں کھلتے ہیں۔

☆ غواصی کے ہم عصر شاعروں میں وجہیؔ، محمد قلی اور عبداللہ قطب شاہ نے بھی صنفِ غزل میں طبع آزمائی کی ہے لیکن سادگی و سلاست، نغمگی وموسیقیت اور حقیقت پسندی اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے غواصی کی غزلیں ان سب شعرا پر فوقیت رکھتی ہیں۔

☆ جذبات و احساسات اور مشاہدات کی پُر اثر ترجمانی اور وارداتِ قلب کی فن کارانہ پیش کشی کی وجہ سے اس کی غزلیں غنائیت کے کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

☆ غواصیؔ کا تصورِ محبوب شمالی ہند کے شاعروں کی طرح مبہم اور غیر واضح نہیں بلکہ اس نے برملا انداز میں محبوب کے لیے تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ تاہم ریختیوں میں چوں کہ اظہارِ عشق عورت کی جانب سے ہوتا ہے اس لیے ان میں محبوب کے لیے صیغۂ تذکیر استعمال کیا گیا ہے۔

☆ غواصیؔ چونکہ حضرت سید شاہ حیدر ولی اللہ کا مرید تھا اس لیے اس کی غزلوں میں اخلاقی اور روحانی عناصر کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہیں۔ غواصی اپنے عہد کا ایک قد آور شاعر اور باکمال غزل گو تھا۔ اسے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بے پناہ احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی اور شاعر کو اپنا ہم سر نہیں سمجھتا تھا:

جو کئی عرفان کے صاحب سچے ہیں سو کتے ہیں یوں
کہ یاں تو کوئی نیں دستا غواصی کے قرینے کا

11.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی	الفاظ	:	معنی
سخن ور	:	شاعر	سفیر	:	قاصد
فصاحت آثار	:	خوش بیان	فراوانی	:	زیادتی، کثرت
مشدد	:	وہ حرف جس پر تشدید ہو	عسرت	:	غربت

پیش رو	:	پہلے گزرا ہوا	ہم عصر	:	ہم زمانہ، اپنے زمانے کا
کامل الفن	:	ماہر فن	استاد سخن	:	شاعری کا استاد
مدمقابل	:	حریف، برابر کا	نووارد	:	نیا آیا ہوا
غم دوراں	:	زمانے کا غم	منتشر خیال	:	غیر مربوط خیال
متغزلین	:	غزل کہنے والے، غزل گو	غائر	:	گہرا
اصفہان	:	ایران کا ایک شہر	عجمی	:	ایرانی
تانیث	:	مونث	تکلم	:	گفتگو
چابک دستی	:	مہارت	سائیں	:	مالک، محبوب
اَدھر	:	لب، ہونٹ	امریت	:	آب حیات
نوسرہار	:	نولڑیوں کا گلے میں پہننے کا زیور	قلندر	:	دین و دنیا سے آزاد
بے اعتنائی	:	عدم توجہی	دَیا	:	مہربانی
قدآور	:	بلند قامت، بلند مرتبہ	منج	:	مجھ
کدھیں	:	کبھی	اسوں	:	اس + سوں = اِس سے
انگے	:	سامنے	گھالی	:	ڈالی
رھیا	:	رہا	لیایا	:	لایا

11.7 نمونہ امتحانی سوالات

11.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ غواصی کس دور کا شاعر تھا؟

2۔ غواصی نے کتنے تخلص اختیار کیے تھے؟

3۔ غواصی کے پیرومرشد کا کیا نام تھا؟

4۔ غواصی نے کتنی مثنویاں لکھی ہیں؟

5۔ ''مینا ستونتی'' کس کی مثنوی ہے؟

6۔ مثنوی ''طوطی نامہ'' کو کس نے مرتب کیا؟

7۔ ''کلیات غواصی'' کو کس نے مرتب کیا؟

8۔ 'محمد علی اثر کے مطابق غواصی کی کل کتنی غزلیں ہیں؟

9۔ ڈاکٹر محمد بن عمر نے کلیات غواصی کو کس سنہ میں مرتب کیا؟

10۔ ''غواصی: شخصیت اور فن'' کس کی تصنیف ہے؟

11.7.2 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ غواصی کے کلام کی سادگی اور سلاست پر نوٹ لکھیے۔

2۔ غواصی کی غزلوں میں حقیقت پسندی کی نشاندہی کیجیے۔

3۔ غواصی کی شاعری میں تصور محبوب کو بیان کیجیے۔

4۔ غواصی کی غزلوں میں اخلاقی عناصر کی نشاندہی کیجیے۔

5۔ غزل ''پلا مست اے ساقی کہ منج عادت ہے پینے کا'' کی تشریح کیجیے۔

11.7.3 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ غواصی کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

2۔ غواصی کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3۔ غواصی کے شاعرانہ کمال کے بارے میں اظہار خیال کیجیے۔

11.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	غواصی: شخصیت اور فن	پروفیسر محمد علی اثر
2۔	دکنی غزلوں کی نشو ونما	پروفیسر محمد علی اثر
3۔	دکنی غزل کا انتخاب	پروفیسر محمد علی اثر
4	قدیم اردو غزل، تنقید و انتخاب	پروفیسر محمد علی اثر
5۔	غواصی	محمد بن عمر
6۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	جمیل جالبی

اکائی 12: ولی کی غزل گوئی

(شاعر کا تعارف، منتخبہ دو غزلوں کی تشریح)

اکائی کے اجزا

12.0		تمہید
12.1		مقاصد
12.2		ولی کے حالات زندگی
12.3		ولی کی غزل گوئی
12.4		منتخبہ دو غزلوں کا متن مع تشریح
	12.4.1	غزل نمبر 1: تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
	12.4.2	غزل نمبر 2: وو صنم جب سوں بسا دیدہ، حیران میں آ
12.5		اکتسابی نتائج
12.6		کلیدی الفاظ
12.7		نمونہ امتحانی سوالات
	12.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	12.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	12.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
12.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

ولی دکنی کا تاریخ کے اس دور سے تعلق ہے جب دکنی کلچر کی تہذیبی اور ادبی اکائی، عالم گیر کی فتحِ دکن کی وجہ سے متاثر ہو چکی تھی اور اس کی وجہ سے پھر ایک بار شمال اور جنوب کے فاصلے گھٹ گئے تھے۔ اہل شمال، دکن کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے تھے اور شمال اور جنوب کی زبان میں آپسی لین دین شروع ہو چکا تھا۔ ولی نے دکن کی ادبی روایت کو شمال کی زبان اور فارسی روایت سے قریب تر کر کے (فارسی روایت دکنی ادب میں پہلے ہی سے جگہ پا چکی تھی) ایک ایسا رنگ پیدا کیا جو سارے ہندوستان کے لیے قابلِ تقلید بن گیا۔

ولی سے پہلے شمالی ہند کے اہلِ علم، اردو کو بول چال کی زبان کے طور پر تو استعمال کرتے تھے لیکن شعر و ادب کے لیے فارسی ہی کو ترجیح دیتے

تھے، کبھی کبھی اردو میں بھی شعر موزوں کرلیا کرتے تھے۔ قائم چاند پوری کے بیان کے مطابق ولی نے 1700ء میں دلی کا سفر کیا تھا اور وہاں ادبی محفلوں میں شرکت کی اور اپنا کلام سنایا۔ شمالی ہند کے شاعروں نے براہِ راست ولی کا اثر قبول کیا۔ اہلِ شمال کو احساس ہوا کہ اردو جسے وہ ایک کم مایہ زبان سمجھتے تھے اس میں اتنی گہرائی، گیرائی اور قوتِ اظہار موجود ہے کہ اس میں ادب بھی تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح شمالی ہند میں شاعری کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ مصحفی کے مطابق جب 1719ء میں ولی کا دیوان دلی پہنچا تو شمالی ہند کی فضاؤں میں ولی کے نغمے گونجنے لگے اور ان کے شعر زباں زدِ خاص وعام ہوگئے۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے :

> ''جب ولی کا دیوان دلی پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا، قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا، لذت نے زبان سے پڑھا، گیت موقوف ہوگئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں اس کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ اربابِ نشاط احباب کو سنانے لگے۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا۔''
>
> (محمد حسین آزاد، آبِ حیات، ص92)

مختصراً دیوانِ ولی کے دلی پہنچنے کے بعد شمالی ہند میں باقاعدہ اردو میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ اہلِ شمال کو ولی کے کلام میں قوتِ ترسیل اور ابلاغ کی توانائی نظر آئی۔ ولی کے اشعار گلی کوچوں، ادبی محفلوں اور اہلِ ذوق کی مجلسوں میں گونجنے لگے۔ شعرائے دہلی، ولی کی زمینوں میں شعر کہنے کو باعثِ فخر سمجھنے لگے۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

- ☆ ولی کے حالاتِ زندگی کو بیان کرسکیں۔
- ☆ ولی کی غزل گوئی کی خصوصیات واضح کرسکیں۔
- ☆ ولی کی منتخب غزلوں کی تشریح کرسکیں۔

12.2 ولی کے حالاتِ زندگی

قدیم اردو کے اکثر وبیش تر شعرا کی طرح ولی کی زندگی کے ابتدائی دور کے بارے میں مستند معلومات دریافت نہیں ہو پائی ہیں۔ اتنا تسلیم کیا جاتا ہے کہ ولی محمد نام تھا، والد کا نام مولانا شریف محمد تھا جو گجرات کے مشہور بزرگ شاہ وجیہ الدین کے بھائی شاہ نصر اللہ کی اولاد میں تھے۔ ولی 1649ء سے قبل اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ولی کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں بھی معلومات حاصل نہیں ہو پائی ہیں اتنا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے حصولِ علم کے لیے بہت سی جگہوں کے سفر کیے۔ گجرات، احمد آباد اور دلی کی سیاحت اسی میں آجاتی ہے لیکن قطعی طور پر ان کی تعلیم کے بارے میں یہ کہنا کہ کہاں اور کس طرح ہوئی مشکل ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے :

> ''ولی نے احمد آباد میں شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ کے مدرسے میں تعلیم پائی اور وہیں شاہ نورالدین صدیقی سہروردی کے مرید ہوئے۔'' (ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، کلیاتِ ولی، ص11)

ولی کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ قرآن شریف، حدیث اور فقہ پر نظر رکھتے تھے۔ فارسی سے

اچھی طرح واقف تھے۔ اپنے زمانے کے تقریباً تمام مروّجہ علوم پر دسترس رکھتے تھے۔

ولی کو سیر و سیاحت سے بڑی دلچسپی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینۂ منورہ کے لیے بھی گئے تھے اور اسی سلسلے میں سورت بھی گئے جو اس زمانے میں حج کے لیے جانے کا راستہ تھا۔ ان کی سیاحت میں سفرِ دلی بڑا انقلاب انگیز اور اہم ہے۔ اسی سفر نے شمالی ہند کی ادبی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ یہ سفر انھوں نے 1700ء میں اپنے دوست سید ابولمعالی کے ساتھ کیا تھا۔ ولی کا انتقال 1720ء اور 1725ء کے درمیانی عرصے میں ہوا۔

12.3 ولی کی غزل گوئی

کلیاتِ ولی میں تقریباً تمام اصناف سخن پر مشتمل کلام ملتا ہے لیکن جس صنف نے انھیں شہرت عام و بقائے دوام بخشی وہ غزل ہے۔ کلیات میں غزل ہی کا حصہ زیادہ بھی ہے اور وقیع بھی۔ ادب میں مختلف اصناف' مخصوص تہذیبی' سماجی اور ذہنی اثرات کے تحت قبولیت اور شہرت حاصل کرتی ہیں۔ غزل بھی خاص تہذیبی حالات میں پیدا ہوئی لیکن اس صنف نے وقت کی تبدیلی کے ساتھ خود کو بھی بدل لیا شاید اس نے سب سے زیادہ سیاسی' سماجی' تہذیبی اور ادبی انقلابات دیکھے۔ جب اور جہاں جیسی ضرورت ہوئی ویسی ہی شکل اس نے اختیار کر لی۔ گیتوں کی فضا میں گیتوں کی مدھر نغمگی غزل نے اپنے میں سمولی' تصوف کا زور بڑھا تو اسی کو اپنا خاص رنگ بنا لیا' داخلیت کا اظہار رہا تو دل سے نکلی اور دل میں اتر گئی' خارجیت کا چلن ہوا تو سارے بندھن توڑ ڈالے۔ سماجی اور تہذیبی تبدیلی کے ساتھ وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے غزل اپنے دامن کو وسیع کرتی گئی' مختلف مضامین اس میں جگہ پاتے گئے' فلسفیانہ مضامین کو بھی جگہ ملی' صوفیانہ خیالات بھی آئے' آلامِ روزگار اور فکرِ معاش بھی' زندگی کا شکوہ بھی اور شادمانی کا ذکر بھی۔ موضوعات کی اس رنگارنگی اور طرزِ ادا کے اس نشیب و فراز کے باوجود غزل کا موضوع بنیادی طور پر عشق و محبت ہی رہا۔ ولی کی غزلوں میں ہمیں مندرجہ بالا تمام رنگ کہیں گہرے اور کہیں مدھم نظر آتے ہیں۔ ولی ایک بلند پایہ غزل گو شاعر تھے۔ ان کی عظمت کا اعتراف شمالی ہند کے کئی بڑے شاعروں نے کیا ہے۔ شاہ حاتم لکھتے ہیں:

حاتم یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں　　　لیکن ولی' ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

آبرو نے کہا:

آبرو شعر ہے ترا اعجاز　　　پر ولی کا سخن قیامت ہے

میر تقی میر کا کہنا ہے:

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

ولی کے کلام میں بلا کی رنگینی اور دل کشی پائی جاتی ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی بیان کرتے ہیں اس کا براہِ راست تعلق ان کے جذبات و احساسات اور تجربات سے ہوتا ہے۔ ان کے اکثر و بیشتر اشعار ان کے دل پر گزری ہوئی واردات کا اظہار ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق اور حسن کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کی شاعری کا محور حسن و عشق ہی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں یہ ذکر بھی کیا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے مجاز کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں:

تواضع ' خاکساری ہے ہماری سرفرازی ہے　　　حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشقِ مجازی ہے

یا پھر ان کا کہنا ہے:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا　　کیا حقیقی و کیا مجازی کا

مجازی عشق کا بیان ولی نے پوری فن کاری اور مہارت کے ساتھ کیا ہے۔ اپنے محبوب کی تعریف اور اس کی سراپا نگاری انھوں نے جس انداز سے کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ولی کی جمالیاتی حس بہت شدید ہے۔ ان کے کلیات کے بیش تر اشعار ایسے لطیف اور تیز احساس جمال کی تصویر پیش کرتے ہیں جس کی مثالیں اردو شاعری میں بہت کم ہیں۔ اسی احساس جمال نے انھیں اردو کا سب سے بڑا سراپا نگار بنا دیا ہے۔ اشعار بہ طور مثال درج کیے جا رہے ہیں:

قد ترا رشکِ سروِ رعنا ہے　　معنیِ نازکی سراپا ہے
تجھ بھواں کی میں کیا کروں تعریف　　مطلعِ شوخ و رمز و ایما ہے
چمنِ حسن میں نگہہ کر دیکھ　　زلفِ معشوق عشقِ پیچاں ہے
کیوں نہ مجھ دل کوں زندگی بخشے　　بات تیری دَمِ مسیحا ہے
سنبل اس کی نظر میں جا نہ کرے　　جس کوں تجھ گیسوؤں کا سودا ہے
اس کے پیچاں کا کچھ شمار نہیں　　زلف ہے یا یہ موجِ دریا ہے

ولی ایک غزل میں لکھتے ہیں:

ترا مکھ ہے چراغِ دل ربائی　　عیاں ہے اس میں نورِ آشنائی
لکھا ہے تجھ قد اوپر کاتبِ صنع　　سراپا معنیِ نازک ادائی
تو ہے سر پاؤں لگ از بس کہ نازک　　نگہہ کرتی ہے تجھ پگ کوں حنائی
تری انکھیاں کی مستی دیکھنے میں　　گئی ہے پارسا کی پارسائی

مقامی روایات والفاظ کے استعمال کے ساتھ حسن کا بیان ملاحظہ ہو:

کوچہٗ یار عین کاسی ہے　　جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے
اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال　　ہندوئے ہردوار باسی ہے
زلف تیری ہے موج جمنا کی　　تل نزک اس کے جیوں سناسی ہے
یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر　　ناگنی جیوں کنوے پہ پیاسی ہے

فارسی ادب کی خوشہ چینی کے ساتھ حسن کی تصویر کشی دیکھیے:

ترا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے　　نین جامی، جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے
ریاضی فہم و گلشن طبع و دانا دل، علی فطرت　　زباں تیری فصیحی و سخن تیرا زلالی ہے
نگہہ میں فیضی و قدسی سرشتِ طالب وشیدا　　کمالی بدر، دل اہلی و انکھیاں سوں غزالی ہے

تو ہی ہے خسروِ روشن ضمیر و صاحبِ شوکت　　ترے ابرو یہ مجھ بیدل کوں طغرائے وصالی ہے
ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا ہے شوق و مائل　　تو ہر اک بیت عالی ہور ہر اک مصرع خیالی ہے

اپنے محبوب کے بارے میں ولی ایک مقام پر لکھتے ہیں:

جگ میں دوجا نہیں ہے خوب رو تجھ سار کا　　چاند کوں ہے آسماں پر رشک تجھ رخسار کا
جب سوں تیری زلف کوں دیکھا ہے زاہد اے صنم　　ترک کر مسجد کوں ہے مشتاق تجھ زنار کا

ایک غزل میں اس طرح رقم طراز ہیں:

طالب نہیں مہر و مشتری کا　　دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا
تجھ تل سوں اے آفتاب طلعت　　ممنون ہوں ذرہ پروری کا
کفارِ فرنگ کوں دیا ہے　　تجھ زلف نے درس کافری کا
توں سرسوں قدم تلک جھلک میں　　گویا ہے قصیدہ انوری کا

ولی کے کلام میں تشبیہات واستعارات کا استعمال بھی بہت اہم ہے۔انھوں نے مروجہ تشبیہات کو تازگی اور توانائی بخشی۔اس کے علاوہ نئی تشبیہات اور استعارے وضع کیے جنھوں نے غزل کے دامن کو وسعت دی اور اظہار و بیان کے نئے راستے اور انداز پیدا کیے۔یہاں چند اشعار بہ طور مثال پیش کیے جا رہے ہیں:

صنعت کے مصور نے صباحت کے صفحے پر　　تصویر بنائی ہے تری نور کو حل کر

کیا ہوسکے جہاں میں ترا ہمسر آفتاب　　تجھ حسن کی اگن کا ہے اک اخگر آفتاب

تجھ مکھ کی جھلک دیکھ گئی جوت چندر سوں　　تجھ مکھ پہ عرق دیکھ گئی آب گہر سوں

نین دیول میں پتلی ہے ویا کعبے میں ہے اسود　　ہرن کا ہے یو نافہ یا کنول بھیتر بھنور دستا

دونوں جہاں کوں مست کرے ایک جام میں　　آنکھوں کا تیرے عکس پڑے گر شراب میں

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا　　جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

موج دریا کی دیکھنے مت جا　　دیکھ اس زلفِ عنبریں کی ادا

حسن ہے دامِ بلا زلف ہے دو کالے ناگ	جس کو کالے نے ڈسا اس کوں جلانا مشکل

مکھ ترا جیوں روز روشن، زلف تیری رات ہے	کیا عجب یو بات ہے یک ٹھار دن ہور رات ہے

تشبیہات واستعارات کی مدد سے ولی اپنے محبوب کی جو تصویر پیش کرتے ہیں، اس کی محبت میں ولی اپنے عشق کی جو روداد بیان کرتے ہیں اس میں ایک مخصوص قسم کی شائستگی پائی جاتی ہے، بوالہوسی اور ہرجائی پن کے بجائے وفاداری اور پاسِ عشق ملتا ہے۔ سنجیدگی، گہرائی، ضبط اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ ان کے عشق کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ ان کے نزدیک عشق ومحبت سے زیادہ اہم کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کا کلیات ان کی عاشق مزاجی اور حسن پرستی کا مرقع ہے۔ ان کے کلام میں جو خاص درد اور مٹھاس نمایاں ہے غالباً وہ ان کی حقیقی اور بے لوث محبت کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے اپنی بے لاگ محبت کا اظہار کئی طرح سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے	کہ فنِ عاشقی عجب فن ہے

پاک بازوں سے یہ ہوا معلوم	عشق مضمونِ پاک بازی ہے

مجھ دل کے آچمن میں کر یک نظر تماشا	داغاں کے ہے گلاں سوں روشن یو باغ میرا

تجھ عشق میں ولی کے انجھو ابل چلے ہیں	اے بحرِ حسن آ دیکھ اس پور کا تماشا

بے منّتِ شراب ہوں سرشارِ انبساط	تجھ نین کا خیال مجھے جامِ جم ہوا

وو مرا مقصودِ جان و تن ہوا	جس کا مجھ کوں رات دن سمرن ہوا

مثلِ مینائے شرابِ بزمِ حسن	حوضِ دل تج عکس سوں روشن ہوا

بے کسی کے حال میں یک آن میں تنہا نہیں	غم ترا سینے میں میرے ہمدمِ جانی ہوا

ہر درد پہ کر صبر ولی عشق کی رہ میں	عاشق کوں نہ لازم ہے کرے دکھ کی شکایت

کئی بار لکھا اس کی طرف نامہ کوں لیکن　　　ہر بار مٹا اشک نے مجھ نامے کو تر کر

اس صاحبِ دانش سوں ولی ہے یہ تعجب　　　یک بارگی کیوں مجھ کوں گیا دل سے بسر کر

اے جانِ ولی لطف سوں آبر میں مرے آج　　　مجھ عاشقِ بے کل ستی مت وعدۂ کل کر

گلی سوں نیہہ کی کیوں جا سکوں ولی باہر　　　ہوئی ہے خاک پری رو کی رہ کی دامن گیر

دوجا نہیں کچھ مدعا اس عاشقِ جاں باز کوں　　　ہے آرزو دل میں مرے پیتم کے ملنے کی فقط

قرار نہیں ہے مرے دل کوں اے سجن تجھ بن　　　ہوئی ہے دل میں مرے آہ شعلہ زن تجھ بن

یہی ہے آرزو دل میں کہ صاحب درد کئی جا کر　　　ہمارے درد کی باتاں کہے اس پی پیارے کوں

ولی کا عشق خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ولی نے مجازی عشق کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد اس عشق کے سرے عشق حقیقی سے ملا دیے ہیں کہتے ہیں:

در وادیِ حقیقت جن نے قدم رکھا ہے　　　اوّل قدم ہے اس کا عشقِ مجاز کرنا

اس تصورِ عشق کے ذریعے ولی تصوف کی روایت کو اپنے موضوعات کے پھیلاؤ اور کم وبیش ساری علامات کے ساتھ اردو شاعری کے دامن میں جگہ دیتے ہیں اور ایک نئے لہجے اور سرمدی آوازوں سے ان میں ایک ایسا رنگ بھر دیتے ہیں کہ ولی کے اس قسم کے اشعار کے مطالعے کے بعد ان کا صوفیِ کامل ہونا ثابت ہو جاتا ہے:

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسنِ بے حجاب اس کا　　　بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا
عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے　　　ہو فنا فی اللہ دائم ذاتِ یزدانی کرے
سجن کے باج عالم میں دگر نئیں　　　ہمیں میں ہے و لے ہم کو خبر نئیں
عجب ہمت ہے اس کی جس کو جگ میں　　　بغیر ازیار دوجے پر نظر نئیں
ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی　　　یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر یک غنچہ وہاں کا
خودی سے اولاً خالی ہو اے دل　　　اگر اس شمعِ روشن کی لگن ہے
کہہ وی ہے اہلِ دل نے یہ بات مجھ کو دل سے　　　عارف کا دل بغل میں قرآنِ بے کلی ہے
نشانی حق کے پانے کی جگت کی بے نیازی ہے　　　کشاکش کام اپنے کی جگت کی کارسازی ہے

نکال خاطرِ فاتر سوں جامِ جم کا خیال　　　صفا کر آئینہ دل کا سکندری یو ہے

تصوف وعرفان کے ساتھ ولی کے پاس زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور دنیاوی زندگی کی بے ثباتی کا ذکر ملتا ہے۔ظاہر پرستی، نمود ونمائش سے نفرت کا اظہار، صداقت کی تعلیم، خوش خصلتی، تسلیم ورضا، پاکبازی وصبر کی تلقین پائی جاتی ہے۔لکھتے ہیں:

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو ہشیار ہو　　　کب لگ رہے گا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو
گر دیکھنا ہے مدعا اس شاہدِ معنی کا رو　　　ظاہر پرستاں سوں سدا بیزار ہو بیزار ہو
دمِ تسلیم سوں باہر نکلنا سو قباحت ہے　　　نہ دھر اس دائرے سوں ایک دم باہر چرن ہرگز
عشق کے رمز سوں نہیں آگاہ　　　کیا ہوا توں کیا کتاباں جمع
اے بے خبر اگر ہے بزرگی کی آرزو　　　دنیا کی رہ گزر میں بزرگوں کی چال چال
ولی کوں نہیں مال کی آرزو　　　خدا دوست نئیں دیکھتے زر طرف
اے ولی تیغِ غم سے خوف نہیں　　　خاکساری بدن پہ جوشن ہے
اسباب سے جہاں کے ہوں بے غرض سدا میں　　　بن تیل اور بتی ہے روشن چراغ میرا
یو بات عارفاں کی سنو دل سے سالکاں　　　دنیا کی زندگی ہے یو وہم و گماں محض
ولی منزلِ عاقبت میں ترا　　　نہیں کوئی حسنِ عمل بن رفیق

ولی نے انسانی زندگی کی حقیقت سادگی اور صفائی کے ساتھ بیان کی ہے۔دولت سب کچھ نہیں لیکن بہت کچھ ہے ولی کہتا ہے:

مفلسی سب بہار کھوتی ہے　　　مرد کا اعتبار کھوتی ہے
باعثِ رسوائیِ عالم ولی　　　مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

فلسفۂ محبت کا بیان ولی نے اس طور پر کیا ہے:

ہر اک وقت مجھ عاشقِ زار کوں　　　پیارے تری بات پیاری لگے

محبت کبھی بھی اور کسی کو بھی ہوسکتی ہے۔

عشق کے ہاتھ سوں ہوئے دل ریش　　　جگ میں کیا بادشاہ کیا درویش

عاشق کبھی اکیلا نہیں رہتا کیوں کہ اس کے ساتھ

اک گھڑی تجھ ہجر میں اے دل ربا تنہا نہیں　　　مونس و دم ساز میری آہ ہے فریاد ہے

ولی نے ہندی کے الفاظ اور فارسی الفاظ ومحاورات کو اس طرح ملایا ہے کہ ایک خوب صورت اور دل کش ادبی زبان بن گئی ہے۔الفاظ و تراکیب کی جدت اور ندرت ولی کی شاعری میں نکھار اور خوب صورتی پیدا کرتی ہے۔

شاعری میں مختلف صنعتوں کے استعمال سے ولی نے جو حسن پیدا کیا ہے اِس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔یہاں صرف ان ہی صنعتوں کا ذکر کیا جارہا ہے جو ولی کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔

ولی کے پاس رعایتِ لفظی کا استعمال اکثر و بیشتر ہوا ہے۔وہ ایسے الفاظ کو جو ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ رعایت اور کنایہ رکھتے ہوں ترتیب دینے میں قدرت رکھتے ہیں:

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا　　جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

صنعت مراعات النظیر کا استعمال بھی ولی کے پاس مہارت کے ساتھ ملتا ہے۔اس میں ایسی چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو باہم مناسبت رکھتی ہوں۔

آج کی رین مجھ کو خواب نہ تھا　　دونوں انکھیاں میں غیرِ آب نہ تھا
تجھ حسنِ آب دار کی تعریف کیا لکھوں　　موتی ہوا ہے غرق تجھے دیکھ آب میں

حسنِ تعلیل ایسی صنعت ہے جس میں کسی چیز کی ایک ایسی علت فرض کر لی جاتی ہے جو دراصل اس کی علت نہیں ہوتی جیسے:

ماہ کے سینے اُپر اے ماہ رو　　داغ ہے تج حسن کی جھلکار کا
مشرق سوں مغرب لگ سدا پھرتا ہے ہر ہر گھر ولے　　اب لگ سرج دیکھیا نہیں ثانی ترا آفاق میں
ترے جو قدسوں رکھا نیشکر نے دل میں گرہ　　تو کھینچ پوست کیا اس کا بند بند جدا

صنعت عکس ایسی صنت ہے جس میں ایک مصرع میں الفاظ جس ترتیب میں آئیں دوسرے مصرع میں ترتیب کو الٹ دیا جاتا ہے۔ولی کے پاس اس کا استعمال ملاحظہ کیجیے :

تجھ سوں لگی ہے لگن اے گلِ باغ حیا　　اے گلِ باغ حیا تجھ سوں لگی ہے لگن
مجھ کو ہے دارالامن پیو کا نقشِ چرن　　پیو کا نقشِ چرن مجھ کو ہے دارالامن

کلام میں دو لفظ ایسے لانا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں صنعتِ تضاد یا طباق کہلاتا ہے۔ولی کے پاس اس صنعت کا استعمال ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو:

ہجر کی زندگی سوں موت بھلی　　کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا
دورنگی سوں تری اے سرو رعنا　　کبھو راضی کبھو بے زار ہیں ہم
مکھ ترا جیوں روزِ روشن زلف تیری رات ہے　　کیا عجب یو بات ہے اک ٹھار دن ہور رات ہے
بخشی ہے تری نین نے کیفیتِ مستی　　تجھ مکھ نے خبردار کیا بے خبری کوں

کسی وصف کو شدت اور ضعف میں انتہا تک پہنچا دینا مبالغہ کہلاتا ہے۔ولی کے پاس اس کی مثالیں ملاحظہ کیجیے :

ہمارے دیدۂ گریاں سے ابرِ تر کوں کیا نسبت　　وہ اک جھالے میں تھم جاتا ہے یہ برسوں برستے ہیں
یک نقطہ ترے صفحۂ رخ پر نہیں بے جا　　اس مکھ کوں ترے صفحۂ قرآں سوں کہوں گا
تجھ ہجر میں دامان و گریبان و رو مالاں　　شاکی ہیں ہر اک رات مرے دیدۂ ترسوں

ایہام کے لغوی معنی وہم میں ڈالنا ہے ایک لفظ کے دو معنی ہوں ایک قریب دوسرے بعید، لفظ کے بعید معنی مراد لیے جائیں تو اس کو صنعت

ایہام کہتے ہیں اس صنعت کو ولی نے فن کاری کے ساتھ استعمال کیا ہے۔شمالی ہند کے شعرانے دلی کی تقلید میں ایہام نگاری کو رواج دیا۔صنعتِ ایہام ولی کے پاس پرلطف انداز میں ملتی ہے:

موسیٰ جو آ کے دیکھے تجھ نور کا تماشا　　اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا
مذہبِ عشق میں تری صورت　　دیکھنا ہم کو فرضِ عین ہوا
ایک کہتے ہیں مکھ یہ کعبہ ہے　　اس میں تِلی نے کیوں کیا ہے محل
زہرہ جبیناں خلق کی آویں برنگِ مشتری　　گر ناز سوں بازار میں نکلے وہ ماہِ مہرباں

ولی نے پیش روشعرا سے حاصل کردہ روایات میں اپنے علم وفضل سے کسب واکتساب کر کے وہ سب کچھ شامل کر دیا جس سے ان کی شاعری اوران کی آواز منفرد رنگ وآہنگ اختیار کرگئی۔بعد کے تقریباً تمام بڑے شاعروں کے پاس ولی کے خیالات،افکار،نظریات اور موضوعات کی موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ اپنے بعد آنے والوں کے لیےنئی راہیں چھوڑ گئے۔مختلف شعرا کے پاس ولی کے خیال اور موضوع کی تکرار ملتی ہے:ذیل میں ایسے چند اشعار بہ طور مثال درج کیے جار ہے ہیں:

ولی:

بات کہنے کا کبھی جب وقت پاتا ہے غریب　　بھول جاتا ہے وہ سب دیکھ صورت یار کی

میر:

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے وہ جو آتا　　سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

غالب:

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے　　کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

امیر مینائی:

یہ کہوں گا، یہ کہوں گا، یہ ابھی کہتے ہو　　سامنے ان کے بھی جب حضرتِ دل یاد رہے

داغ کے پاس تو مصرع بھی لڑ گیا ہے۔

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم　　بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

ولی کا شعر ہے:

رات دن جگ میں رفیقِ بے کساں　　بے کسی ہے، بے کسی ہے ، بے کسی

اسی خیال کو درد کے پاس ملاحظہ کیجیے :

آنکھیں بھی ہائے نزع میں اپنی بدل گئیں　　سچ ہے کہ بے کسی میں کوئی آشنا نہیں

امیر مینائی لکھتے ہیں:

پتلیاں تک بھی تو پھر جاتی ہیں دیکھو دمِ نزع　　وقت پڑتا ہے تو سب آنکھ چرا جاتے ہیں

ولی نے محبوبہ کی ناراضگی کا بیان اس طرح کیا ہے:

کرتی ہے دل کو بے خود اس دل رُبا کی گالی　　　گویا ہے جامِ شربت اس خوش ادا کی گالی

غالب نے کہا:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　　گالیاں کھاکے بے مزہ نہ ہوا

مومن کا شعر ہے:

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں　　　اے ہم نشیں نزاکتِ آواز دیکھنا

ولی نے ایک شعر میں اپنا فلسفۂ زندگی اس طرح بیان کیا:

یو بات عارفاں کی سنو دل سے سالکاں　　　دنیا کی زندگی ہے یو وہم و گمان محض

اسی خیال کو مرزا غالب نے یوں باندھا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد　　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

غرض ولی نے غزل کے امکانات کا وسیع راستہ آنے والے شعرا کے سامنے کھول دیا اور ولی کی غزل کے رجحانات اردو غزل کے بنیادی رجحانات بن گئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''یہ بات یاد رہے کہ آگے چل کر جتنے رجحانات نمایاں ہوئے وہ خواہ عشقیہ شاعری کا رجحان ہو یا ایہام پسندی کا' لکھنوی شاعری کی خارجیت اور مسی چوٹی والی شاعری ہو' مسائلِ تصوف کے بیان والی شاعری ہو یا ایسی شاعری ہو جس میں داخلیت اور رنگا رنگ تجربات کا بیان ہو یا اصلاحِ زبان و بیان کی تحریک ہو' سب کا مبدا ولی ہے۔ ولی کا اجتہاد اتنا بڑا ہے کہ اردو غزل نے جو رخ بھی بدلا اس میں ولی ہی کو رہبر پایا۔''

(تاریخ ادب اردو' جلد اول' ڈاکٹر جمیل جالبی صفحہ 557)

اپنی صلاحیتوں کے ماہرانہ استعمال سے صنفِ غزل کو ممتاز مقام تک پہنچانے کے ساتھ ولی آنے والوں کو یہ پیغام دے گئے ہیں۔

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں　　　تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

12.4 منتخبہ دو غزلوں کا متن مع تشریح

12.4.1 غزل نمبر 1: تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

دی بادشہی حق نے تجھے حسن نگر کی
یو کشور ایراں میں سلیماں سوں کہوں گا

تعریف ترے قد کی الف وار سریجن
جا سرو گلستاں کوں خوش الحاں سوں کہوں گا

زخمی کیا ہے دل تری پلکاں کی انی نے
یو زخم ترا خنجر و پیکاں سوں کہوں گا

جلتا ہوں شب و روز ترے غم میں اے ساجن
یہ سوز ترا مشعل سوزاں سوں کہوں گا

یک نقطہ ترے صفحۂ رخ پر نہیں بے جا
اس مکھ کو ترے صفحۂ قرآں سوں کہوں گا

بے صبر نہ ہو اے ولؔی اس درد سوں ہرگز
جلتا ہوں ترے درد میں درماں سوں کہوں گا

غزل نمبرایک (1) کی تشریح:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

اس شعر میں ولی اپنے محبوب کی خوب صورتی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے محبوب! میں تیرے ہونٹوں کو خوبی میں بدخشاں کے لعل جیسا سرخ اور قیمتی کہوں گا اور تیری بڑی بڑی آنکھوں کو ہرن جیسی جادو بھری بلکہ خود جادو کہوں گا۔ بدخشاں کے لعل سرخی میں اور ہرن کی آنکھیں خوب صورتی میں مشہور ہیں لیکن محبوب کی آنکھیں اور ہونٹ دونوں سے بڑھ کر ہیں۔

دی بادشہی حق نے تجھے حسن نگر کی
یو کشور ایراں میں سلیماں سوں کہوں گا

خدا نے تجھے اور صرف تجھے شہرِ حسن و جمال کی بادشاہی عطا کی ہے۔ میں یہ بات سلطنت ایران کے عظیم سلطان سلیمان سے کہوں گا کہ یہ بادشاہت ان کے پاس نہیں ہے بلکہ تمہارے پاس ہے۔ اس شعر میں حسن نگر کی ترکیب بہت خوب صورت ہے جس کا مطلب ہے شہرِ حسن۔ اسی طرح سلیمان کی تلمیح بھی شعر میں شامل ہے، جن کی حکومت اور بادشاہت مشہور ہے۔

تعریف ترے قد کی الف وار سریجن
جا سرو گلستاں کوں خوش الحاں سوں کہوں گا

اے معشوق! تیرے خوش نما قد کی ستائش میں گلشن میں الف کی طرح سیدھے کھڑے ہوکر (یعنی فخر سے) بڑی خوش الحانی اور خوب صورتی سے بیان کروں گا تا کہ سرو اپنے طویل ہونے پر فخر نہ کرے۔اس شعر میں قد، الف اور سرو میں رعایت اور مناسبت پائی جاتی ہے۔

زخمی کیا ہے دل تری پلکاں کی انی نے
یو زخم ترا خنجر و پیکاں سوں کہوں گا

میرے دل کو تیرے پلکوں کی انی نے بری طرح زخمی کردیا ہےاس گہرے زخم کا تذکرہ میں دنیا کے خنجر اور تیر سے کروں گا کہ یہ ان سے بھی شدید ہے۔

جلتا ہوں شب و روز ترے غم میں اے ساجن
یہ سوز ترا مشعل سوزاں سوں کہوں گا

اے میرے ساجن! میں تیرے غم ہجر میں رات دن جلتا رہتا ہوں۔میں تیرے دیے ہوئے اس سوز غم کو جلتے رہنے والی مشعل سے بیان کروں گا کہ یہ سوزش اس سے بھی زیادہ ہے۔کیوں کہ مشعل تو صرف رات میں جلتی ہے جب کہ میں تو دن رات جلتا رہتا ہوں۔اس شعر میں شب و روز متضاد الفاظ ہیں۔

یک نقطہ ترے صفحۂ رخ پر نہیں بے جا
اس مکھ کو ترے صفحۂ قرآں سوں کہوں گا

تیرے چہرہ پر جو کتاب کے صفحہ کے مانند ہے ایک بھی نقطہ بے جا نہیں ہے۔میں تو تیرے چہرے کو قرانی صفحہ جیسا کہوں گا کیوں کہ یہ ہر قسم کی ممکن خطا سے پاک ہے۔نہ ایک نقط زیادہ نہ کم۔اس شعر میں نقطہ، صفحہ اور قرآن کے الفاظ میں رعایت لفظی ہے۔

بے صبر نہ ہو اے ولؔی اس درد سوں ہرگز
جلتا ہوں ترے درد میں درماں سوں کہوں گا

اے ولی! معشوق کے عطا کردہ غم فراق سے ہرگز بے صبر نہ ہو۔ناصبوری اس کا علاج نہیں ہے۔میں تجھ سے رخصت ہوکر تیرا دکھڑا بیان کرنے کے لیے تیرے معشوق کے پاس جارہا ہوں کہ تیرے درد کا معالج وہی ہے کوئی اور نہیں۔دوسرے مصرعے میں یہ کہا گیا ہے کہ عاشق کا دوست محبوب سے یہ نہیں کہے گا کہ عاشق درد میں مبتلا ہے بلکہ یہ کہے گا کہ عاشق کے درد و غم کو دیکھ کر میں تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہوں۔

12.4.2 غزل نمبر2: وو صنم جب سوں بسا دیدہ، حیران میں آ:

وو صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ
آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

یاد آتا ہے مجھے جب وو گل باغ وفا
اشک کرتے ہیں مکاں گوشۂ دامان میں آ

درد منداں کوں بجز درد نہیں صید مراد
اے شہ ملک جنوں غم کے بیابان میں آ

نالہ و آہ کی تفصیل نہ پوچھو مجھ سوں
دفتر درد بسا عشق کے دیوان میں آ

جگ کے خوباں کا نمک ہو کے نمک پروردہ
چھپ رہا آ کے ترے لب کے نمک دان میں آ

بسکہ مجھ حال سوں ہمسر ہے پریشانی میں
درد کہتی ہے مرا زلف ترے کان میں آ

غم سوں تیرے ہے ترحم کا محل حال ولی
ظلم کو چھوڑ سجن شیوۂ احسان میں آ

غزل نمبر دو (2) کی تشریح:

وو صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ
آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

معشوق کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر عاشق کی آنکھیں حیرت زدہ ہوگئی ہیں اور اس کا دل محبوب کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ گویا معشوق کے ایک جلوے نے نہ صرف اسے گھائل کر دیا بلکہ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی جاتی رہی۔ گویا عشق کی چنگاری نے عقل کو جلا دیا۔

یاد آتا ہے مجھے جب وو گل باغ وفا
اشک کرتے ہیں مکاں گوشۂ دامان میں آ

وہ خوب صورت معشوق باوفا جب بھی مجھے یاد آتا ہے تو میرے دامن کے گوشے غم ہجر کے سبب آنسوؤں سے تر ہو جاتے ہیں۔

درد منداں کوں بجز درد نہیں صید مراد
اے شہ ملک جنوں غم کے بیابان میں آ

درد کے مارے ہوؤں کو حالات کو اپنے بس میں کرنے کی تگ و دو کے نتیجے میں بھی درد کے سوا کوئی مراد حاصل نہیں ہوتی۔ دردمندوں یعنی عاشقوں کی مراد یا مقصد تو درد ہی ہے اس لیے اے ملک جنون کے بادشاہ! درد سے پیچھا نہ چھڑا بلکہ غم کے بیاباں میں آ اور اسے اپنا لے۔

نالہ و آہ کی تفصیل نہ پوچھو مجھ سوں
دفتر درد بسا عشق کے دیوان میں آ

مجھ سے میرے نالے اور میری آہ کی تفصیل نہ پوچھو کہ یہ کیوں اور کس لیے ہیں۔ میرے عشق کے دیوان میں درد کا دفتر آباد ہو گیا ہے کیوں کہ میرا تجربہ عشق ہی ایسا تھا، جس میں زخم کھانے، مرنے اور تڑپنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

جگ کے خوباں کا نمک ہوکے نمک پروردہ
چھپ رہا آکے ترے لب کے نمک دان میں آ

دنیا بھر کے حسینوں کی ستم گفتاری کی لذت، تیری لذت گفتاری کی پروردہ ہوکر، تیرے ہونٹوں کی آماجگاہ میں آکر چھپ گئی ہے۔ یعنی دنیا بھر کے حسین مل کر اپنی باتوں سے جس قدر تکلیف پہنچا سکتے ہیں وہ تو اکیلا پہنچا رہا ہے۔

بسکہ مجھ حال سوں ہمسر ہے پریشانی میں
درد کہتی ہے مرا زلف ترے کان میں آ

میں اور کیا کہوں۔ میرا حال غم دیکھ کر میرے ساتھ تیری زلفیں بھی پریشان اور بکھری ہوئی ہیں۔ مگر تجھے حقیقت حال کی خبر نہیں ہے۔ خود تیری زلف بار بار اڑتے ہوئے تیرے کان کے پاس آکر میرے درد عشق کی سرگوشی کرتی ہے۔ لیکن تو ہے کہ تجھے میرا کوئی خیال ہی نہیں۔

غم سوں تیرے ہے ترحم کا محل حال ولؔی
ظلم کو چھوڑ سجن شیوۂ احسان میں آ

تیرے دیے ہوئے غم عشق سے اب ولی کا حال قابل رحم ہو گیا ہے۔ اے میرے معشوق! یہ ظلم کی عادت چھوڑ دے اور ہم دردی اور احسان کا شیوہ اپنا لے۔ ہم تیرے سچے عاشق ہیں کوئی غیر نہیں۔

12.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ ولی کا پورا نام ولی محمد تھا، والد کا نام مولانا شریف محمد تھا جو گجرات کے مشہور بزرگ شاہ وجیہ الدین کے بھائی شاہ نصراللہ کی اولاد میں تھے۔ ولی 1649ء سے قبل اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ولی کا انتقال 1720ء اور 1725ء کے درمیانی عرصے میں ہوا۔

☆ ولی کو سیر و سیاحت سے بڑی دلچسپی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینۂ منورہ کے لیے بھی گئے تھے اور اسی سلسلے میں سورت بھی گئے جو اس زمانے میں حج کے لیے جانے کا راستہ تھا۔ ان کی سیاحت میں سفرِ دلی بڑا انقلاب انگیز اور اہم سفر ہے۔

☆ ولی نے دکن کی ادبی روایت کو شمال کی زبان اور فارسی روایت سے قریب تر کر کے ایک ایسا رنگ پیدا کیا جو سارے ہندوستان کے لیے قابلِ تقلید بن گیا۔

☆ ولی سے پہلے شمالی ہند کے اہل علم، اردو کو بول چال کی زبان کے طور پر تو استعمال کرتے تھے لیکن شعر و ادب کے لیے فارسی ہی کو ترجیح دیتے تھے، کبھی کبھی اردو میں بھی شعر موزوں کر لیا کرتے تھے۔

☆ قائم چاند پوری کے بیان کے مطابق ولی نے 1700ء میں دلی کا سفر کیا تھا اور وہاں ادبی محفلوں میں شرکت کی اور اپنا کلام سنایا۔

☆ کلیاتِ ولی میں تقریباً تمام اصناف سخن پر مشتمل کلام ملتا ہے لیکن جس صنف نے انھیں شہرت عام و بقائے دوام بخشی وہ غزل ہے۔ کلیات میں غزل ہی کا حصہ زیادہ بھی ہے اور وقیع بھی۔

☆ ولی کے کلام میں بلا کی رنگینی اور دل کشی پائی جاتی ہے اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی بیان کرتے ہیں اس کا براہِ راست تعلق ان کے جذبات واحساسات اور تجربات سے ہوتا ہے۔

☆ ولی نے پیش روشعرا سے حاصل کردہ روایات میں اپنے علم وفضل سے کسب واکتساب کر کے وہ سب کچھ شامل کر دیا جس سے ان کی شاعری اور ان کی آواز منفرد رنگ وآہنگ اختیار کر گئی۔

☆ ولی نے غزل کے امکانات کا وسیع راستہ آنے والے شعرا کے سامنے کھول دیا اور ولی کی غزل کے رجحانات اردو غزل کے بنیادی رجحانات بن گئے۔

12.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
سوں	:	سے
کوں	:	کو
مہر	:	مہربانی، لطف
دائم	:	ہمیشہ
مان	:	عزت
جھانجھر	:	پائل، پیر کا زیور
فدا	:	قربان
ٹک	:	ذرا، تھوڑا
نیہہ	:	محبت
تشنہ	:	پیاسا
گل رو	:	پھول جیسا چہرا
ہم مشرب	:	ایک عقیدہ رکھنے والے

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

12.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ولی کا پورا نام کیا تھا؟

2۔ ولی کی پیدائش کہاں ہوئی؟

3۔ ولی نے کس مدرسے میں تعلیم حاصل کی؟

4۔ قائم چاند پوری کے مطابق ولی نے دہلی کا سفر کب کیا؟

5۔ مصحفی کے مطابق ولی کا دیوان دہلی کب پہنچا؟

6۔ ولی نے دہلی کا سفر کس کے ساتھ کیا؟

7۔ ولی کے والد کا کیا نام تھا؟

8۔ ولی کا انتقال کب ہوا؟

9۔ ''کلیات ولی'' کو کس نے مرتب کیا؟

10۔ ''مطالعۂ ولی'' کس کی تصنیف ہے؟

12.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ولی کی زندگی کے حالات تحریر کیجیے۔

2۔ ولی کے سفر دہلی سے شمالی ہند کی ادبی فضا میں کیا تبدیلی ہوئی؟ وضاحت کیجیے۔

3۔ ولی کے تصور عشق کو بیان کیجیے۔

4۔ ولی کی تصوفانہ شاعری پر اظہار خیال کیجیے۔

5۔ غزل ''تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا'' کے کسی دو اشعار کی تشریح کیجیے۔

12.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ولی کی شاعری کی خصوصیات مثالوں کے ساتھ تحریر کیجیے۔

2۔ ولی کی غزل گوئی کو بیان کیجیے۔

3۔ غزل ''وو صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ'' کی تشریح کیجیے۔

12.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	کلیات ولی	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
2۔	مطالعۂ ولی	ڈاکٹر شارب ردولوی
3۔	لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
4۔	تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر جمیل جالبی
5۔	تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین

اکائی 13: سراج اورنگ آبادی کی غزل گوئی

(شاعر کا تعارف)

اکائی کے اجزا

13.0		تمہید
13.1		مقاصد
13.2		سراج کا تعارف
13.3		غزل گوئی کی خصوصیات
	13.3.1	پیکر تراشی
	13.3.2	احساس جمال اور حسن پرستی
13.4		شامل نصاب غزل کی تفہیم
13.5		اکتسابی نتائج
13.6		کلیدی الفاظ
13.7		نمونہ امتحانی سوالات
	13.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	13.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	13.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
13.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

سراج اورنگ آبادی دکنی غزل کے ایک اہم نمائندہ شاعر ہیں اور ولیؔ کے بعد اور میرؔ و سوداؔ کے عہد سے قبل کی درمیانی کڑی ہیں۔ اگرچہ سراج کی شاعری ایک مختصر عرصے پر محیط ہے تاہم وہ اپنے عہد کے بڑے نامور شاعر ہیں۔ سراجؔ نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل اور مثنوی میں انھیں لازوال شہرت نصیب ہوئی۔ دکن کی ریاستوں کے زوال کے بعد جہاں قدیم اردو شاعری کی نشو و نما ہوئی، اورنگ آباد کی سرزمین کو علمی و ادبی مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ سراج کی شاعری کا وہی زمانہ تھا جب ان کے پیش رو اور ہم وطن ولیؔ کی شاعری کی گونج دکن سے دہلی تک پہنچ چکی تھی اور اردو شاعری میں ایک نئے رنگ کا آغاز ہو رہا تھا۔

قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے ساتھ دکن کے غزل گوشاعروں کی تثلیث سراج اورنگ آبادی سے تکمیل کو پہنچتی ہے۔ سراج نے بھی شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر کے اپنے فن کے جوہر دکھائے، لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں ان کی شناخت غزل کے حوالے سے زیادہ مشہور ہوئی۔ سراج کا مزاج عاشقانہ تھا، وہ حسن کے شیدائی تھے اور اپنی شاعری کو محبوب کے جمالیاتی تصور کے جلوؤں کا آئینہ بناتے ہیں۔ سراج نے نوجوانی میں ہی صوفیائے کرام کی صحبت اختیار کر لی تھی جس کی بنا پر دنیا سے بیزاری کا رجحان ذہن و دل میں مستحکم ہوتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ وہ تصوف کے رنگ میں اس قدر غرق ہو گئے کہ دنیاوی زندگی کا انہیں کچھ ہوش نہیں رہا۔ اکثر ان پر مجذوبانہ کیفیت طاری ہو جاتی اور اس کیفیت کا اثر طویل عرصے تک جاری رہتا۔ اس عرصے میں وہ وجد کی کیفیات سے دوچار ہوتے اور پھر تواتر کے ساتھ متصوفانہ کلام وجود میں آنے لگتا، لیکن عالم بے خودی میں کہا ہوا ان کا کلام محفوظ نہیں رہ سکا۔ فارسی زبان میں بھی سراج نے اچھے خاصے اشعار کہے تھے لیکن بدقسمتی سے بہت کم محفوظ رہ سکے۔

دکنی غزل کا نمایاں وصف سراپا نگاری ہے۔ فارسی اور ہندی شاعری کے ملے جلے اثرات دکنی غزل میں پیش کی گئی پیکر تراشی میں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ سراج اورنگ آبادی نے بھی اپنے ہم عصر ولی کی طرح اپنی غزل میں مجازی محبوب کے خدوخال کو پیکر تراشی سے ابھار کر سراپا نگاری کی روایت کو مزید مستحکم کیا۔ دکنی شاعری کا محبوب اپنے تمام تر ارضی حوالوں کے ساتھ دکنی غزل میں موجود ہے، جس کی لفظی تصویریں سراج کی پیکر تراشی کا خاص حصہ ہیں۔ سراج صاحبِ ذوق اور جمال پرست انسان تھے اور جمال پرستی نے ان کی شاعری میں سوز و گداز پیدا کر دیا تھا اور یہی جمال پرستی ان کی شاعری کا محرک ہے۔ ان کے یہاں جو اندازِ عشق ہے وہ صوفیاء کے طورِ عشق سے مشابہ ہے مگر ان کا عشق قطعی طور پر ارضی اور تجسیمی ہے۔ سراج کا کلام ولی دکنی کی طرح ابہام اور ذومعانی الفاظ سے پاک ہے۔ سراج کا بیان سیدھا سادہ اور سلیس ہے۔ اکثر غزلوں میں حسن وعشق کے کرشمے موجود ہیں وہیں بعض اشعار میں توحید و معرفت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ غرض کہ سراج کا کلام ولی کی شاعری کی توسیع ہے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ سراج اورنگ آبادی کے عہد پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ سراج اورنگ آبادی کے سوانحی کوائف بیان سکیں۔
- ☆ سراج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کا تعارف کرا سکیں۔
- ☆ سراج اورنگ آبادی کی شاعری میں سراپا نگاری کی نشاندہی کر سکیں۔
- ☆ سراج اورنگ آبادی کی صوفیانہ شاعری پر روشنی ڈال سکیں۔

13.2 سراج اورنگ آبادی کا تعارف

سراج اورنگ آبادی کا اصل نام سید سراج الدین تھا۔ یہ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اس لیے سراج اورنگ آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ بروز پیر 13/صفر 1127ھ مطابق 11/مارچ 1712ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید درویش تھا۔ ان کا خاندان اورنگ آباد کے معزز خانوادے سے تعلق رکھتا تھا۔ سراج نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ یہ ابتدا سے ہی صوفی منش آدمی تھے۔ شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے مرید بھی تھے۔ گوشہ نشین اور پاکیزہ دل کے مالک سراج اورنگ آبادی ہفتہ میں ایک محفل سماع بھی منعقد کرتے تھے جس میں قوال ان کی غزلیں

سنایا کرتے تھے۔ سراج نے سید حمزہ دکنی سے تلمذ حاصل کیا۔ اٹھارہویں صدی کے سبھی تذکرہ نگاروں کے یہاں ان کا ذکر ملتا ہے لیکن ان کے مفصل حالات زندگی دستیاب نہیں ہیں۔ بچپن سے ہی شاعری کا میلان تھا اور بہت پُرگو شاعر تھے یہی وجہ ہے کہ صرف چار سال کی عرصہ میں ضخیم دیوان مرتب کیا، جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ابتدا سے ہی ان کا مزاج عاشقانہ تھا اور عنفوان شباب کو پہنچتے پہنچتے ان پر بے خودی کا دورہ پڑنے لگا تھا، جس کے سبب وہ گھر سے نکل کر ویرانوں کی خاک چھاننے لگے۔ اس دوران انہوں نے خلد آباد کے ایک بزرگ برہان الدین غریب کے مزار پر بھی قیام کیا۔ ان پر یہ کیفیت تقریباً سات برس تک طاری رہی۔ پھر ان کے والد اسی مجذوبی کیفیت میں سراج کو گھر لے آئے اور زنجیروں میں مقید کر دیا۔ مستی کی اس کیفیت میں سراج نے فارسی زبان میں لاتعداد اشعار کہے جو ضائع ہو گئے۔ سراج اورنگ آبادی نے کچھ عرصہ فن سپہ گری بھی کی مگر ان جیسا قلندر روزگار کا پابند نہیں رہ سکا۔ اس لیے انہوں نے ملازمت ترک کر دی اور صاحب باطن بزرگوں کی صحبت میں رہنے لگے۔ یہ عہد ان کے شعری اظہار کا عہد تھا، اس عہد میں وہ زیادہ تر شعر و سخن کی محفلوں میں رہا کرتے اور شعر کہا کرتے لیکن شاہ عبدالرحمٰن چشتی کی فرمائش پر شاعری ترک کر دی۔ پھر بھی ان کی شاعری' دیگر ہم عصر شعراء کے مقابلے زیادہ زود فہم اور سلیس ہے۔ ان کی شاعری پر دکنی اثرات کم ہیں اور فارسی کی چھاپ گہری ہے۔ سراج اورنگ آبادی نے غزلیات کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، رباعی اور مخمس بھی لکھے۔ انہوں نے ایک طویل مثنوی ''بوستان خیال'' کے نام سے لکھی، جو ان کی خودنوشت روداد عشق ہے اس میں ایک ہندولڑکے سے اپنی محبت کا حال بیان کیا ہے۔ سراج نے فارسی شعراء کا ایک انتخاب بعنوان ''منتخب دیوانہا'' بھی ترتیب دیا ان کے بہت سے فارسی خطوط بھی موجود ہیں جو انہوں نے اپنے دوستوں کے نام لکھے تھے۔ ریختہ میں سراج اورنگ آبادی نے پانچ ہزار اشعار مشتمل دیوان بھی مرتب کیا۔ سراج قدیم دکنی شعراء کی آخری کڑی کے طور پر جانے جاتے ہیں کیونکہ سراج کے بعد قدیم دکنی شعراء میں کوئی قابل قدر شاعر نہیں گزرا۔ سراج کا زمانہ قدیم اردو شعراء کا آخری اور جدید اردو کا ابتدائی زمانہ تھا۔ یہ وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں قدیم اور جدید اردو شاعری کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

سراج اورنگ آبادی کا انتقال 52 سال کی عمر میں بروز جمعہ 4 / شوال 1177ھ مطابق 6 / اپریل 1764ء کو اورنگ آباد میں ہوا۔

13.3 غزل گوئی کی خصوصیات

سراج اورنگ آبادی نے اپنی غزلیہ شاعری ولی دکنی کی پیروی میں شروع کی۔ ولی دکنی نے اپنی غزلوں کے حسن کا جو معیار متعین کیا تھا، سراج نے اسی معیار کو منتخب کیا اور اس کے تحت شاعری کی۔ جہاں انہوں نے ولی دکنی کے معیارات کا اثر قبول کیا تو مختلف اشعار میں اس کا اعتراف بھی کیا اور ولی کی اہمیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ سراج نے ولی کا تتبع کیا تھا یہی وجہ ہے کہ سراج اورنگ آبادی کی زبان بھی ولی دکنی کی طرح صاف ستھری ہے، اور دکنی اثرات کی آمیزش کے بجائے اس زبان میں شمالی ہند کے خاطر خواہ اثرات ملتے ہیں۔ سراج کی غزلوں میں جہاں ایک طرف سچے عاشق کے حقیقی جذبات ظاہر ہوتے ہیں، وہیں حیات و کائنات کے فلسفے بھی اپنی اہمیت کا احساس کراتے ہیں۔ احساس کی واقعیت اور خیالات کی جدت، سراج کی غزلوں کو انفرادی حسن عطا کرتی ہے۔ ان کی زندگی مختلف تجربات سے دوچار رہی۔ دھوپ چھاؤں کا سلسلہ جاری رہا۔ حالات نے قدم قدم پر آزمائشوں میں مبتلا رکھا۔ ان سب کا اثر ان کی غزلوں میں واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ولی کی طرح سراج نے بھی کہیں تو فارسی تراکیب اور لفظیات کے سہارے اپنی غزلوں کو بامعنی بنایا ہے اور کہیں دکنی زبان کی آمیزش کے ذریعے سرزمین دکن سے اپنی حقیقی وابستگی کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ سراج کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سب جگت ڈھونڈ پھرا پیو کو نہ پایا ہرگز
دل کے گوشے میں مکاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

دھوپ میں غم کی عبث دل کو جلایا افسوس
پیو کے سائے میں اماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

چلی سمتِ غیب سے وہ ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

مدت سے گم ہوا دلِ بے گانۂ سراج
شاید کہ جا لگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

نہیں ہے تاب مجھے سامنے ترے جاناں
کہاں سراج کہاں، آفتابِ عالم تاب

سراج اورنگ آبادی کے مذکورہ بالا اشعار کے ذریعے غزلوں کا اصل رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ عشق اور تصوف کا خوب صورت امتزاج ان اشعار میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان اشعار میں ایک طرف عاشق کی بےقراری جھلکتی ہے تو دوسری طرف مزاج کی سرمستی بھی اُجاگر ہوتی ہے۔ غزلوں کے علاوہ سراؔج اپنی مشہور مثنوی 'بوستانِ خیال' کی بنا پر بھی شاعری کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ اس مثنوی میں تقریباً بارہ سو اشعار ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ تمام اشعار سراؔج نے صرف دو دن میں کہے تھے۔ سراج کی غزلیں فنی پختگی کا بےمثال نمونہ ہیں۔ ان کا اچھا خاصا کلام ضائع ہوگیا ہے، لیکن جتنا کلام بھی محفوظ رہ گیا ہے، وہ سراؔج کو ایک عظیم المرتبت شاعر تسلیم کرانے کے لیے کافی ہے۔

13.3.1 پیکر تراشی

سراج اورنگ آبادی ایک وسیع المطالعہ شاعر ہیں، ہندی شاعری کی نرماہٹ اور سادگی' سراج اورنگ آبادی کی جذباتیت کو تزکیۂ نفس کے عمل سے گزار کر دل کا شاعر بنا دیتی ہے، جبکہ فارسی شاعری کی روایات ان کے ذہنی تفکر کے ساتھ ہم آمیز ہو کر ان کی شاعری کو خالصتاً دماغ کی شاعری بنا دیتی ہیں۔ گویا سراج اورنگ آبادی کی غزل میں شامل فنی اور فکری حوالے سراج کی غزل کو قوت اور توانائی بخش دیتے ہیں، یہی قوت ان کی شاعری کے رنگوں میں ڈھل کر ابدیت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ سراج کی شاعری میں سب سے اہم شے جو شاعرانہ محرک کے طور پر سامنے آتی ہے وہ عشق اور اس سے پیدا شدہ فطری کیفیات ہیں، جنھوں نے سراج اورنگ آبادی کو سراپا عشق بنا دیا تھا۔ عشق کی برتری نہ صرف ان کے کلام میں دیکھنے کو ملتی ہے بلکہ ان کی شخصیت پر عشق اتنا چھایا ہوا تھا کہ ان کی شخصیت میں لہو کی طرح شامل ہوگیا تھا۔ عشق کی کیفیتوں کو چمکانے میں فارسی شاعری کے اثرات بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں، سراج اورنگ آبادی کے یہاں عشق کی دونوں صورتیں نئی دنیاؤں کے انکشاف یا دریافت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ شاعر کے لیے عشق آئینے کی مانند بن جاتا ہے، جس میں کائنات اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔

بیان عشق کی بے ہودہ گفتگو مت کر
نہیں سراج یہ قصہ تمام ہونے کا

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا، نہ پری رہی
نہ تو توں رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

سراج سراپا عشق تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ ہستی محبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کے نزدیک عشق برق جاں سوز ہے لیکن سوز لذت سے خالی نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس سودے میں افسوس نہ کرنا چاہیے بلکہ اس برق جگر سوز کی روشنی میں حقیقت عالم کا نظارہ کرنا چاہیے۔

سراج کے عشقیہ جذبات میں تڑپ اور سوز نے ان کی تمثال سازی پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ عشق کی کیفیات اور ان کی گہری پرتوں کی مظہر وہ تمثالیں ہیں جن کی شدت اور اثر انگیزی میں کمی واقع نہیں ہوئی، ان کی حسیاتی کشش سوز اور ساز دونوں کیفیتوں کو خود میں جذب کیے ہوئے ہے۔ ایسی ہی جیتی جاگتی حسیات سے بھرپور اشعار ملاحظہ کیجیے:

چلی سمت غیب سے کیا ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

وہ جب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

نظر تغافل یار کا گلہ کس زبان سے بیان کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

سراج کی شاعری بیک وقت عشق حقیقی اور عشق مجازی کا آمیزہ معلوم ہوتی ہے۔ شعر گوئی کی طاقت جذبہ عشق کی رہین منت ہے۔ ان کی شاعری فطری شاعری کی شمع کو اپنے خون جگر سے روشن کرتی ہے جب تک عشق کا الاؤ روشن رہتا ہے شعر گوئی کا عمل فطری طور پر جاری رہتا ہے۔ گویا سراج اورنگ آبادی کا عشق محض خارجی صورتوں سے نمو نہیں پاتا، داخل کی روشنی اور آہنگ اسے زندہ رکھتا ہے۔ سراج کی شاعری سراج کے جذبۂ عشق کی کہانی ہے، جو عشق کے تہذیبی عمل کو پیش کرتی ہے۔

سراج کی غزل کا عاشق اردو شاعری کے روایتی عاشق سے، چنداں مختلف نہیں ہے، محبوب کی بے اعتنائی کا شکار یہ عاشق ہمہ وقت درد اور سوز کی تصویر بنا نظر آتا ہے۔ عشق میں چوب غم کی طرح مسلسل سلگنے کی کیفیت نے سراج کی غزل میں نشاطیہ عنصر کو ابھرنے نہیں دیا۔ محبوب کے قرب کی سرشاری جس طرح اس کے ہم عصروں کی غزل کو نشاطیہ آہنگ عطا کرتی ہے۔ وہ آہنگ سراج کی غزل میں تقریباً مفقود ہے۔ اس صورتحال کے پیش نظر سراج کی شاعری کو ''آہ'' اور ولی کی شاعری کو ''واہ'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک سرایت کرنے والی خصوصیت جسے وہ خود سوز سے تعبیر کرتے ہیں، بے حد نمایاں ہے۔ ''آہ'' کے بیان کی کیفیتیں سراج کے ہاں ان تخلیقی تمثالوں کی صورت میں سامنے آتی ہے، جس میں اردو شاعری کے روایتی کردار عاشق اور معشوق کی صورت میں آئے ہیں۔ ہجر اور جدائی کی گھنی کشمکش اور محبوب کی بے نیازی کا نہ بدلنے والا موسم، سراج کی تمثال کاری میں اپنے داخلی اور خارجی حوالوں کے ساتھ مل کر کچھ اس طرح کے بصری پیکر ابھارتا ہے:

مسکرا کر موڑ لیتے ہیں بھویں
خوب ادا کا حق ادا کرتے ہو تم

دامن میں اشک چشم مری دیکھ کر کہا
اس دو ندی کا خوب ہے سنگم ہوا کرے

گھٹا غم، آہ، بجلی، اشک پانی
برستا ہے عجب برسات تجھ بن

اس کے دامن کو اگر ہات لگادیں عاشق
تند ہو گرد کی مانند جھٹکتا جاوے

سراج نے محبوب کے جسمانی سراپا کی جو تصویریں کھینچی ہیں اس میں کہیں کہیں امرد پرستی کے رجحان کے نتیجے میں ابھرنے والی کیفیات کی بھی واضح عکاسی ملتی ہے، جسے فارسی روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ سراپا نگاری کے خارجی حوالوں نے سراج کے مندرجہ ذیل پیکروں میں جگہ پائی ہے جو حسی اعتبار سے بصری نوعیت کے حامل ہیں۔

سب دیکھتے تھے چاند کوں میں یار کی طرف
اس کی بھنواں ادھر تھیں ادھر کوں ہلال تھا

آرزو ہے کہ زلف کوں کھولے
میں نے کالی رین نہیں دیکھا

غنچۂ گل کوں دیکھ گلشن میں
گرتوں پیوں کا دہن نہیں دیکھا

مہندی کا رنگ نہیں ہے کف پائے یار پر
خونِ جگر ہوا ہے مگر پائمال دوست

ہے کیا کتاب مطلع انوار، رخ ترا
سورج کوں جس کا یک ورق زرد بولیے

سراج اورنگ آبادی کے اسلوب کی سادگی اور سلاست نے غزل کو حسن اور لطافت کی روح سے آشنا کیا۔ سراج کے یہاں استعمال ہونے والا ڈکشن سلیس اور عام فہم ہے حتیٰ کہ اس کی تشبیہات اور استعارے بھی سادگی، بے ساختگی اور برجستگی کا عمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ سراج کی تشبیہات سازی نے سراپا نگاری کی روایت میں توسیع اور اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اکثر و بیشتر محبوب کے ظاہری حسن اور جسمانی خدوخال کے کسی نہ کسی رخ کو پیکروں کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان پیکروں سے سراج کے جمالیاتی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ سراج نے خالصتاً ہندوستانی ہونے کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کی تلمیحات کا دائرہ فارسی اور عربی ادبیات تک محدود نہیں بلکہ یہ تلمیحات ہندو صنمیات اور دیو مالائی سے ماخوذ ہیں جو ہندو معاشرے اور تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔ سراج کی تشبیہات بصری تمثالیں تخلیق کرتی ہیں عشق کی رو شاعر کے تخیل اور مشاہدے کو جس طرف موڑتی ہیں ان کے پیکر اسی رخ پر اپنا جلوہ پیش کرنے لگتے ہیں۔

نین راون ہیں ارجن بال پلکیں بھوں دھنک بھم کی
ہمارے دل کی دکھ نگری کے راجہ رام چندر ہو

سراج نے ایک پوری غزل میں لفظ 'موہن' کا استعمال بہت ہی خوبصورتی سے کیا ہے:

تمہاری زلف کا ہر تار موہن
ہوا میرے گلے کا ہار موہن

تصور کر ترا حسنِ عرق ناک
مری آنکھیں ہیں گوہر بار موہن

برہ کا جان کندن ہے نپٹ سخت
دکھا اس وقت پر دیدار موہن

گل عارض کوں ترے یاد کرکر
ہوا ہے دل مرا گلزار موہن

سراج آتش میں ہے تیرے فراقوں
بجھا جا مہر سیں یک بار موہن

سراج ہندوستانی تہذیب کی بہترین قدروں سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی انہیں موقع ملا انھوں نے ہندی روایت کو اجاگر کیا۔ ولی اور سراج سے پہلے بھی دکن کے شعرا میں غزل مقبول صنف رہی ہے۔ اکثر شعراء کے یہاں غزل جسمانی لذت اور ذکر عارض وگیسوئے محبوب سے آگے نہیں بڑھی۔ ولی اور سراج کے یہاں غزل میں زبان اور فکر دونوں لحاظ سے تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

سراج اورنگ آبادی نے اپنے جمالیاتی ذوق اور احساسِ درد کو بھی انتہائی سلیس اور آسان لب ولہجہ اور تمثالوں میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے اس لیے ان کی مستعمل تشبیہات کی نوعیت سہل اور قابل فہم ہے۔ کہیں کہیں فلسفیانہ جھلک بھی نظر آتی ہے۔ زندگی کی بے ثباتی کو جلد ڈھل جانے والی عمر سے تشبیہ دے کر دنیا کے فانی ہونے کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

آبِ رواں ہے حاصل عمر شتاب رو
دہر فنا میں نقش نہیں ہے ثبات کا

سراج اورنگ آبادی کی سادہ اور دلکش تشبیہات میں حواس خمسہ یعنی قوت سامعہ، قوت شامہ، قوت لامسہ، قوت ذائقہ اور قوت باصرہ کی شمولیت بھی دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔

پیو کا جمال دیکھ ہوا چاک چاک دل
جیوں کہ کتاں پہ عکس پڑے نور ماہ کا

رخسار پر صنم کے جو خالِ سیاہ ہے
وہ مردمک ہے حلقۂ گیسو کی چشم کا

انتظار میں تری اے سادہ رو
آرہی ہے چشم حیراں کی مثال

بجا ہے دل میرا گر ہوئے شرابی
نشہ میں ہیں تری آنکھیں گلابی

ہے ترے قد پہ زلف خم در خم
نخل صندل پہ ناگ جیوں لٹکے

رخسار یار حلقۂ کاکل میں ہے عیاں
یا چاند ہے سراج اماوس کی رات کا

یا برگ گل پہ سبزہ سیراب ہے عیاں
یہ لعل لب پہ خط، زمرد نگار ہے

سراج کے پیکران کے اسلوبیات کا ایک اہم اور خاص حصہ ہیں، جس میں سراج نے برجستہ لفظیات کا استعمال کر کے اپنی امیجری کو زیادہ حقیقی اور محسوساتی بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اس کوشش میں سراج اپنے ہم عصروں میں کسی طور سے پیچھے نہیں۔ ان کی لفظیات، اسالیب، تشبیہات اور تلمیحات میں وسعت ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سماعی اور ذہنی نقشوں کے مقابلے میں حقیقی مشاہدے یا محسوسات کے تاثرات پیش کرنے پر قادر ہیں۔

13.3.2 احساس جمال اور حسن پرستی:

سراج فطرتاً حسن پسند نظر رکھتے تھے۔ ان کی حسن پسند نظر اپنے اردگرد کی اشیاء میں، ملنے جلنے والوں میں، بول چال میں، خیالات میں غرض ہر جگہ حسن کی متلاشی رہتی ہے۔ یہی رویہ اپنی اپنی حد کے اندر ہر ذی شعور انسان کا ہوتا ہے۔ سراج نہ صرف حسن پسند نظر کے مالک تھے بلکہ وہ صاحب دل اور صاحب باطن بھی تھے۔ حسن ظاہر کی دلکشیاں انہیں کبھی اتنا محو نہ کر سکیں کہ وہ حقیقت سے بے خبر ہو گئے ہوں۔ سراج کو عشق کا ادراک حاصل ہو چکا تھا انہوں نے حسن ظاہر کے نقاب کو ہٹا کر حسن باطن کا مشاہدہ کیا۔ ان کا حسن سے ظاہری لگاؤ فطری اور حقیقت پسندانہ تھا۔ عشق کی بدولت جو وارفتگی ان میں پیدا ہو گئی تھی دراصل وہی عرفان عشق کی منزل تھی۔ ان کے پورے کردار میں عشق کی منزل جلوہ گر نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ڈھائی سو سال کے بعد بھی ان کی عشقیہ شاعری زندگی کی حرارت سے بھرپور نظر آتی ہے۔ سراج کی شاعری دردِ دل کا بیان ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں براہِ راست تخاطب کا طرز اختیار کیا۔ وہ اپنی غزلوں میں معشوق سے صرف دردِ دل سوز جگر ہی نہیں بیان کرتے بلکہ اکثر بات کرتے نظر آتے ہیں۔

اے جانِ سراج ایک غزل درد کی سن جا
مجموعۂ احوال ہے دیوان ہمارا

اے جانِ سراج آج دکھا جلوۂ دیدار
ہے وعدۂ فردا مجھے، فردائے قیامت

ہوا ہے شام جدائی میں بے قرار سراج
مثال صبح توں اپنی جھلک دکھا، جاناں

سراج کی غزلیں ان کے عشقیہ جذبات کی ترجمان ہیں۔ ان کا محبوب ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔ اس کے عشق میں وہ جل رہے ہیں اور اس سے براہ راست ابلاغ کا نتیجہ ہی ان کی شاعری کا پیش خیمہ ہے۔ ان کے یہاں جذبات کی فراوانی اور شدت ہے اور یہی شدت عشق سراج کی شاعری کو ایک ایسا رنگ و بوبخشتی ہے جو سراج کی شاعری کی منفرد آواز بن جاتی ہے اور ڈھائی سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی تازہ دم اور زندہ آواز ہے۔ سراج کی غزلوں میں مختلف عشقیہ کیفیات میں تمیز کرنے اور انہیں الفاظ کی گرفت میں لانے کی زبردست صلاحیت ہے۔ عشق نے ان کے اندر ایک ایسا آہنگ اور احساسِ موسیقی پیدا کر دیا تھا کہ ان کے الفاظ دیگر شاعروں سے زیادہ شگفتہ اور تروتازہ نظر آتے ہیں۔ سراج کے عشقیہ جذبات میں ایک گرمی اور تڑپا دینے والی کیفیت بھی نمایاں ہے۔ سراج کے نزدیک محبت' زندگی کی تکمیل ہے۔ وہ دکن کے آخری شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو تربیت یافتہ عشقیہ جذبات کے علاوہ وسعتِ زبان و بیان، بلند خیالی اور پاکیز گی عطا کی۔ ان کے یہاں وہ طرب انگیز رنگ و آہنگ نہیں جو ولی کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ولی مطرب عشق ہیں تو سراج نوحہ خوانِ عشق۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ولی نے جمالِ عشق دیکھا تھا اور سراج نے جلالِ عشق اور ولی اس جمال کے تماشائی ہیں مگر سراج اسی جمال یار سے خود میں ایک آگ روشن کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں اسی جمالیاتی فضا سے باہر نہیں نکل سکے۔ ان کی غزلوں میں خالص ادبی اور جدید زبان استعمال کی گئی ہے۔ ان کی غزلوں میں فارسی شعراء کے اثرات بھی نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ سراج نے فارسی زبان و بیان کا پوری طرح التزام اپنے اردو کلام میں کیا ہے۔ اس کے باوجود ہندوستانیت اور ہندوی عشقیہ روایت ان کے اردو کلام کی فضا پر چھائی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنی غزل میں محبوب کے لیے پیا، پری، موہن، سجن اور سلونا وغیرہ الفاظ کا بے دریغ استعمال کیا ہے۔

دل تجھ پری کی آگ میں سیماب کی مثال
آخر کوں بے قرار ہوا کیا بجا ہوا

کہاں ہے گلبدن موہن پیارا
کہ جیوں بلبل ہے نالاں دل ہمارا

آیا پیا، شراب کا پیالا پیا ہوا
دل کے دیے کی جوت سیں کاجل دیا ہوا

دل میرا پیو کے باج ہے بے کل
بیشتر کل سیں آج ہے بے کل

دکن، گولکنڈہ اور بیجاپور میں شاعری کی روایات میں عورت کو محبوب کے روپ پیش کرنے کی روایت عام رہی ہے۔ عالمگیر کی فتح دکن کے بعد سے فارسی کے رواج نے گو کہ شعراء کے تصورات کو بڑی حد تک تبدیل کر دیا اور ولی اور سراج جو خالص عشقیہ غزلیں کہنے والے شعراء تھے، انہوں نے امرد پرستی کے رجحان کو باقاعدہ غزل میں پیش کیا مگر اکثر و بیشتر غزلیں اپنے انداز بیان میں اتنا لوچ رکھتی ہیں کہ ان کو عورت کے جذبات اور احساسات کا آئینہ دار بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ سراج کے یہاں ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں جن سے نسوانی حسن کے تصور کی وضاحت ہوتی ہے۔

بساطِ عشق بازی میں مرا دل
متاع صبر ونقد و ہوش ہارا

سنا ہے جب سیں ترے حسن کا شور
لیا زاہد نے مسجد کا کنارا

شب ہجراں میں اس مہتاب رو کی
ہر ایک آنسو ہوا روشن ستارا

غزل کے ان اشعار میں ہندوی اور فارسی دونوں کے عشقیہ رجحانات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ غزل سراج نے اپنے محبوب کے لیے کہی ہے اور اس سے ان کے جذبات واحساسات ہویدا ہیں۔ لہٰذا غزل میں اتنی وسعت ہے کہ وہ کسی کے بھی جذبات کی زبان بن سکتی ہے۔ سراج کے یہاں فارسی رجحان بھی ملتا ہے یعنی حسن وخوبصورتی سے متعلق جتنی بھی تشبیہات ہیں وہ سراج کی غزلوں میں پائی جاتی ہیں۔

ہے بسمل شمشیر نگۂ ذوق سیں اپنے
دل حشر میں کس منہ ستی فریاد کرے گا

تشنۂ مرگ کوں ہے آب صراحی دم تیغ
بسمل ابروئے خم دار ہوں، کن کا، ان کا

سراج کی غزل میں محبوب کا واضح تصور مجاز ہی کے حوالے سے ملتا ہے۔ تاہم کہیں کہیں وہ تصوف کے حوالے سے محبوب حقیقی کو بھی پیش کرتے ہیں لیکن اس کا مرکز نگاہ محبوب مجازی ہی ہے جو کہ ایک مکمل عورت ہے۔ جس کے عارض گل رنگ، حلقۂ کاکل، جلوۂ تاباں، زلف گرہ دار، طرزِ تغافل اور چشم نرگس کا ذکر ان کی غزلوں میں ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں محبوب کی تصویر کاری بڑے موثر انداز میں کی گئی ہے۔ یہاں محبوب کا محض ذکر نہیں ملتا بلکہ وہ اپنے پوری رعنائی اور جوبن کے ساتھ بن سنور کر سامنے آتا ہے۔ اس کے خدوخال کا دلفریب انداز سراج کی غزل میں دیکھیے تو چشم، دہن، چہرہ، گیسو، لب اور خال کی کس طرح عکاسی کی گئی ہے۔

ڈورے نہیں ہیں سرخ تیری چشم مست میں
شاید چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا

ترے دہن میں مسی سے مجھے ہوا معلوم
نماز شام کا ہے وقت اب نہایت تنگ

اس پھول سے چہرے کوں جو کوئی یاد کرے گا
ہر آن میں سو سو چمن ایجاد کرے گا

سراج اورنگ آبادی کے کلام میں سراپا نگاری کے ذیل میں زلف، ابرو، پلک اور رخسار کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔

رشتے میں تیری زلف کے ہے جان ہمارا

بیچا نہیں سنبل کے اوپر مان ہمارا

اے شوخ کشش سیں ترے ابرو کی کماں کا
دل ہاتھ سیں جاتا ہے ہر ایک آن ہمارا

تجھ زلف کی شکن ہے مانندِ دام گویا
یا صبح پر ہماری آئی ہے شام گویا

سراج کی غزلوں میں عورت کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں اور سراج اس کے دیدار کے طالب دکھائی دیتے ہیں۔

ادائے دل فریب سرو قامت
قیامت ہے، قیامت ہے، قیامت ہے

مجلس میں اگر جانِ سراج آوے اداسوں
ہو شرم سوں پانی کی نمط شمع پگل کر

یار کوں بے حجاب دیکھا ہوں
میں سمجھتا ہوں خواب دیکھا ہوں

عورت کے حسن کے ساتھ ساتھ سراج نے اس کے لباس، سنگھار اور ان کے زیورات کا پرلطف بیان بھی بڑے دلنشیں انداز میں کیا ہے۔ اس حوالے سے دکنی تہذیب کی جھلک ان کی غزلوں میں دکھائی دیتی ہے۔

لباس بسنتی ترا دیکھ کر
مجھ آنکھوں کا آنسو گلالی ہوا

دیکھ کر دریا میں اس مہندی بھرے ہاتھوں کا عکس
خشک ہوجاتا ہے لوہو پنجۂ مرجان کا

کیا ہوں جاں سپاری اس صنم کے پان کھانے میں
کہ کھینچا دیدۂ آہو پہ خط سرمہ لگانے میں

کان میں ہے تیرے موتی آبدار
یا کسی عاشق کا آنسو بولناں

جب سیں گلے میں یار کے ہے نوبہار ہار
بے اختیار ہوکے میں کہتا ہوں، ہار ہار

آج کی رات میرا چاند نظر آیا ہے
چاندنی دور سی چٹکی ہے مرے آنگن میں

اس طرح کی بے شمار مثالیں سراج کی غزلوں میں بکھری پڑی ہیں۔ جہاں نہ صرف تغزل کا خوبصورت امتزاج سامنے آتا ہے بلکہ عشقیہ شاعری کے لطیف وجمیل جذبات کا اظہار بھی ملتا ہے۔سراج نے اپنے محبوب کومجازی حسن کا نمونہ کامل بنا کر پیش کیا ہے۔اس کی ہر ادا،اس کے حسن کے مظاہراور خدوخال سے ایسی تصویریں تراشی ہیں کہ دیکھنے والا اس محبوب پر فدا ہوجاتا ہے۔غرض دکنی غزل کی اہمیت سراج کی مرہون منت ہے۔ان کی آوازصدیاں گزرجانے کے بعدآج بھی تروتازہ ہے۔خاص طور پر ولی کے بعد ڈیڑھ سو سال تک اردوغزل کےان بتائے ہوئے راستے پر چلتی رہی۔ ان کی غزل میں تشبیہ، استعارہ، تلمیح ،حسن تعلیل ،تجاہل عارفانہ، مراۃ النظیر ،محاکات اور ایہام وغیرہ فنی اثر اور روانی میں اضافہ کرتے ہیں۔سراج نے اردوغزل میں مذکورہ بالاخصوصیات شامل کیں۔صنعت ایہام کوبھی انہوں نے جس سلیقے سے استعمال کیا بعد میں شمالی ہند کے شعراء کی پہلی نسل نے اس کا تتبع کیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ عشق کا جوچلن دہلی میں ابھر رہا تھا وہ پہلے ہی سے جوان ہوکر سراج کی شاعری میں موجود تھا۔اردوغزل گوشعراء نے سراج کی رہنمائی میں عورت کی سراپا نگاری کی بنیاد رکھی ،جس میں عورت کا تصور واضح طور پر ملتا ہے۔اس طرح سراج کی غزل کے رجحانات اردوغزل کے بنیادی رجحانات قرار پائے۔اس دور کی غزل کا غالب رجحان جمال پرستی ہے۔شعراء نے نسوانی حسن کے مختلف پیکر اپنی غزلوں میں نمایاں کیے۔

اردوشاعری میں سراج اورنگ آبادی کا مرتبہ نہایت بلند وبالا ہے۔ وہ میر ،سودا، درد، ولی وغیرہ کی صنف کے سخن ور ہیں۔شاعری سے ان کی طبیعت کوفطری لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ بہت کم عرصے میں انہوں نے ترقی کی منزلیں طے کر لیں۔اردوشاعری کومقبول عام بنانے میں سراج کا مقام ولی سے کم نہیں بلکہ انہیں ولی کا جانشین تسلیم کیا جانا چاہیے۔وہ خود جگہ جگہ ولی سے استفادے کا ذکر کرتے ہیں لیکن خودکوان کا مقابل ہرگز نہیں سمجھتے۔

13.4 شامل نصاب غزل کی تفہیم

غزل-1

جان و دل سیں میں گرفتار ہوں کن کا، ان کا
بندۂ بے زر و دینار ہوں کن کا، ان کا

صبر کے باغ کے منڈوے سے جھڑا ہو جیوں پھول
اب تو لاچار گلے ہار ہوں کن کا، ان کا

حوض کوثر کی نہیں چاہ زنخداں کی قسم
تشنۂ شربت دیدار ہوں کن کا، ان کا

لب ورخسار کے گلقند سیں لازم ہے علاج
دل کے آزار سیں بیمار ہوں کن کا، ان کا

مدتیں ہوئیں کہ ہوا خانۂ زنجیر خراب
بستۂ زلف گرہ دار ہوں کن کا، ان کا

تشنۂ مرگ کوں ہے آب صراحی دم تیغ
بسمل ابروئے خم دار ہوں کن کا، ان کا

ناحق اس سنگ دلی سیں مجھے دیتے ہیں شکست
میں تو آئینہ سرکار ہوں کن کا، ان کا
گلشن وصل میں رہتا ہوں غزل خوانِ فراق
عندلیبِ گل رخسار ہوں کن کا، ان کا
میں کہا، رحم پتنگوں پہ کر اے جان سراؔج
تب کہا شمع شب تار ہوں کن کا، ان کا

تشریح:

جان ودل سیں میں گرفتار ہوں کن کا، ان کا
بندۂ بے زر و دینار ہوں کن کا، ان کا

شاعر سوالیہ انداز میں پوچھتا ہے کہ میں جان ودل سے کس کا گرفتار ہوں، پھراس کا جواب بھی دیتا ہے کہ'ان کا'یعنی شاعر کو پتہ ہے کہ میں کس محبوب کے عشق میں گرفتار ہوں۔ یہاں صنعت تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا ہے۔شاعر نے دوسرے مصرعے میں بندۂ بے زرو دینار کی ترکیب استعمال کی ہے جس کا مطلب ہے ایسا غلام جس پر زر اور دینار (روپیہ) خرچ نہ کرنا پڑے۔یعنی مفت کا غلام یا بندہ بے دام۔ بندہ بے دام اسے کہتے ہیں جو کسی سے محبت کرنے کو دین وایمان سمجھے۔شاعر کہتا ہے کہ میں اپنے محبوب کا بندہ بے دام ہوں یعنی اس کی محبت میرا ایمان ہے۔

صبر کے باغ کے منڈوے سے جھڑا ہو جیوں پھول
اب تو لاچار گلے ہار ہوں کن کا، ان کا

بے چارہ عاشق اپنے محبوب کے وصال کے لیے انتظار کرتا ہے اور انتظار کی اذیت میں اسے صبر بھی کرنا پڑتا ہے، سراج کہتے ہیں کہ میں اس صبر کے باغ کے منڈوے (منڈھے) سے گرا ہوا پھول ہوں۔شاعر نے دوسرے مصرعے میں محاورے''گلے کا ہار ہونا'' سے استفادہ کیا ہے، جس کے معنٰی ہیں کسی کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ ہونا، نثار یا فدا ہونا، زبردستی گلے پڑنا۔شاعر کہتا ہے میں صبر کے باغ کے منڈوے سے ٹوٹا ہوا پھول ہوں۔یعنی اب صبر کا دامن چھوٹ گیا ہے اور مجبوراً میں کسی کے گلے کا ہار ہوگیا ہوں۔یعنی محبوب سے وابستہ ہوگیا ہوں۔ پھول کی رعایت سے ہار کا لفظ لایا گیا ہے۔

حوض کوثر کی نہیں چاہ زنخداں کی قسم
تشنۂ شربت دیدار ہوں کن کا، ان کا

سراج اورنگ آبادی عشق کی شدت میں گرفتار ہوکر اپنے دل کی پیاس بجھانے کے لیے حوض کوثر کے طلب گار نہیں ہیں بلکہ معشوق کے زنخداں کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ میں محبوب کے دیدار کا پیاسا ہوں (ٹھڈی کے درمیان جو گڑھا ہوتا ہے اس کو شاعر چاہ زنخداں یعنی کنوئیں سے تشبیہ دیتے ہیں۔شاعری میں زنخداں کی گہرائی کنویں سے مشابہ قرار دے کر اس کی خوبصورتی کو سراہا جاتا رہا ہے) سراج بھی حوض کوثر کے مقابلے میں اس کنوئیں سے سیراب ہونے کی طلب رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں زنخداں کی قسم مجھے حوض کوثر کی چاہ نہیں (لفظ'چاہ' میں ایہام ہے چاہ بمعنی کنواں اور چاہ بمعنی چاہت) میں تو شربتِ دیدار کا پیاسا ہوں۔کس کے شربت دیدار کا؟ ظاہر ہے محبوب کے دیدار کا۔

لب ورخسار کے گلقند سیں لازم ہے علاج
دل کے آزار سیں بیمار ہوں کن کا، ان کا

عاشق جب بیمار ہوتا ہے تو اپنے معشوق کے لب ورخسار کی شیرینی سے اپنا علاج کرانا چاہتا ہے۔ سراج کہتے ہیں کہ میں دل کا مریض ہوں اور میرا علاج معشوق کے لب ورخسار کے گل قند سے ہوگا۔ گل قند گلاب کے پھول اور مصری کو ملانے سے بنتا ہے۔ محبوب کے عارض گلاب کے پھول اور ہونٹ مصری ہیں۔ میرے دل کے آزار کے لیے لب ورخسار کا گل قند چاہیے۔

مدتیں ہوئیں کہ ہوا خانۂ زنجیر خراب
بستۂ زلف گرہ دار ہوں کن کا، ان کا

ایک زمانہ تھا جب کسی دیوانے کو باندھ کر رکھنے کے لیے زنجیریں استعمال کی جاتی تھیں،لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے ایک مدت ہوئی کہ زنجیروں کا خانہ خراب ہو گیا یعنی استعمال نہ ہونے کے سبب زنجیریں خراب ہوگئیں۔ مجھے باندہ کر رکنے کے لیے زنجیروں کی ضرورت بھی نہیں ہے کیوں کہ میں تو محبوب کی گھنگھریالی زلفطوں کے عشق میں گرفتار ہوں۔

تشنۂ مرگ کوں ہے آب صراحی دم تیغ
بسمل ابروئے خم دار ہوں کن کا، ان کا

شاعر کہتا ہے کہ جب کوئی فرد مرنے کے قریب ہوتا ہے تو وہ بہت پیاسا ہوتا ہے، اسے اس وقت پانی سے بھری ہوئی صراحی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن میرا یہ معاملہ ہے کہ میں تو ان کے خم دار ابروؤں کا مارا ہوا ہوں، میری تشنگی کا حال مت پوچھو کیوں کہ تلوار کا جو دم یعنی آب ہے وہی میرے لیے پانی کی صراحی ہے۔

ناحق اس سنگ دلی سیں مجھے دیتے ہیں شکست
میں تو آئینہ سرکار ہوں کن کا، ان کا

شاعر کہتا ہے کہ معشوق اپنی سنگ دلی اور بے زاری سے مجھے توڑ رہا ہے یعنی عشق میں دکھ پہنچا رہا ہے اور وصال میں رخنہ ڈالے ہوئے ہے حالانکہ میں تو اس کا وہ آئینہ ہوں جس میں وہ اپنا سراپا دیکھ سکتا ہے۔ سنگ اور آئینے میں تضاد کا رشتہ ہے۔

گلشن وصل میں رہتا ہوں غزل خوانِ فراق
عندلیبِ گل رخسار ہوں کن کا، ان کا

شاعر کہتا ہے کہ میں معشوق سے ملاقات کے لیے ہجر کے نغمے اس طرح گا تا رہتا ہوں جیسے عندلیب (بلبل) پھولوں کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔ عندلیب کی طرح میں بھی محبوب کے پھولوں جیسے رخسار کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہوں، لیکن وصل کی اس گھڑی میں بھی مجھے جدائی کا خوف ستاتا رہتا ہے۔

میں کہا، رحم پتنگوں پہ کر اے جان سراؔج
تب کہا شمع شب تار ہوں کن کا، ان کا

سراج اورنگ آبادی کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب جوشمع کی طرح پیکرنور ہے اپنے پتنگوں (عاشقوں) پر رحم کر جو تیرے اردگرد منڈلاتے ہوئے اپنی جان قربان کردیتے ہیں۔ عاشق کو جواب دیتے ہوئے اس نے کہا میں تو وہ شمع ہوں جو صرف اپنے عاشقوں کے قربان ہونے کے لیے جلتی ہوں۔ اس شعر میں سراؔج (بمعنی چراغ) شمع اور پتنگے میں لفظی مناسبت پائی جاتی ہے۔

غزل-2

خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا، نہ پری رہی
نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری وہی
چلی سمتِ غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم، جسے دل کہیں، سو ہری رہی
نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں میں بیاں کروں
کہ شراب صد قدحِ آرزو، خمِ دل میں تھی، سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق میں جوں دھری تھی تیوں ہی دھری رہی
ترے جوش حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں یہاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جلا رہی، نہ پری کوں جلوہ گری رہی
کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراؔج کوں
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

تشریح:

خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا، نہ پری رہی
نہ تو، تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شعر کے انداز بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے شاعر سے پوچھا ''عشق کی حیرت'' (تحیر عشق) کیا ہوتی ہے؟ اس کی کیفیت کیسی ہوتی ہے؟ شاعر کہتا ہے تحیر عشق یعنی عشق کی انتہا کو پہنچنے کے بعد عاشق پر جو حیرت طاری ہوتی ہے اس کی کیفیت مجھ سے سن کہ یہ ایسا عالم ہوتا ہے جہاں انسان اپنے آپ کو، اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے۔ نہ پری (محبوب) کا وجود رہتا ہے نہ پری کا جنوں (عشق)۔ ایک شدید حیرت کی کیفیت ہوتی ہے جس میں ''میں اور تو'' کا امتیاز ختم ہوجاتا ہے۔ عاشق اور معشوق کا فرق مٹ جاتا ہے اور دنیا و ماسوا سے بے خبری کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ یہ شعر عشق حقیقی سے تعلق رکھتا ہے۔

شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری وہی

جس طرح کوئی بادشاہ خوش ہوکر اپنے کسی وزیر کو خلعت سے نوازتا ہے اسی طرح عشق کی وجہ سے طاری ہونے والی بے خودی کے بادشاہ نے مجھے برہنگی کا لباس عطا کیا ہے۔ میں نے ہوش وحواس کا لباس اتار کر برہنگی کا لباس اختیار کرلیا ہے یعنی عریاں ہوگیا ہوں۔ اب نہ عقل وخرد باقی ہے کہ میں پھٹے ہوئے لباس کی بخیہ گری کروں یعنی اس میں ٹانکے لگاؤں اور نہ جنون اور پاگل پن کی وحشت ہے کہ اپنے لباس کو تار تار کروں یعنی اب ہر طرح سے میں آزاد ہو چکا ہوں۔ اس شعر میں بے لباسی کو لباس کہہ کر صنعت قول محال سے کام لیا گیا ہے جس میں کشمکش اور نفی میں اثبات یا اثبات میں نفی کی صورت پیدا ہوتی ہے یعنی دو متضاد باتیں جو ایک دوسرے سے پوری طرح مماثلت رکھتی ہیں۔

چلی سمتِ غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم، جسے دل کہیں، سو ہری رہی

شاعر سوالیہ انداز میں پوچھتا ہے کہ یہ غیب کی جانب سے کیسی ہوا چلی کہ میرے وجود کا چمن جل کر خاکستر ہوگیا اور میرا وجود جل کر ختم ہوگیا مگر غم کے درخت کی ایک شاخ یعنی میرا دل اب تک باقی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ غیب کی سمت سے آنے والی ہوا نے سب کچھ جلا دیا یعنی میری نظر سے کائنات کا وجود محو ہوگیا۔ تمام چیزیں غیر حقیقی معلوم ہونے لگیں، لیکن ہوا میرے دل کو جلانے میں کیوں ناکام رہی یعنی میرے دل میں عشق کا وجود اب بھی باقی ہے۔

نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں میں بیاں کروں
کہ شراب صد قدحِ آرزو، خمِ دل میں تھی، سو بھری رہی

معشوق، عاشق کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اس سے بے پروائی کا سلوک کرتا ہے تو شاعر کا سوال یہ ہے کہ معشوق کے اس سلوک کا میں کس زبان سے گلہ کروں یعنی میں اس کا گلہ کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ میرے دل کے خم (مٹکہ) میں معشوق کو حاصل کرنے کی آرزو کی شراب بھری ہوئی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ میرا دل تو آرزوؤں سے بھرا ہوا ہے، لیکن میری کوئی آرزو پوری نہیں ہوئی۔

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق میں جوں دھری تھی تیوں ہی دھری رہی

شاعر اس وقت کو یاد کرتا ہے جب اس نے عشق کی کتاب کا سبق پڑھا تھا۔ اس وقت سے عقل کی باتیں بتانے والی کتاب طاق میں رکھی ہوئی ہے یعنی عقل کام نہیں کر رہی ہے۔ شاعر کا منشا ہے کہ عشق کا سبق پڑھنے کے بعد میں نے عقل کا کوئی سبق پڑھنا گوارا نہیں کیا۔ اس شعر میں عشق اور عقل کہہ کر صنعت تضاد سے کام لیا گیا ہے اور عقل پر عشق کی برتری دکھائی گئی ہے۔

ترے جوش حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں یہاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جلا رہی، نہ پری کوں جلوہ گری رہی

شاعر کہتا ہے کہ معشوق جب آئینہ کے سامنے آیا تو اس کے حسن کی دلکشی سے خود آئینہ حیرت میں پڑ گیا یعنی اس کے حسن کی چکا چوند کے

سامنے آئینہ کی چمک دمک ماند پڑ گئی یعنی اس کی جلا ختم ہوگئی۔ جب آئینے میں جلا نہیں رہی تو اس میں عکس دکھانے کی صلاحیت بھی ختم ہوگئی۔ اب اس میں پری (محبوب) کا عکس نظر نہیں آتا۔

کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراؔج کوں

نہ خطر رہا، نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

سراج کہتے ہیں کہ میرا بیچارہ دل عشق کی آگ کی شدت میں جل کر خاکستر ہوگیا ہے، لہٰذا دل کے جل جانے کے بعد اب اسے نہ کوئی خطرہ اور نہ ہی کوئی ڈر ہے، اب ہر طرف سے بے خطری ہے۔ اب وہ ہر طرح کے خوف جیسے جدائی کا خوف، محبوب کی ناراضی کا خوف، دنیا کا خوف وغیرہ سے بے نیاز ہوگیا ہے۔

12.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ قلی قطب شاہ اور وؔلی دکنی کے ساتھ دکن کے غزل گو شاعروں کی تثلیث سراج اورنگ آبادی سے تکمیل کو پہنچتی ہے۔ سراج دکنی غزل کا ایک اہم نمائندہ شاعر ہے اور ولی کے بعد اور میر و سودا کے عہد سے قبل کی درمیانی کڑی ہے۔

☆ سراج اورنگ آبادی کا اصل نام سید سراج الدین تھا۔ یہ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اس لیے سراج اورنگ آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ بروز پیر 13/صفر 1127ھ مطابق 11/مارچ 1712ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔

☆ سراج نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ یہ ابتدا سے ہی صوفی منش آدمی تھے۔

☆ سراج اورنگ آبادی نے غزلیات کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، رباعی اور مخمس بھی لکھے۔ انہوں نے ایک طویل مثنوی ''بوستان خیال'' کے نام سے لکھی، جو ان کی خودنوشت روداد ہے اس میں ایک ہندو لڑکے سے ان کی محبت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

☆ سراج نے فارسی شعرا کا ایک انتخاب بعنوان ''منتخب دیوانہا'' بھی ترتیب دیا ان کے بہت سے فارسی خطوط بھی موجود ہیں جو انہوں نے اپنے دوستوں کے نام لکھے تھے۔ ریختہ میں سراج اورنگ آبادی نے پانچ ہزار اشعار پر مشتمل دیوان بھی مرتب کیا تھا۔

☆ سراج قدیم دکنی شعراء کی آخری کڑی کے طور پر جانے جاتے ہیں کیونکہ سراج کے بعد قدیم دکنی شعراء میں کوئی قابل قدر شاعر نہیں گزرا۔

☆ سراج کے عشقیہ جذبات میں تڑپ اور سوز نے ان کی پیکر تراشی پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ عشق کی کیفیات اور ان کی گہری پرتوں کے مظہر وہ پیکر ہیں جن کی شدت اور اثر انگیزی میں کمی واقع نہیں ہوئی، ان کی حسیاتی کشش سوز اور ساز دونوں کیفیتوں کو خود میں جذب کیے ہوئے ہیں۔

☆ سراج کی شاعری کو ''آہ'' اور ولی کی شاعری کو ''واہ'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

☆ سراج نے خالصتاً ہندوستانی ہونے کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کی تلمیحات کا دائرہ فارسی اور عربی ادبیات تک محدود نہیں بلکہ یہ ہندو صنمیات اور دیومالا سے بھی ماخوذ ہیں جو ہندو معاشرے اور تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔

☆ سراج اورنگ آبادی کی سادہ اور دلکش تشبیہات میں حواس خمسہ یعنی قوت سامعہ، قوت شامہ، قوت لامسہ، قوت ذائقہ اور قوت باصرہ کی شمولیت بھی دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔

☆ سراج نے اپنی غزلوں میں براہِ راست تخاطب کا طرز اختیار کیا۔ وہ اپنی غزلوں میں معشوق سے صرف دردِ دل اور سوز جگر ہی نہیں بیان

کرتے بلکہ اکثر بات کرتے نظر آتے ہیں۔

☆ سراج کے یہاں جذبات کی فراوانی اور شدت ہے اور یہی شدت عشق سراج کی شاعری کو ایک ایسا رنگ و بو بخشتی ہے جو سراج کی شاعری کی منفرد آواز بن جاتی ہے اور ڈھائی سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی تازہ دم اور زندہ آواز ہے۔

12.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
تحیرِ عشق	:	عشق کی وجہ سے پیدا ہونے والی حیرت، تعجب
جنوں	:	پاگل پن، ناآگہی، دیوانگی
پری	:	ایک فرضی اور انتہائی خوب صورت مخلوق
شہ بے خودی	:	بے خودی کا بادشاہ یعنی بے خودی
لباسِ برہنگی	:	بے لباسی کا لباس، بے لباسی، عریانی
بخیہ گری	:	سینا، ٹانکے لگانا، پیوند کاری
پردہ دری	:	پردہ پھاڑنا، لباس پھاڑنا
ظہور کا چمن	:	وجود، ساری کائنات
شاخِ نہالِ غم	:	غم کے پودے کی ٹہنی/شاخ
نظرِ تغافل	:	لاپرواہی سے دیکھنا
شراب صد قدح آرزو	:	سو بڑے پیالوں میں آرزو کی شراب، مراد آرزوؤں کی کثرت
خُمِ دل	:	دل کا مٹکہ یعنی دل
نسخۂ عشق	:	عشق کی کتاب
جوشِ حیرت حسن	:	حسن کے اثر سے پیدا شدہ حیرت کی شدت
جلوہ گری	:	جلوہ دکھانا
دل بے نوا	:	بیچارہ دل
حذر	:	بچاؤ

12.5 نمونہ امتحانی سوالات

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سراج کس عہد کے شاعر ہیں؟

2۔ سراج کا پورا نام بتائیے۔

3۔ سراج کا سنہ پیدائش کیا ہے؟

4۔ سراج کس سنہ میں فوت ہوئے؟

5۔ سراج کی مثنوی کا نام کیا ہے؟

6۔ سراج کے والد کا نام بتائیے۔

7۔ ''خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا، نہ پری رہی'' شعر مکمل کیجیے۔

8۔ غزل کے علاوہ سراج نے کن اصناف میں طبع آزمائی کی؟

9۔ سراج کی شاعری کے موضوعات کیا ہیں؟

10۔ سراج اورنگ آبادی کے ہم عصروں کے نام بتائیے۔

12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سراج کا سوانحی خاکہ تحریر کیجیے۔

2۔ دکنی شاعری میں سراج کا درجہ متعین کیجیے۔

3۔ سراج کے اسلوب کی خصوصیات بیان کیجیے۔

4۔ سراج اورنگ آبادی کی صوفیانہ شاعری کے بارے میں اظہار خیال کیجیے۔

5۔ درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

مدتیں ہوئیں کہ ہوا خانۂ زنجیر خراب
بستۂ زلف گرہ دار ہوں کن کا، ان کا

12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سراج کی غزل گوئی پر مضمون قلم بند کیجیے۔

2۔ سراج کی غزلوں میں حسن و عشق پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ سراج کی شاعری میں پیکر تراشی سے بحث کیجیے۔

12.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ دکنی ادب کی تاریخ — سیدہ جعفر

2۔ دکن میں اردو — نصیرالدین ہاشمی

3۔ سراج اور ان کی شاعری — عبدالقادر سروری

4۔ کلیات سراج — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

5۔ انتخاب سراج اورنگ آبادی — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

اکائی 14 : قصیدہ باغ محمد شاہی

(دکن میں قصیدے کی روایت، محمد قلی قطب شاہ کی قصیدہ گوئی)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 دکنی میں قصیدے کی روایت

14.2.1 بہمنی دور میں قصیدے کی روایت

14.2.2 عادل شاہی دور میں قصیدے کی روایت

14.2.3 قطب شاہی دور میں قصیدے کی روایت

14.2.4 مغل دور میں قصیدے کی روایت

14.3 سلطان محمد قلی قطب شاہ کی قصیدہ نگاری

14.4 قصیدہ باغ محمد شاہی کا مطالعہ

14.4.1 قصیدہ محمد شاہی (متن)

14.4.2 اشعار کی تشریح

14.5 اکتسابی نتائج

14.6 کلیدی الفاظ

14.7 نمونے کے امتحانی سوالات

14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

قصیدہ اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔قصیدہ وہ صنف سخن ہے جس میں شاعر کسی کی مدح یعنی تعریف یا ہجو یعنی مذمت کرتا ہے۔مثنوی کی طرح قصیدہ بھی شاعری کی وہ صنف ہے جس کی شناخت اس کے موضوع اور ہیئت دونوں سے ہوتی ہے۔قصیدے کے عمومی موضوعات مدح اور ہجو ہیں۔ جہاں تک اس کی ہیئت کا سوال ہے تو جاننا چاہیے کہ قصیدے کی ایک خاص ہیئت ہوتی ہے۔یعنی غزل کی طرح اس کا آغاز مطلع سے ہوتا ہے اور باقی اشعار میں بھی غزل ہی کی طرح قافیے کی پابندی کی جاتی ہے۔اردو شاعری کی بیشتر اصناف کی طرح قصیدے کا آغاز بھی دکنی زبان میں ہوا۔

ابتدا میں دکنی شعراء مثنویوں میں ہی حمد ونعت اور منقبت کے بعد بادشاہِ وقت کی تعریف میں کچھ اشعار لکھ دیا کرتے تھے۔جیسے مثنوی ''کدم راوٴ پدم راوٴ'' میں نظامی نے سلطان علاء الدین بہمنی کی مدح کی۔اسی طرح احمد گجراتی نے مثنوی ''یوسف زلیخا'' میں محمد قلی قطب شاہ کی تعریف کی۔ وجہی نے ''قطب مشتری'' میں سلطان ابراہیم قطب شاہ کی خوبیوں کے گن گائے اور نصرتی نے مثنوی ''گلشن عشق'' میں سلطان علی عادل شاہ ثانی کی تعریف میں اشعار لکھے۔لیکن مثنویوں کے مدحیہ اشعار قصیدے کی تعریف میں نہیں آتے۔مثنوی کے علاوہ غزل، رباعی، مخمس یا مسدس کی ہیئت میں بھی مدح وستائش کی گئی ہے۔لیکن یہ شعری پیکر قصیدہ نہیں ہیں۔قصیدے کے لیے مخصوص ہیئت اور نظام قوافی کی پابندی لازمی ہے۔دکنی شاعری میں قصیدہ نگاری کی طویل اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔اس اکائی میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے قصیدے ''باغ محمد شاہی'' اور دکنی قصیدے کی روایت کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے گا۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ دکنی میں قصیدہ نگاری کے اوّلین نقوش کی وضاحت کر سکیں۔
- ☆ بہمنی سلطنت میں قصیدے کے موضوعات اور اس کی روایت پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ عادل شاہی دور میں دکنی قصیدہ نگاری کے ارتقا کا جائزہ لے سکیں۔
- ☆ قطب شاہی عہد میں قصیدے کی نشو ونما پر بحث کر سکیں۔
- ☆ مغل عہد میں دکنی میں قصیدہ نگاری کی کیفیت بیان کر سکیں۔

14.2 دکنی میں قصیدے کی روایت

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے اردو میں قصیدہ گوئی کی روایت کا آغاز دکنی زبان میں ہوا۔دکنی قصائد دراصل دکنی شعراء کی مدحیہ شاعری کی صلاحیت کے آئینہ دار ہیں۔دکنی شعراء نے بادشاہوں اور امرا کے علاوہ روحانی شخصیتوں مثلاً صوفیائے کرام اور اپنے پیرومرشد کی تعریف میں قصائد لکھے۔علاوہ ازیں دکنی میں ہمیں شاہی محلات، باغات، حوض اور فوّارے کی تعریف میں بھی قصائد ملتے ہیں۔دکنی میں مشتاق بیدری، علی عادل شاہ ثانی شاہی، نصرتی، سلطان محمد قلی قطب شاہ، غواصی وغیرہ جید قصیدہ گوشعرا گزرے ہیں۔بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں دکنی قصیدے کی نشو ونما ہوتی رہی اور اس کی روایت آگے بڑھتی رہی۔

ذیل میں ہم دکنی زبان میں قصیدے کے آغاز وارتقا کا تفصیلی مطالعہ کریں گے:

14.2.1 بہمنی دور میں قصیدے کی روایت:

بہمنی سلطنت کا شمار ہندوستان کی تاریخ کی یادگار سلطنتوں میں ہوتا ہے۔اس خاندان کے فرمانرواؤں نے دکن کے ایک وسیع علاقے پر نہایت شان وشوکت اور عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کی۔دکن کے تمدن کی تعمیر میں جتنا بہمنیوں کا حصہ ہے کسی اور حکمران خاندان کا نہیں ہے۔ انھوں نے جب اس خطے میں اپنی سلطنت قائم کی تو یہاں کے مختلف علاقوں میں مختلف راجاؤں کی حکومتیں تھیں جو آپس میں برسرپیکار رہتی تھیں۔ بہمنیوں نے اپنی حکمت عملی سے مہاراشٹرا، کرناٹک اور تلنگانہ تینوں لسانی علاقوں کو ایک ہی سیاست اور حکومت کے تحت متحد کیا اور یہاں کے عوام میں بین قومی اتحاد اور باہمی رواداری پیدا کی۔اس خاندان نے 1347ء سے 1525ء تک اس خطے کی تہذیب ومعاشرت اور ادب وسیاست کی رہنمائی کی اور اپنے بعد ایسی مستقل یادگاریں چھوڑ گیا جو اس کے نام اور کام کو یاد دلاتی رہیں گی۔ان یادگاروں میں سب سے اہم دکنی زبان اور ادب ہے جو انہی کی سرپرستی میں جنوبی ہند میں دور دور تک رائج ہو گیا اور اس وسیع مملکت میں جگہ جگہ اس کے مرکز قائم ہوگئے۔

اردو ادب کی تاریخ میں بہمنی دور کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔یہی وہ دور ہے جب دکنی زبان بول چال کی سطح سے بلند ہو کر تخلیق ادب کی زبان کا درجہ حاصل کرتی ہے۔بہمنی دور میں دکنی زبان میں تخلیق ادب کا آغاز ہوا۔اردو کی پہلی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (مصنفہ فخر دین نظامی) اسی دور میں لکھی گئی۔اردو میں صنف قصیدہ کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا۔مشتاق، لطفی وغیرہ اردو کے اوّلین قصیدہ گو شعرا کا تعلق بہمنی دور ہی سے ہے۔ذیل میں ہم ان شعرا کی قصیدہ نگاری کا جائزہ لیں گے۔

مشتاق: مشتاق بیدری بہمنی دور کا باکمال شاعر تھا۔نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ مشتاق سلطان محمود شاہ بہمنی کے عہد حکومت (1486-1418ء) میں موجود تھا۔(دکن میں اردو) اس کا شمار دکن کے اوّلین قصیدہ گو شعرا میں ہوتا ہے۔مشتاق کا ایک قصیدہ دریافت ہوا ہے جو اس نے شاہ خلیل اللہ بت شکن ثانی کی مدح میں لکھا ہے۔شاہ خلیل اللہ ثانی، شاہ حبیب اللہ کے خلیفہ اور بیدر کے مشہور بزرگ سید خلیل اللہ نعمت اللہ بت شکن کی اولاد میں تھے۔مشتاق کی ایک غزل بھی دریافت ہوئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتا تھا۔

مشتاق کی قصیدہ نگاری کے اس واحد نمونے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس صنف پر بڑی قدرت رکھتا تھا۔اس نے یقیناً اور بھی قصیدے کہے ہوں گے جو امتداد زمانہ کی وجہ سے ہم تک نہیں پہنچ سکے۔اس قصیدے کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ مشتاق پختہ مشق اور قادرالکلام قصیدہ نگار تھا۔اس نے قصیدے کی مخصوص ہیئت کی بھی پاسداری کی ہے اور موضوع کی بھی۔یہ ایک منقبتی قصیدہ ہے جس میں مشتاق نے سید خلیل اللہ بت شکن ثانی کی شجاعت اور سخاوت وغیرہ کی تعریف کی ہے اور موصوف سے اپنی عقیدت اور ارادت کا اظہار کیا ہے۔مشتاق کے قصیدے کے اشعار میں زور بیان کے ساتھ ساتھ روانی و بے ساختگی اور ترنم وموسیقیت پائی جاتی ہے۔اس قصیدے میں مشتاق نے مطلع ثانی بھی رکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اس صنف کے لوازمات پر عبور حاصل تھا۔

مشتاق کی قصیدہ گوئی پر رائے زنی کرتے ہوئے ڈاکٹر الف۔د۔نسیم لکھتے ہیں کہ قصیدے کے اشعار میں نازک خیالیوں اور لطافتوں کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ بہمنی دور میں اردو کس حد تک صاف اور مضامین واسالیب سے پر ہو چکی تھی۔(ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، لاہور، 1971، چھٹی جلد، ص:276)

لطفی: بہمنی دور سے تعلق رکھنے والا ایک اور قصیدہ نگار لطفی ہے۔جو مشتاق کا ہم عصر تھا۔مشتاق کی طرح لطفی کے بھی مکمل نام اور

حالات زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔ لطفی کا ایک قصیدہ اور غزلیات دستیاب ہوئی ہیں۔

لطفی کا قصیدہ بھی منقبتی قصیدہ ہے۔اس میں اس نے شاہ محمد کی مدح کی ہے جو بیدر کے مشہور صوفی سید شاہ خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق اور لطفی دونوں ایک ہی خانوادے میں بیعت تھے۔ لطفی نے یہ قصیدہ خواجہ کرمانی کے ایک مشہور فارسی قصیدے سے متاثر ہوکر اسی کی زمین میں دکنی زبان میں لکھا ہے۔ لطفی کے قصیدے میں شوکت الفاظ، فارسی آمیز تراکیب پرشکوہ انداز بیان اور تخیل کی بلند پروازی کا احساس ہوتا ہے۔ لطفی کے قصیدے میں فارسی الفاظ وتراکیب کا جو غلبہ ہے اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس نے یہ قصیدہ خواجہ کرمانی کے قصیدے کو سامنے رکھ کر لکھا تھا اس لیے اس کے اسلوب ولفظیات پر فارسی قصیدے کا اثر نظر آتا ہے۔فارسی کی تقلید کی وجہ سے قصیدے کی مخصوص زبان، علمی وادبی شان اور فنی خصوصیات برقرار رہ سکیں۔

14.2.2 عادل شاہی دور میں قصیدے کی روایت:

بہمنی سطنت کے انحطاط کے آخری زمانے میں اس کے مکمل خاتمے سے قبل ہی علاقہ کرناٹک کے مرکزی شہر بیجاپور میں ایک آزاد سلطنت قائم ہوگئی جو تاریخ میں عادل شاہی سلطنت کے نام سے مشہور ہے۔ عادل شاہی خاندان کے سلاطین نے 1490ء سے 1686ء تک تقریباً دوسو سال کرناٹک کے وسیع علاقے پر بڑی آن بان کے ساتھ حکومت کی۔سیاسی عروج کے ساتھ اس سلطنت میں علوم وفنون اور تہذیب وثقافت کو بھی عروج حاصل ہوا۔عادل شاہی سلاطین نے علماوفضلا اور شعرا وادبا کی بڑی سرپرستی کی۔مختلف ملکوں کے شاعروں، عالموں، صوفیوں اور ارباب کمال کی آمد نے بیجاپور کی علمی وتمدنی زندگی میں ایسی جان ڈال دی کہ یہ شہر تقریباً ایک صدی تک علوم وفنون کا مرکز بنا رہا۔عادل شاہی حکمرانوں نے دکنی زبان وادب کی بھی بڑی حوصلہ افزائی کی۔مثنوی، غزل، مرثیہ وغیرہ مختلف شعری اصناف کے ساتھ اس دور میں قصیدہ گوئی کو بھی عروج حاصل ہوا۔ ملک الشعرا نصرتی، علی عادل شاہ ثانی، ہاشمی جیسے بلند پایہ قصیدہ گو شعرا کا تعلق اسی عہد سے ہے۔ذیل میں ان کے کارناموں کا مطالعہ کیا جائے گا۔

علی عادل شاہ ثانی شاہی: عادل شاہی خاندان کا آٹھواں حکمران سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی دکنی زبان کا قادرالکلام شاعر تھا۔اسے مختلف اصناف سخن پر دسترس حاصل تھی۔اس کے نامکمل کلیات میں غزل، مثنوی، مرثیہ، رباعی اور گیت کے علاوہ قصائد بھی ملتے ہیں۔کلیات شاہی میں چھ قصیدے ہیں۔ان قصائد کے موضوعات درج ذیل ہیں:

1۔ قصیدہ درحمد
2۔ قصیدہ درنعت پیغمبر صلوٰۃ اللہ علیہ
3۔ قصیدہ درمنقبت حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام
4۔ قصیدہ درمنقبت دوازدہ علیہم السلام
5۔ قصیدہ جمل جمل درتعریف حوض وعلی دادمحل وباغ
6۔ قصیدہ چار در چار

شاہی کے قصائد کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ قصیدہ نگار تھا۔اسے اس صنف کے آداب ولوازم پر عبور حاصل تھا۔ مضامین کی ندرت، استعارات کی دلکشی اور قصیدے کو برتنے کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس صنف کا مزاج شناس تھا۔شاہی کے قصائد دکنی قصیدہ

نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ رفعت تخیل اور نازک خیالی نے بھی انھیں وقیع اور دلکش بنا دیا ہے۔ اس کے قصائد میں زور بیان، لب و لہجے کی گونج اور لفظوں کے شکوہ کی کمی نہیں۔ قصیدہ نگاری جس گرجدار، پروقار اور بلند آہنگ لب و لہجے کی مقتضی ہے وہ شاہی کے قصائد میں جا بجا اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ شاہی نے حمد، نعت اور منقبت کو بڑی سلیقہ مندی، ذہانت اور فن کاری کے ساتھ قصیدے کے پیکر ہیں ڈھالا ہے۔ اس کے قصائد کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں نہ بے جا مبالغہ آرائی ہے نہ خوشامد و تملق کے ناپسندیدہ عناصر۔ شاہی نے اس صنف کو بڑی چابکدستی اور اعتماد کے ساتھ برتا ہے۔ وہ تشبیب، گریز اور مدح کے فنّی خدوخال سے خوب واقف تھا۔ اس نے اپنے قصیدوں میں ان اجزائے ترکیبی کو پوری مہارت اور قادرالکلامی کے ساتھ برتا ہے۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت رقم طراز ہیں: ''علی (شاہی) کے قصیدے اپنی نوع کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ ان قصیدوں میں پہلی بار صنف قصیدہ کے لوازم فن کارانہ انداز میں نمایاں ہوتے ہیں۔ ان میں تشبیب ہے، گریز ہے اور توصیف ہے۔ لیکن دعا کا عنصر ان کا کوئی اہم جز نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی اپنی زندگی سے قانع اور مطمئین تھا۔ مشیت نے جو کچھ علی کو دیا تھا، وہ اس پر شکر گزار تھا۔۔۔۔ علی نے محمد قلی کی طرح اپنے قصیدے میں اپنے ذاتی مفاد یا سلطنت کے تحفظ، توسیع، ترقی اور استحکام کے لیے دعا نہیں کی ہے۔'' (ڈاکٹر ثمینہ شوکت مضمون دکھنی قصائد مشمولہ مجلّہ عثمانیہ دکنی ادب نمبر 1964-1963، ص:106)

شاہی کا نعتیہ قصیدہ رسول اکرم ﷺ کے واقعہ معراج سے متعلق ہے۔ معراج کی مناسبت سے اس نے قصیدے کی تشبیب میں آسمانوں اور اجرام فلکی کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح کے قصیدے کو چرخیہ قصیدہ کہتے ہیں۔ حضرت علی کی منقبت میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں ہندی کی بھکتی شاعری کا رنگ غالب ہے یعنی اس میں اظہار جذبات عورت کی جانب سے ہے۔ اس میں حضرت علی سے محبت و عقیدت کا والہانہ اظہار ہوا ہے۔ علی داد محل شاہی کا معرکہ آرا قصیدہ ہے جو فارسی شعرا کے لامیہ قصائد کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ اس میں محل کی شان و شوکت اور فوارے اور باغ کی دلکشی کے بیان میں منظر کشی اور جزئیات نگاری کا کمال دکھایا ہے۔

نصرتی: سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی کے دربار کے ملک الشعرا نصرتی کا شمار دکنی کے صف اوّل کے شعرا میں ہوتا ہے۔ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، غزل، رباعی، مخمس وغیرہ اس نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن بہ حیثیت قصیدہ گو اس کا مرتبہ نہایت بلند ہے جس تک دکنی کیا جدید اردو کے بھی بہت کم شعرا پہنچ پاتے ہیں۔

نصرتی کے (13) قصائد دریافت ہوئے ہیں جن میں مدحیہ اور ہجویہ دونوں طرح کے قصائد شامل ہیں۔ نصرتی کے سات قصائد اس کی رزمیہ مثنوی ''علی نامہ'' کا حصہ ہیں۔ یہ مثنوی نصرتی کے آقا و سرپرست سلطان علی عادل شاہ ثانی کی جنگی مہمات کی تفصیلات پر مبنی ہے۔ جنگوں میں جب علی عادل شاہ ثانی کے دشمنوں کو شکست ہوتی اور علی فتح یاب ہوتا ہے تو اس موقع پر نصرتی ایک قصیدہ لکھتا ہے۔ مبارک باد کے قصیدوں کے علاوہ مثنوی میں دوسرے موضوعات پر بھی قصیدے ہیں۔ مثنوی علی نامہ میں مختلف ابواب کے لیے اس نے جو عنوان کے اشعار لکھے ہیں انھیں جمع کریں تو ایک قصیدہ تیار ہوتا ہے۔ اسی طرح مثنوی گلشن کے عنوان کے اشعار کو یکجا کیا جائے تو ان سے بھی ایک قصیدہ تیار ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اس کا ایک ہجویہ قصیدہ بھی ہے، ایک قصیدہ علی عادل شاہ کی مدح میں، ایک اپنے گھوڑے کی مذمت میں اور ایک چرخیہ نعتیہ قصیدہ ہے۔ اس طرح یہ کل تیرہ قصیدے ہوئے نصرتی کے یہ قصائد اس قدر بلند پایہ اور وقیع ہیں کہ ابراہیم زبیری نے ''بساتین السلاطین'' میں نصرتی کو خاقانی کا مدمقابل ٹھہرایا ہے۔

علی نامہ کے زیادہ تر قصائد بادشاہ کی مدح میں ہیں۔اس مثنوی کا پہلا قصیدہ قلعہ پنالہ گڑھ کی فتح سے متعلق ہے۔دوسرا قصیدہ فتح بادشاہ غازی وشکست جوہر صلابت خان بھی قلعہ پنالہ کی فتح سے متعلق ہے۔تیسرا قصیدہ بادشاہ غازی بیجاپور کو آنے کا، چوتھا قصیدہ ٹھنڈ کی تعریف کا اور پانچواں قصیدہ ''بادشاہ بیجاپور کو آ کر جشن کیے سو'' ہے۔چھٹا قصیدہ عاشور کے بیان میں ہے۔مثنوی علی نامہ کے قصائد کا مرکز ومحور سلطان علی عادل شاہ ثانی کی ذات ہے۔نصرتی کو علی عادل شاہ سے جذباتی لگاؤ تھا کیوں کہ وہ اس کا سرپرست بھی تھا اور بچپن کا دوست بھی اسی تعلق خاطر کے سبب اسے قصیدہ گوئی کی تحریک ملتی ہوگی۔فارسی اساتذہ کے قصائد کی تقلید میں اس نے اپنے ممدوح (علی عادل شاہ) کی جرأت وحوصلہ مندی اور بہادری و شجاعت کی توصیف وتحسین کے ساتھ ممدوح کے ہاتھی، گھوڑے، تلوار فوج اور سرداران لشکر کی جواں مردی کی بھی تعریف کی ہے۔نصرتی نے اپنے قصائد میں علی عادل شاہ شاہی کی معرکہ آرائیوں اور اس کے محاربات کا نہایت پراثر خاکہ کھینچا ہے۔ان قصائد میں میدان جنگ کا حال فوجوں کی خصوصیات بیجاپور کے افسروں اور سپہ سالاروں کی بہادری جاں نثاری اور وفاداری اور جنگ کے واقعات کو ایک مورخ کی طرح بیان کیا ہے۔

نصرتی کے قصائد میں باغ اور شاہی محل کے علاوہ شہر کی چہل پہل، رونق اور موسمی کیفیات کی بھی خوب صورت تصویر کشی کی گئی ہے۔تخیل کی پرواز، طرز ادا کی برجستگی اور معنی آفرینی نے نصرتی کے قصائد کو وقیع اور بلند پایہ بنادیا ہے۔نصرتی کے قصائد دکنی کے دیگر قصیدہ نگاروں کے مقابلے میں خاصے طویل ہیں۔مثنوی علی نامہ کا آخری قصیدہ جو اس نے علی عادل شاہ کی فتح پر لکھا ہے۔دوسو بیس اشعار پر مشتمل ہے۔فنی محاسن کے اعتبار سے یہ نصرتی کا شاہ کار قصیدہ ہے۔رفعت تخیل، الفاظ کے شکوہ، لہجے کی گھن گرج اور مضامین کی ندرت ان سب اوصاف نے مل کر اس قصیدے کو اردو کا شاہ کار بنادیا ہے۔نصرتی کا نعتیہ قصیدہ جو حضورؐ کے معراج پر تشریف لے جانے سے متعلق ہے چرخیہ قصیدہ ہے کیوں کہ اس کی تشبیب میں آسمان، چاند، سورج اور سیاروں کا ذکر ہے۔

نصرتی نے ہجویہ قصائد بھی لکھے۔اس نے جس قصیدے میں بادشاہ سے گھوڑا عطا کرنے کی درخواست کی اس میں اس نے اپنی گھوڑی کی کمزوری، سستی، بیماری اور سن رسیدگی کا مضحکہ خیز نقشہ کھینچا ہے۔موضوع اور مضامین کے اعتبار سے نصرتی کا یہ ہجویہ قصیدہ سودا کے قصیدے ''تضحیک روزگار'' کی یاد دلاتا ہے۔نصرتی کے قصائد کی فنی خوبیوں اور محاسن کے پیش نظر جمیل جالبی لکھتے ہیں: ''سارے دکنی ادب میں اتنے بلند پایہ اور فارسی کے معیار سخن کے مطابق قصیدے ہمیں دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہیں آتے۔بہ حیثیت مجموعی اردو قصائد کے ذکر میں جہاں ہم سودا اور ذوق کا اب تک نام لیتے آئے ہیں وہاں مولانا نصرتی کا نام ان کے ساتھ نہیں بلکہ ان دونوں سے پہلے لینا چاہیے۔'' (ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، دہلی 2000ء، جلد اوّل، ص: 347)

ہاشمی: میاں میراں خاں ہاشمی کا شمار عادل شاہی عہد کے ممتاز مثنوی نگار اور ریختی گو شعرا میں ہوتا ہے۔مثنوی ''یوسف زلیخا'' اور مثنوی ''عشقیہ'' کے علاوہ ہاشمی کی تصانیف میں ہی ریختی کا دیوان بھی شامل ہے۔اسے اردو میں ریختی کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔مثنوی اور غزل کے علاوہ وہ قصیدہ گوئی میں بھی مہارت رکھتا تھا اور اس صنف میں طبع آزمائی کرتا تھا۔اس کے دو قصیدے دریافت ہوئے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ہاشمی کے دو قصیدوں میں ایک قصیدے کا عنوان ''قصیدہ سر س ہائے ہاشمی راست'' ہے۔یہ قصیدہ اکسٹھ اشعار کو محیط ہے اور ذوالفقار نصرت خاں کی مدح میں لکھا گیا ہے جو مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا صوبہ دار تھا۔ہاشمی نے اس قصیدے میں بڑے سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ مدح کا حق

ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

قصیدہ سرس ہائے ہاشمی غیر مشبب قصیدہ ہے۔ ذوالفقار خاں نے سخت محاصرے کے بعد مرہٹوں کو شکست دے کر جنجی کا قلعہ فتح کیا تھا۔ اس فتح کی ہر طرف خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ محاذ جنگ سے نواب کے کامیاب وظفر مند ہو کر واپس لوٹنے کی خوشی میں محل میں جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سازوں پر نغمے گائے جارہے تھے۔ محل کی خواتین بن ٹھن کر آراستہ ہو رہی تھیں۔ فضا میں خوشبوئیں مہک رہی تھیں۔ ہمہ اقسام کے پکوان ہو رہے تھے۔ ہاشمی نے اس قصیدے میں ان ساری تیاریوں کی خوب صورت تصویر کشی کی ہے جس سے اس عہد کی تہذیب وتمدن کی ترجمانی ہوتی ہے۔

ہاشمی کے دوسرے قصیدے کی سرخی ''قصیدہ ذوالفقار خاں'' ہے۔ اس قصیدے کا ممدوح بھی ذوالفقار خاں ہی ہے۔ یہ قصیدہ (146) اشعار کو محیط ہے۔ اس میں ہاشمی نے ذوالفقار خاں کی حسن سیرت اور جاہ وحشم کے علاوہ اس کی فیاضی اور بخشش وعطا کی بھی تعریف کی ہے۔ اس قصیدے میں ہاشمی نے قصیدے کی روایت کے مطابق ذوالفقار کی بہادری وشجاعت کو سراہا ہے اور اس کے گھوڑے، ہاتھی، تلوار کی تعریف کی ہے اور قصیدے کے صلے میں گاؤں اور ہاتھی عطا کرنے کی درخواست کی ہے۔ ہاشمی کے قصیدے دکنی تمدن خصوصاً نسوانی تہذیب اور رسم ورواج کی مرقع کشی کرتے ہیں، خصوصاً قصیدہ سرس ہائے ہاشمی میں اس نے عورتوں کی زبان میں ان کے جذبات وتصورات کی حقیقت پر مبنی عکاسی کی ہے۔ قصیدے میں ریختی کا یہ انداز ہاشمی کی جدت طرازی اور انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہاشمی چونکہ بنیادی طور پر ریختی گو تھا اس لیے اس نے قصیدے میں بھی ریختی کا اسلوب اور ریختی کی فضا پیدا کی ہے۔

14.2.3 قطب شاہی دور میں قصیدے کی روایت:

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں جو پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں گولکنڈے کے قطب شاہی سلاطین کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ انھوں نے 1508ء سے 1687ء تک تقریباً 180 سال، گولکنڈہ اور دکن کے وسیع علاقے پر نہایت تزک واحتشام سے حکومت کی۔ ان کی سلطنت کا بڑا حصہ تلگو زبان کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ شاہانِ قطبیہ کی شہرۂ آفاق دولت وثروت، تعمیر کاری اور علم وادب کی سرپرستی تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ درخشاں رہے گی۔ دکنی زبان وادب نے بھی ان کے عہد میں غیر معمولی ترقی کی۔ قطب شاہی حکمرانوں نے دیگر علوم وفنون کے ساتھ دکنی زبان وادب کی بھی بڑی سرپرستی کی اور دکنی زبان کے شعرا کو ملک الشعرا کے اعزاز سے سرفراز کیا جن میں وجہیؔ اور غواصیؔ جیسے سخنور شامل ہیں۔

قطب شاہی دور میں شاعری کی مختلف اصناف مثلاً مثنوی غزل، مرثیہ اور رباعی کو فروغ حاصل ہوا۔ دکنی میں قصیدہ نگاری کی روایت کو بھی اس عہد میں استحکام حاصل ہوا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ، غواصی، عبداللہ قطب شاہ، افضل وغیرہ اس دور کے اہم قصیدہ گو شعرا ہیں۔ ذیل میں ان کے کارناموں کا مطالعہ کیا جائے گا۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ: گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت کا پانچواں فرماں روا محمد قلی قطب شاہ 14/اپریل 1565ء کو پیدا ہوا۔ 5/جون 1580ء کو اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ بتیس سال چھے مہینے نہایت شان وشوکت کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد سینتالیس سال کی عمر میں 10/دسمبر 1612ء کو اس کا انتقال ہوا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نہ صرف ایک وسیع اور خوش حال مملکت کا رعایا پرور حکمران شہر حیدرآباد کا بانی، دکنی تہذیب وتمدن کا معمار، فن تعمیر اور رقص وموسیقی دلدادہ تھا بلکہ اردو کا پرگو شاعر بھی تھا۔ اس نے دیگر اصناف سخن کے علاوہ

قصیدے میں بھی طبع آمائی کی ۔اس کے ضخیم کلیات میں بارہ قصیدے ہیں۔ان میں سے ایک باغ محمد شاہی کی تعریف میں ہےاور باقی سب مختلف تہواروں کے بیان میں جن میں بسنت عید قرباں، عیدنوروز اور عید میلا دالنبی کے جشن شامل ہیں ۔اس اعتبار سے یہ قصیدے کی عام تعریف کی توسیع ہیں۔محمد قلی نے عیدوں اور تہواروں کو مذہبی نہیں بلکہ تہذیبی جشن کی صورت دی تھی ۔اس کے قصائد کسی جشن یا تقریب کا مربوط اور پرشکوہ بیان ہیں ۔ محمد قلی کے قصیدے اس صنف کی ارضیت کی پہلی اور آخری مثال ہیں۔اس کے قصائد کے مضامین محض جذباتی یا تصوراتی نہیں بلکہ دکن کی سرزمین اور ثقافت میں پیوست اور دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ارضی وحقیقی ہیں جس کا ایک نمونہ قصیدہ باغ محمد شاہی ہے جس کا تفصیلی مطالعہ آگے کیا جائے گا۔ یہاں صرف یہ ذہن نشین رہے کہ محمد قلی قطب شاہ نہ صرف جید قصیدہ گوشاعر تھا بلکہ دکنی میں قصیدہ گوئی کی روایت کا اہم معمار بھی تھا۔اس نے نہ صرف دکنی قصیدے کی روایت کے تسلسل کو جاری رکھا بلکہ اسے مستحکم بھی کیا۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ: گولکنڈے کا ساتواں حکمران سلطان عبداللہ قطب شاہ،محمد قلی قطب شاہ کا نواسہ اور محمد قطب شاہ کا فرزند و جانشین تھا۔ وہ بھی اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طرح خوش گوسخنور بھی تھا۔اس کے دیوان کا ایک نامکمل نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ جو شائع ہو چکا ہے۔اس میں غزلیات کے علاوہ چار قصائد بھی موجود ہیں، چار کے من جملہ دو قصائد حضرت علی کی منقبت میں ہیں۔ایک قصیدہ عید غدیر پر اور ایک قصیدہ اپنے بنوائے ہوئے''عشرت محل'' کی تعریف میں ہے۔عبداللہ قطب شاہ کے قصائد مختصر ہوتے ہیں۔اپنے نانا محمد قلی کی طرح وہ غزلیات اور قصائد کے مقطعوں میں''نبی صدقے'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔اس کے قصیدوں میں تشبیب اور گریز کے اشعار نہیں ہوتے۔ بلکہ راست مدح سے قصیدے کا آغاز ہوتا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کو محمد قلی قطب شاہ کی طرح اہلبیت اطہار سے بڑی محبت تھی جس کا اظہار اس کے قصائد سے ہوتا ہے۔محمد قلی قطب شاہ نے حنان محل اور محل کوہ طور پر قصیدے لکھے۔سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی نے''علی داد محل'' پر قصیدہ لکھا تو عبداللہ قطب شاہ نے عشرت محل کی تعریف میں قصیدہ لکھا۔لفظوں کے دروبست زور بیان اور تشبیہات واستعارات نے اس قصیدے کے ادبی حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔

غواصیؔ: غواصی قطب شاہی دور کا اہم شاعر تھا۔وہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی کا ہم عصر تھا۔سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اسے عروج حاصل ہوا اور اس کو ملک الشعرا کا مرتبہ حاصل ہوا۔غواصی ایک قادرالکلام سخنور تھا۔اسے مختلف اصناف سخن پر قدرت اور مہارت حاصل تھی۔اس کی تین مثنویوں کا شمار دکن کی اہم مثنویوں میں ہوتا ہے جن کے نام یہ ہیں:

i۔ مینا ستونتی ii۔ طوطی نامہ iii۔ سیف الملوک وبدیع الجمال

مثنویوں کے علاوہ اس نے غزلیات کا ایک مکمل دیوان بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔کلیات غواصی میں غزلوں،مثنویوں اور رباعیات کے علاوہ قصائد بھی شامل ہیں۔کلیات غواصی میں (35) قصیدے ملتے ہیں لیکن مطبوعہ کلیات کے مرتب محمد بن عمر نے صرف اکیس قصیدوں کو مستند مانا ہے۔قصائد کی یہ تعداد اس صنف پر اس کی گرفت اور مہارت کی واضح دلیل ہے۔الفاظ کی تراش خراش اور ترکیبوں کی اختراع میں غواصی اپنے ہم عصروں سے آگے نظر آتا ہے۔اس کے قصائد میں روانی اور آمد کی کیفیت زیادہ ہے۔اس کے قصائد میں ثقیل، نامانوس اور بوجھل الفاظ نہایت کم ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ شوکت الفاظ اور معنی خیز تراکیب کی تلاش میں وہ فارسی طرز ادا کے قریب پہنچ جاتا ہے۔اس نے اپنے اکثر قصائد میں مشکل ردیف وقوافی کو نہایت خوش اسلوبی اور قادرالکلامی سے برتا ہے۔

غواصی کے قصیدوں میں تشبیب ،گریز، دعا اور مدعا کی پابندی ملتی ہے مگر ان میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات میں ڈوب کر قصیدے لکھے گئے ہیں۔ مدح کے ضمن میں وہ ممدوح کے ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں کا ذکر کرتا ہے۔ ممدوح کے عدل وانصاف اور بخشش وسخاوت کے ساتھ وہ اس کی ظاہری وجاہت اور حسن کی بھی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس کے بیشتر قصائد سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں ہیں۔ ان میں اس نے ممدوح کی بہادری اور رعب کے علاوہ اس کے اسلحے ہاتھی ،گھوڑے ، خیمے اور محل کی بھی تعریف کی ہے۔ اس نے فارسی کے مشہور قصیدہ گوشعرا خاقانی، انوری اور عرفی کے قصائد کی زمینوں میں طبع آزمائی کی اور اپنے زور سخن کا لوہا منوایا۔ اس کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس نے درباری قصیدوں میں بھی نعتیہ اور منقبتی مضامین شامل کیے۔ ایک قصیدے میں اس نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کو نظم ونسق کی خرابیوں سے آگاہ کیا ہے اور اسے مفید مشورے دیے ہیں۔ اس کا ایک قصیدہ حضرت علیؓ کی منقبت میں اور ایک قصیدہ مناجات کے انداز میں ہے۔ غواصی دکنی کا بلند مرتبت قصیدہ گو شاعر تھا۔ دکنی میں سب سے زیادہ قصیدے اسی نے لکھے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی رقم طراز ہیں: ”غواصی اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے باقاعدہ درباری قصیدے لکھے۔“ (اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، لکھنؤ، 2005ء، ص:141) اس نے اپنے قصائد میں مذہبی، حکیمانہ اور اخلاقی عناصر کو شامل کر کے اس بدنام صنف کو نیا وقار بخشنے کی کوشش کی۔

شاہ افضل گولکنڈوی: یہ وجہی اور غواصی کا شاید کم سن معاصر تھا۔ اس کا نام محمد افضل قادری اور تخلص افضل تھا۔ وہ میراں شاہ معروف کا مرید تھا۔ سخاوت مرزا لکھتے ہیں کہ افضل کو بادشاہ کا تقرب حاصل تھا۔ وہ شاہی دربار کے زبردست قصیدہ گو تھے۔ (بحوالہ مضمون، شاہ افضل گولکنڈوی مشمولہ رسالہ اردو، 1954ء، ص:24) افضل کی ایک مثنوی دریافت ہوئی ہے جس کا نام ”محی الدین نامہ“ ہے۔

افضل کا صرف ایک ہی قصیدہ دستیاب ہوا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کے مطابق افضل نے یہ قصیدہ گولکنڈہ کے حکمران سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں لکھا ہے۔ اس قصیدے کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ افضل ملا وجہی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے وجہی کے اوصاف اور اس کی سخنوری کی توصیف کی ہے اور اس کی عظمت کا اعتراف واظہار کیا ہے۔ اس شعر میں بادشاہ سے مخاطب ہو کر وہ کہتا ہے کہ اے بادشاہ! تو ایسا عالی مرتبت ہے کہ تیری شایان شان مدح کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے وجہی جیسا گیانی اور اپنے فن کا کامل استاد چاہیے۔

تجھ ایسے شاہ کو ہونا سو وجہی سار کا شاعر
نپٹ عاقل، نپٹ کامل، نپٹ گیانی، نپٹ گمبھر

اس قصیدے کی بحر نہایت رواں ہے۔ افضل نے اس میں زور بیان ،شکوہ الفاظ بلندی تخیل کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کا اسلوب بیان بھی شاداب وشگفتہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبردست قصیدہ گوشاعر تھا لیکن افسوس کہ اس کے قصائد دستیاب نہیں ہیں۔

14.2.4 مغل دور میں قصیدے کی روایت:

مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے 1686ء میں بیجاپور 1687ء میں گولکنڈہ فتح کیا۔ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے زوال کے نتیجے میں دکن ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوا جس نے اس سرزمین کی تہذیب وشائستگی اور علم وفضل کی بنیادیں ہلادیں۔ بیجاپور اور حیدرآباد اس انقلاب سے اتنے متاثر ہوئے کہ پچاس سال تک سنبھل نہ سکے۔ ان شہروں کی وہ مرکزیت ختم ہوگی جو علوم وفنون جو شعر وسخن کا گہوارہ ثابت ہوئی تھی۔

اورنگ زیب کی تسخیر دکن کا دکنی زبان اور شعروادب بھی گہرا اثر پڑا۔اس دور میں دکنی زبان میں کوئی بڑی مثنوی نہیں لکھی گئی کیوں کہ اس کے لیے جس اطمینان قلب اور فارغ البالی کی ضرورت و نیز شاہی قدر دانی اور درباری قدر و منزلت کی توقع تھی یہ سب باتیں اس دور انتشار میں مفقود تھیں۔ بیشتر شاعروں میں مذہبی نظمیں جیسے ولادت، نامہ، معراج نامہ، وفات نامہ اور مرثیے لکھنے کا رجحان بڑھ گیا۔اس دور میں ہمیں صرف ایک ہی سخنور یعنی ولؔی کے یہاں قصیدے ملتے ہیں۔ولؔی کے بعد سراؔج اورنگ آبادی کے کلیات میں ایک قصیدہ ملتا ہے۔ذیل میں مذکورہ شعرا کی قصیدہ گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ولؔی دکنی: ولؔی دکنی زوال بیجاپور و گولکنڈہ کے بعد مغل دور کے دکنی شعرا میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔انھیں اردو غزل کا امام اور مجتہد کہا جاتا ہے کیوں کہ انھوں نے اردو غزل کو نیا موڑ دیا۔ولؔی کے سفر دلّی کے نتیجے میں شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔غزل کی طرح شمالی ہند کی قصیدہ گوئی بھی ولؔی کی رہین منت ہے۔قصیدہ گوئی کی روایت کو دکن سے شمالی ہند لے جانے میں ولؔی کا بڑا ہاتھ ہے۔ولؔی کے کلیات میں چھے قصیدے ملتے ہیں۔ یہ قصیدے ان کی مذہبی اور متصوفانہ عقیدتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ان میں خدا کی تعریف، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت حضرت علیؓ کی منقبت، بیت الحرام کی تعریف، میراں محی الدینؒ اور شاہ وجیہہ الدین کی مدح کی گئی ہے۔

ولؔی نے قصیدے کی صنف کو دنیوی فائدے اور مالی منفعت کے حصول کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ اپنی شاعرانہ قوتوں، زور تخیل، جوش بیان اور مہارت زبان کو حمد، نعت، منقبت اور موعظت جیسے موضوعات پر صرف کیا۔ولؔی کے قصائد کے متعلق ڈاکٹر اعجاز حسین کی یہ رائے ہے کہ جتنی خوبیاں قصیدے میں ہونی چاہیئے ولؔی کے قصیدوں میں وہ سبھی موجود ہیں۔خود ولؔی نے قصیدہ نگاری میں اپنے کو خاقانی، انوری اور عرفی کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور اپنی قصیدہ نگاری کو بے مثل قرار دیا ہے۔کہتا ہے۔

یقیں ہے مجھ کوں کہ گر یہ قصیدہ رنگیں ‎ ‎ ‎ ‎ سنیں تو وجد کریں انوری و خاقانی

ولؔی کی شاعری میں تصوف کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ان کے قصیدوں میں بھی تصوف کا رنگ غالب ہے۔اکثر قصائد کے اشعار میں انھوں نے دنیا کے عیش و راحت، مال و دولت اور عزت و شہرت کی ناپائیداری کا ذکر کیا ہے۔ولؔی نے بزرگان دین کی مدح و توصیف میں جو قصائد لکھے۔وہ مذہبی اور متصوفانہ نوعیت کے ہیں لیکن مضمون آفرینی اور ابلاغی ہنرمندی کے اعتبار سے ان میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ان کے یہاں مشبب اور غیر مشبب دونوں طرح کے قصیدے ملتے ہیں۔ بیت الحرام کی تعریف میں جو قصیدہ ہے وہ تمام تر تشبیب پر مبنی ہے اور دوسرے قصائد سے مختصر یعنی صرف بیس اشعار پر مشتمل ہے۔انھوں نے سرور کائناتؐ کی شان میں جو نعتیہ قصیدہ لکھا ہے وہ مشبب ہے۔اسی طرح سیدنا علیؓ، میراں محی الدینؒ اور شاہ وجیہہ الدین کی منقبت میں جو قصیدے لکھے ہیں ان میں بھی تشبیب ہے۔کلیات کے پہلے قصیدے میں جس کا عنوان ''در حمد و نعت و منقبت و موعظت'' ہے تشبیب نہیں ہے۔ولؔی نے اپنے قصائد میں دل آویز تلازمات اور نادر و تازہ کار تشبیہات استعمال کی ہیں۔اردو قصیدہ نگاری کے ارتقائی مدارج میں ولؔی کے قصیدے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سراؔج اورنگ آبادی: سراج دبستان اورنگ آباد کے آخری بڑے شاعر تھے۔ڈاکٹر زورؔ کے مطابق انھیں کی ذات پر دکن کے قدیم استادان فن اور معماران سخن کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔(دکنی ادب کی تاریخ ص: 120) سراج ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔وہ 1711ء میں پیدا ہوئے۔انھوں نے ساری زندگی درویشی اور قلندری میں گزاری اور 1763ء میں انتقال کیا۔سراؔج کی شاعری ان کے عنفوان شباب کی پیداوار ہے۔ان کا دیوان 1735ء تک مرتب ہوچکا تھا۔ان کا کلام تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غزل گو شاعر تھے۔ان کی مثنوی

’’بوستان خیال‘‘ کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ سراؔج کے کلیات میں صرف ایک قصیدہ ملتا ہے۔

سراؔج کا واحد قصیدہ تیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس قصیدے میں صوفیانہ اور اخلاقی تعلیمات کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ اس میں انھوں نے کسی حکمران یا رئیس کی مدح سرائی نہیں کی ہے بلکہ اپنی روداد بیان کی ہے۔ یہ قصیدہ مربوط اور مسلسل ہے اور اس میں کہانی پن کی فضا محسوس ہوتی ہے۔ شاعر نے آہ کو اپنا قاصد یا سفیر بنایا ہے اور اس کے ذریعہ اپنی حالت زار اور عشق کے صدمات کی کیفیت رسول کریمؐ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں: ’’قصیدے سے سراج کی طبیعت کو مناسبت نہیں تھی صرف ایک قصیدہ ان کے کلام میں مل سکا ہے اور خاص ان کے متصوفانہ رنگ میں ہے۔ اس میں بھی وہ کسی کی مدح سرائی کے بجائے اپنی کہانی سناتے ہیں۔‘‘

(کلیات سراج، مقدمہ، ص:118)

14.3 سلطان محمد قلی قطب شاہ کی قصیدہ نگاری

سلطان محمد قلی قطب شاہ نہایت پرگو اور قادر الکلام سخنور تھا۔ اسے شاعری کی تمام اصناف پر عبور حاصل تھا۔ اس نے شاعری کی متعدد اصناف میں طبع آمائی کی اور اپنی قدرت بیان اور مہارت سخن کا مظاہرہ کیا۔ اس کی ضخیم کلیات میں غزل، قصیدہ، مرثیہ اور رباعی کے علاوہ مختلف موضوعات پر غزل اور مسدس کی ہیئت میں نظمیں، قطعہ، ریختی اور چہار در چہار کے نمونے ملتے ہیں۔

جہاں تک قصیدہ گوئی کا تعلق ہے سلطان محمد قلی قطب شاہ کا شمار دکن کے صف اوّل کے قصیدہ گو شعرا میں ہوتا ہے۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ میں کل بارہ قصیدے ہیں جن میں کچھ مکمل ہیں اور کچھ نامکمل ہیں۔ ان میں ایک قصیدے کے تو صرف دو ہی اشعار دستیاب ہوئے ہیں جس پر ’’بعثتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم‘‘ کا عنوان لگایا گیا ہے۔ ایک اور قصیدے میں جسے ’’شانِ علی‘‘ کا عنوان دیا گیا ہے صرف چار اشعار ہیں یہ ناقص الاوّل قصیدہ ہے۔ دو قصائد میں صرف تشبیب کے اشعار ہیں۔ ایک قصیدہ ’’باغ محمد شاہی‘‘ ناقص الآخر ہے۔

کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ میں (7) قصائد مکمل ہیں۔ ان قصائد کو درج ذیل عنوانات دیے گئے ہیں:

i۔ عید میلاد النبیؐ ii۔ عید نوروز و عید سلطاں iii۔ عید نوروز iv۔ نوروز v۔ عید قرباں

vi۔ عید قرباں vii۔ بسنت

محمد قلی قطب شاہ کے قصائد کی جو خصوصیت قاری کو سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کے قصائد کے موضوعات کی رنگارنگی اور کثرت ہے۔ اس نے نعت، منقبت، عیدوں، موسموں اور تہواروں پر قصیدے لکھے ہیں۔ اس کے یہاں مختصر اور اوسط طوالت کے قصیدے ملتے ہیں۔ نصرتیؔ اور علی عادل شاہ ثانی شاہی کی طرح طویل قصیدے اس نے نہیں لکھے۔ مختلف علمائے ادب نے قصیدے میں اشعار کی کم سے کم تعداد سات سے پچیس تک متعین کی ہے لیکن محمد قلی نے تعداد اشعار کی پابندی نہیں کی ہے۔ اس نے اختصار پسندی سے کام لیا ہے اور زیادہ تر مختصر قصیدے لکھے ہیں۔ اس کا سب سے طویل قصیدہ (51) اشعار پر مشتمل ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے قصائد کے موضوعات پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس نے دو قسم کے قصیدے لکھے ہیں۔ 1۔ مدحیہ 2۔ بیانیہ اس کے مدحیہ قصائد مذہبی نوعیت کے ہیں جن میں اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں نعتیہ جذبات کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی حضرت علیؓ کی شان میں توصیفی اشعار لکھے ہیں گویا اس کے مدحیہ قصائد، نعتیہ اور منقبتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ بیانیہ قصائد میں اس نے عید نوروز، عید قرباں، عید میلاد

النبیؐ، باغ محمد شاہی اور بسنت کی کیفیات کی عکاسی کی ہے۔قطب شاہی محلات میں یہ عیدیں اور تہوار بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ دعوتیں ہوتیں، رقص وسرور کی محفلیں جمتیں اور جشن کا اہتمام ہوتا تھا۔محمد قلی کے قصائد میں قطب شاہی محلات کی چہل پہل، تقاریب کی رونقوں اور اس دور کے رسم ورواج اور معاشرت کی دلکش تصویریں ملتی ہیں۔

عام طور پر قصیدہ گو شعرا انعام واکرام کی توقع میں کسی بادشاہ یا رئیس کا قصیدہ لکھتے ہیں۔لیکن محمد قلی قطب شاہ کا معاملہ دیگر تھا۔وہ خود حکمران وقت تھا۔اسے کسی بادشاہ یا حاکم کی تعریف وتوصیف کی ضرورت نہیں تھی۔قصیدہ گوئی اس کے لیے جاہ ومنصب کے حصول کا وسیلہ نہیں تھی۔اس نے محض شاعرانہ جذبے کی تسکین کے لیے قصیدہ گوئی کی اور دین اسلام کی مقدّس شخصیتوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا علیؓ کی شان میں قصیدے لکھے۔مذہبی رہنماؤں کے علاوہ اس نے عیدوں اور تہواروں کی مسرت ورونقوں، موسم کے رنگین مناظر اور باغ کے حسن ودلکشی کو اپنے قصیدوں کا موضوع بنایا۔

محمد قلی قطب شاہ کی قصیدہ نگاری کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے قصائد میں اس صنف کے اجزائے ترکیبی کی پابندی نہیں کی ہے۔اس کے بعض قصائد مشبب ہیں یعنی ان میں تشبیب ہے لیکن بعض قصائد میں تشبیب کے بغیر مدح کا آغاز کیا گیا ہے یعنی یہ غیر مشبب ہیں۔ تشبیب کے علاوہ اس نے گریز، مدح اور دعا کے اجزا اور ان کی ترتیب کو بھی ضروری نہیں سمجھا ہے اس طرح اس نے قصیدہ نگاری کے روایتی انداز سے انحراف کیا ہے۔عید میلادالنبی پر اس نے جو قصیدہ لکھا ہے اس کا آغاز راست مدح سے ہوتا ہے۔اس کے برخلاف منقبت کے دو قصیدوں اور نوروز کے ایک قصیدے میں قصیدہ نگاری کی روایت کے مطابق تشبیب سے قصیدے کی ابتدا کی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی قصیدہ گوئی کا ایک وصف اس کی حقیقت پسندی اور مبالغے سے گریز ہے۔قصیدے کی صنف خوشامد، تملق اور ممدوح کی تعریف میں مبالغہ آرائی کی انتہا کی وجہ سے بدنام اور اہل نظر کی تنقید کا نشانہ بنی ہے۔لیکن جب ہم محمد قلی قطب شاہ کے قصائد کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قصائد جھوٹی تعریف اور غلو سے بڑی حد تک پاک ہیں۔اس نے عربی کے حقیقت پسند شعرا کی طرح اصلیت اور واقعیت پر زور دیا ہے۔اس نے ان پھولوں، پرندوں اور قدرتی مناظر کی عکاسی کی ہے جو فرضی اور خیالی نہیں ہیں بلکہ انھیں اس نے دکن کی سرزمین پر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔مذہبی شخصیات کی عظمت اور ان سے عقیدت کا اظہار ہو یا دکنی ماحول ومعاشرت کی منظر کشی اس نے اپنے دلی جذبات کو کسی تکلف وتصنع اور مبالغے کی ملمع کاری کے بغیر بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔

فنی اعتبار سے محمد قلی کے دو قصیدے نہایت زوردار اور لاجواب ہیں جن میں سے ایک کا موضوع ''عید نوروز اور عید سلطاں'' اور دوسرے کا موضوع ''نوروز'' ہے۔قصیدہ عید نوروز وعید سلطاں (37) اشعار پر مشتمل ہے۔محمد قلی قطب شاہ نے یہ قصیدہ اس موقع پر کہا جب نوروز اور عید رمضاں ایک ساتھ آئے تھے قصیدے میں اس کا ذکر موجود ہے۔قصیدے میں اس نے نوروز اور عید کی دوہری مسرت اور ان کے جشن کی مرقع کشی کی ہے۔ دوسرا قصیدہ جو نوروز کے موضوع پر ہے (51) اشعار پر مشتمل ہے اور محمد قلی قطب شاہ کا سب سے طویل قصیدہ ہے۔ربط وتسلسل، زور تخیل اور مضمون آفرینی کے اعتبار سے بھی یہ قصیدہ اہمیت رکھتا ہے۔اس قصیدے میں قطب شاہی معاشرہ اپنے اہم سماجی خدوخال کے ساتھ ابھرتا نظر آتا ہے۔ محلات کی تزئین، جشن کی تیاریاں، مہمانوں کی خاطر مدارات، محفل آرائی کے انداز سامان آرائش وزیبائش، شاہی مشاغل اور دربار کے آداب و

تکلفات کی متحرک اور گویا تصویریں اس قصیدے میں موجود ہیں۔(کلیات محمد قلی قطب شاہ مرتبہ پروفیسر سیدہ جعفر، مقدمہ،ص:216-215)

''بسنت'' پر محمد قلی قطب شاہ نے جو قصیدہ لکھا ہے وہ بیانیہ قصائد کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ صرف پندرہ اشعار کو محیط ہے۔ محمد قلی کے دور میں بسنت کا تہوار بڑے اہتمام اور شان وشوکت کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ بسنت کی تقریبات کی رنگینیاں محمد قلی کے مزاج سے خاص مناسبت رکھتی تھیں اس لیے اس قصیدے میں اس کی تخلیقی صلاحیت اوج پر نظر آتی ہے اس قصیدے میں اس نے دکن کے موسم بہار کی پر کیف ترجمانی کی ہے۔

''باغ محمد شاہی'' محمد قلی کا ایک اہم قصیدہ ہے۔ یہ (16) اشعار پر محتوی ہے۔اس قصیدے کا موضوع محمد قلی کی جدت طرازی اور اختراع پسندی کا مظہر ہے۔ یہ قصیدہ اس نے اپنے لگائے ہوئے باغ کی تعریف میں لکھا ہے جس کا نام ''باغ محمد شاہی'' تھا۔ یہ کوئی خیالی باغ نہیں تھا بلکہ حقیقتاً اس کا وجود تھا۔ یہ ایک نہایت وسیع اور سرسبز وشاداب باغ تھا جو موسیٰ ندی کے کنارے اس علاقے میں پھیلا ہوا تھا جہاں اب شہر حیدرآباد کے گنجان محلے چھتہ بازار میر عالم کی منڈی بارہ دری، دارالشفا، پرانی حویلی اور دیوان دیوڑھی واقع ہیں۔ محمد قلی نے اس قصیدے میں باغ محمد شاہی کی دلکشی و دلفریبی، اس کے درختوں اور پھولوں کی تازگی، میوؤں کی خوش رنگی اور لذت، پرندوں کی نغمہ سرائی غرض یہ کہ باغ سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی والہانہ تعریف وتوصیف کی ہے باغ کے پھلوں کو وہ لعل یاقوت، نیلم، زمرد، مرجان وغیرہ ہیرے جواہرات کے مثل ٹھہراتا ہے۔ خوب صورت تشبیہات، اچھوتے استعاروں اور پر کیف ورنگین اسلوب بیان نے اس قصیدے کی جمالیاتی فضا میں چار چاند لگادیے ہیں۔

موضوعات ومضامین کی کثرت اور تنوع، اسلوب بیان کی سادگی و پرکاری اور دکنی تہذیب ومعاشرت کی ترجمانی جیسے اوصاف کی بدولت محمد قلی قطب شاہ اردو کا سب بڑا قصیدہ گو نہ سہی لیکن منفرد قصیدہ گو کہلانے کے مستحق ضرور ہے۔

14.4 قصیدہ باغ محمد شاہی کا مطالعہ

14.4.1 قصیدہ باغ محمد شاہی (متن):

محمد نانوں تھے بستا محمد کا اے بن سارا
سو طوباں سوں سُہاتا ہے جنت نمنے چمن سارا
دِسے فانوس کے درمیان تھے جوں جوت دیوے کا
سوتیوں دِستا دوالاں میں تھے میویاں کا برن سارا
بہے دم عیسوی دایم چمن میں گل لگانے تیئں
ہرے نہالاں کے جلوے تیئں مشاطا ہوپون سارا
سڑک تھے باغ کوں دیکھت کھلے منج باغ کے غنچے
سو اس غنچے کے باساں تھے لگیا جگ مگمگن سارا
چمن کے پھول کھلتے دیکھ سکیاں کا مُکھ یاد آیا
سُہاتا تھا محمّد پھل نمن ان کا نین سارا
دِسے ناسک کلی چنپا بھواں دوپات ہیں تس کے

بھنور تِل دیکھ اس جاگا ہوا حیراں من سارا
سو خوشے داکھ لاکھاں کے ثریا سُنبلا ہے جوں
سُہے اس داکھ منڈوا سو جیا انبر کہن سارا
اناراں میں سُہے دانے سوجیوں یاقوت پتلیاں میں
ہر اک پھل اس اناراں پر سُہے سکّے نمن سارا
کھجوراں کے دِسے جھونکے کہ جوں مرجان کے پنجے
سپاریاں لعل خوشے جوں دسیں دن ہوررین سارا
دِسیں ناریل کے پھل یوں زمرد مرتباناں جوں
ہور اس کے تاج کوں کہتاہے پیالہ کر دھن سارا
دِسیں جامون کے پھل بن میں نیلم کے نمن سالم
نظر لاگے ناتیوں میویاں کوں راکھیا ہے جتن سارا
صفت کرنے کوں سوسن بی کھلیا ہے دس زباں اپنی
دھن سب سندریاں کے تئیں کھلیا نرگس نمن سارا
چمن آواز سن بلبل اپس میں آپ الاپے ہیں
سوتس آواز سُن حوراں کریں رقصاں اپن سارا
دیکھت رُکھ مست ہو دستک بجاویں پات ہاتاں سوں
سوڈالیاں ڈلتے ہو متوال پین پھول ابرہن سارا
مگر شبنم کامے ہے یا ادھر جل آب کا پیالا
یوبی خوب ہور اوبی خوب تج سوں مل پون سارا
امنگاں آپ امنگاں سوں اپس میں آپ مل ناچیں
تنّنا کا تنن ناچیں ہوئے تن تن تنن سارا

14.4.2 اشعار کی تشریح:

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ''باغ محمد شاہی'' کے حسن ودلکشی پر جو قصیدہ لکھا ہے اس کے اشعار کی تشریح درج ذیل ہے۔اس کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ محمد قلی کس پایہ کا شاعر تھا اور وہ مذہبی شخصیتوں ،عیدوں اور تہواروں کے علاوہ باغ کی شادابی ،درختوں ،پھولوں اور پھلوں پر کس والہانہ انداز سے قصیدہ گوئی کرسکتا ہے۔

محمد قلی کا یہ تمام چمن محمدؐ کے نام کی برکت سے سرسبز وشاداب ہورہا ہے۔اسی وجہ سے اپنے طوبی جیسے درختوں کی بدولت یہ چمن جنت کی

طرح سہانا معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح فانوس کے اندر سے چراغوں کی روشنی خوبصورت نظر آتی ہے اسی طرح دیواروں کے روزنوں سے میووں اور پھولوں کے رنگ جگمگاتے دکھائی دے رہے ہیں۔

پھول کھلانے کے لیے اس چمن کی ہوا دمِ عیسیٰ کا کام کرتی ہے اور سرسبز نہالوں کی خبر مشاطہ کی طرح لوگوں تک پہنچاتی ہے تاکہ لوگ آکر اس باغ کی بہار دیکھیں۔

سڑک سے جب میں باغ کو دیکھتا ہوں تو خوشی سے میرے دل کی کلی کھل جاتی ہے اور اس کی خوشبو سے دنیا مہکنے لگتی ہے۔

چمن میں شگفتہ اور کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر معشوقوں کا چہرہ یاد آتا ہے جن کی آنکھیں محمد پھل کی طرح سیاہ اور خوبصورت ہیں۔

چنپے کی کلی محبوب کی ناک کی طرح نظر آرہی ہے جس کی دو پتیاں دو بھوؤں کی طرح ہیں اور اس پر منڈلاتا ہوا بھونرا تل کی مانند ہے جسے دیکھ کر سب کا دل حیران ہو گیا ہے۔

باغ میں لاکھوں انگوروں کے خوشے ثریا اور سنبلہ (آسمان پر ستاروں کے خاص گچھے) کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور اس انگور کے منڈوے کی تازگی کے سامنے آسمان پرانا نظر آتا ہے۔

اناروں میں سرخ سرخ دانے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے یاقوت، پتلیوں میں اور کھجور کے خوشے مرجان کے پنجوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ سپاری کے لال گچھے دن اور رات کی طرح سیاہ اور سفید نظر آتے ہیں۔

ناریل کے سبز پھل زمرد کے مرتبانوں کی طرح نظر آتے ہیں اور ان کے تاج کو یعنی اوپری خول کو اہل دکن پیالے کی طرح استعمال کرتے ہیں۔

چمن میں جامن کے پھل سالم نیلم کی طرح نظر آتے ہیں۔ ان کو اس لیے رکھا ہے کہ دوسرے میووں کو نظر نہ لگے۔

اس باغ کی تعریف و توصیف کے لیے سوسن نے بھی دس زبانیں کھولی ہیں اور دکن اپنی سب سندریوں اور حسینوں کی وجہ سے نرگس کی طرح بارونق ہو گیا ہے۔

چمن کی بہار اور شادابی کا شہرہ سن کر بلبل سب آپس میں خوشی سے نغمے الاپ رہے ہیں اور ان کی آواز سن کر جنت کی حوریں رقص کر رہی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر درخت مست ہو رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں یعنی پتوں سے تالیاں بجا رہے ہیں۔

ڈالیاں پھولوں کی شراب کی طرح مست کرنے والی خوشبو سے مست ہو کر ڈول رہی ہیں۔ شاید یہ شبنم کی شراب ہے یا کسی کے ہونٹوں کے عرق کا پیالہ۔ یہ بھی خوب ہے اور وہ بھی خوب، لیکن شرط یہ ہے کہ اے محبوب تیرے ساتھ مل کر پینے کا موقع ملے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے اس قصیدے کے مطالعے سے اس زمانے کے باغوں، درختوں، پھلوں اور پھولوں کے متعلق دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس قصیدے سے یہ معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں کہ اس زمانے میں باغوں کے اطراف چار دیواری ہوتی تھی جو زیادہ اونچی نہ ہوتی تھی کیوں کہ ان دیواروں پر سے تمام درخت اور ان کے پھل اور پھول نظر آتے تھے۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ سڑک بنائی جاتی جہاں سے باغ کے مناظر دکھائی دیتے تھے۔ سڑک پھولوں کی خوشبو سے مہکتی رہتی تھی۔ پھولوں میں محمد قلی نے چنپا، سوسن اور نرگس کا خاص ذکر کیا ہے اور پھلوں میں انگور، انار، کھجور، سپاری، ناریل، جامن اور محمد پھل کے نام لیے ہیں۔ انگور اور کھجور کے باغات آج کے زمانے کے حیدرآباد میں نہیں ہیں اور محمد پھل کیا ہوتا تھا آج کوئی نہیں جانتا۔

14.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں۔

☆ اردو شاعری کی اہم صنف قصیدے کا آغاز دکنی زبان میں ہوا۔

☆ بہمنی دور سے تعلق رکھنے والے مشتاق بیدری دکنی کے اوّلین قصیدہ نگار ہیں۔

☆ عادل شاہی حکمرانوں کی سرپرستی میں دکنی ادب کی مختلف اصناف کے ساتھ قصیدے کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔

☆ نصرتی، علی عادل شاہ ثانی شاہی اور ہاشمی عادل شاہی عہد کے اہم قصیدہ نگار شعرا ہیں۔

☆ گولکنڈے میں بھی مثنوی اور غزل کے ساتھ قصیدے کی روایت بھی پروان چڑھتی رہی۔

☆ سلطان محمد قلی قطب شاہ، غواصی، عبداللہ قطب شاہ وغیرہ نے قصیدے لکھے۔

☆ بیجاپور اور گولکنڈے کے زوال کے بعد مغل عہد کے اہم قصیدہ گو شاعر ولی ہیں۔

☆ سلطان محمد قلی قطب شاہ قادر الکلام قصیدہ گو شاعر تھا۔ اس نے مختلف عیدوں، تہواروں اور مذہبی شخصیتوں پر قصیدے لکھے۔ اس کا ایک خوب صورت قصیدہ باغ محمد شاہی ہے۔

☆ دکنی قصائد کے موضوعات میں بڑی رنگا رنگی اور تنوع پایا جاتا ہے۔

14.6 کلیدی الفاظ

الفاظ		معنی	الفاظ		معنی
تیوں	:	اس طرح	رُکھ	:	درخت
امتدادِ زمانہ	:	لمبی مدت	ناؤں	:	نام
جید	:	خوب، کھرا	بن	:	باغ
دسترس	:	پہنچ، قدرت	نمنے	:	مانند
سِن رسیدگی	:	ضعیفی	دوالاں	:	دیواریں
ممدوح	:	جس کی تعریف کی جائے	نہالاں	:	درخت
جاہ وحشم	:	عزت ومرتبت/ شان وشوکت	داکھ	:	انگور
ارضیت	:	زمینی حقائق سے جڑے رہنا	دسیں	:	دکھائی دیں
ادک	:	زیادہ	ادھر	:	ہونٹ

14.7 نمونہ امتحانی سوالات

14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مشتاق بیدری نے کس کی تعریف میں قصیدہ لکھا؟

2۔ اپنے محل حوض اور باغ کی تعریف میں کس نے قصیدہ لکھا؟

3۔ جمیل جالبی کے مطابق قصیدہ گوئی میں کس شاعر کا نام سوداؔ سے پہلے لینا چاہیے؟

4۔ عیدوں اور تہواروں پر کس شاعر نے قصیدے لکھے؟

5۔ مغل صوبے دار ذوالفقار خاں نصرت کی مدح میں کس نے قصیدے لکھے؟

6۔ کلیات شاہی میں قصیدوں کی تعداد کتنی ہے؟

7۔ نصرتی کی رزمیہ شاعری کا نام کیا ہے؟

8۔ غواصی کے مثنویوں کے نام بتائیے۔

9۔ افضل نے کس کی مدح میں قصیدہ لکھا؟

10۔ ولی کے کلیات میں کتنے قصیدے ملتے ہیں؟

14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ لطفی کی قصیدہ گوئی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ ہاشمی کی قصیدہ نگاری کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

3۔ قطب شاہی دور میں قصیدے کی روایت بیان کیجیے۔

4۔ عبداللہ قطب شاہ کے قصیدوں کے موضوعات بیان کیجیے۔

5۔ غواصی کی قصیدہ گوئی پر تبصرہ کیجیے۔

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی قصیدہ گوئی کا تنقیدی محاکمہ کیجیے۔

2۔ نصرتی کی قصیدہ نگاری کی امتیازی خصوصیات اجاگر کیجیے۔

3۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

14.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی

2۔ تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) — ڈاکٹر جمیل جالبی

3۔ دکنی ادب میں قصیدہ کی روایت — ڈاکٹر سیدہ جعفر

4۔ مضمون ''دکنی قصائد'' از ڈاکٹر ثمینہ شوکت، مشمولہ مجلّہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر 64-1963

بلاک IV: دکنی نثر کا مطالعہ

اکائی 15: دکنی نثر کا آغاز وارتقا

(اہم نثر نگار: برہان الدین جانم، وجہی، امین الدین اعلیٰ، میراں جی خدانما)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 بہمنی دور میں دکنی نثر

15.3 عادل شاہی دور میں دکنی نثر کا آغاز وارتقا

15.4 قطب شاہی دور میں دکنی نثر کا ارتقا

15.5 ارکاٹ میں دکنی نثر کا ارتقا

15.6 سلطنتِ خداداد میسور میں دکنی نثر

15.7 فورٹ سینٹ جارج کالج کی نثری خدمات

15.8 اکتسابی نتائج

15.9 کلیدی الفاظ

15.10 نمونۂ امتحانی سوالات

15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو میں تخلیق ادب کا باقاعدہ آغاز دکنی زبان میں ہوا۔ دکنی میں اولین ادبی سرمایہ منظومات کی شکل میں ملتا ہے۔ نثری تخلیقات کا سلسلہ بعد میں شروع ہوا۔ ویسے بھی اردو ادب کا دکنی دور بنیادی طور پر شاعری کا دور ہے نثر کا نہیں۔ دکنی دور میں نثر میں جو

کتابیں اور رسائل لکھے گئے وہ تعداد اور معیار دونوں اعتبارات سے شاعری کے مقابلے میں کم تر ہیں۔ دکنی نثر کے آغاز وارتقا کا مطالعہ کرتے وقت یہ دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ دکنی زبان میں نثر کا ذخیرہ محدود ہے دوسرے یہ کہ اس محدود ذخیرے میں موجود تصانیف کے موضوعات بھی محدود ہیں۔ بیشتر کتب و رسائل تصوف کے موضوع پر لکھے گئے ہیں اور مواد و مسائل کے اعتبار سے یہ رسائل نہایت ادق ہیں۔ اس اکائی میں ہم دکنی زبان میں نثری ادب کے آغاز، مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں دکنی نثر کے ارتقا میں حصہ لینے والے ادیبوں کی خدمات کا مطالعہ کریں گے۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ بہمنی دور میں دکنی نثر کی صورت حال پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ بہمنی دور کے مصنفوں سے منسوب دکنی کے نثری رسالوں کے بارے میں عام غلط فہمیوں کو دور کرسکیں۔
- ☆ عادل شاہی دور میں دکنی نثر کے آغاز اور دکنی کے پہلے نثری رسالے کا تعارف کراسکیں۔
- ☆ عادل شاہی دور کے نثر نگاروں کی خدمات کا جائزہ لے سکیں۔
- ☆ قطب شاہی دور میں دکنی نثر کے ارتقا پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ سب رس کی اہمیت کو واضح کرسکیں۔
- ☆ دکنی نثر کے ارتقا میں فورٹ سینٹ جارج کالج کے مصنفین کی خدمات پر اظہار خیال کرسکیں۔

15.2 بہمنی دور میں دکنی نثر

دکن میں بہمنی سلطنت کا قیام 1347ء میں عمل میں آیا اور خاتمہ 1527ء میں ہوا۔ بہمنی خاندان کے اکثر حکمرانوں کو فنونِ لطیفہ اور شعر وادب سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے علما و فضلا، شعرا و ادبا اور ارباب کمال کی بڑی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے دکن میں علوم وفنون کے ساتھ شعر وادب کو بھی نہایت فروغ حاصل ہوا۔ بہمنی سلاطین نے ایک خاص حکمتِ عملی کے تحت ایرانی و عجمی روایات کے ساتھ مقامی روایات اور دکن کی ثقافت کو بھی بڑھاوا دیا۔ ان کے عہد میں فارسی کے ساتھ دکنی زبان اور شعر وادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ دکنی زبان میں شاعری کا آغاز اسی دور میں ہوا۔ بہمنی دور کے شعرا مثلاً نظامی، اشرف بیابانی، قریشی بیدری وغیرہ کی شاعری کے مستند نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ لیکن جہاں تک نثر کا تعلق ہے بہمنی دور کے کسی ادیب کی نثری تخلیق ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ بعض تاریخ نویسوں نے بہمنی دور سے تعلق رکھنے والے بعض صوفیائے کرام کے نثری رسائل کا ذکر کیا ہے لیکن ان کا ٹھوس ثبوت پیش کرنے سے وہ قاصر ہیں۔ ذیل میں ان صوفیا کی تفصیل دی گئی ہے جن کے نثری رسائل کا ذکر ملتا ہے، لیکن رسائل مفقود ہیں۔

حضرت عین الدین گنج العلم: شیخ عین الدین گنج العلم دکن میں ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ وہ 1306ء مطابق 706 ہجری میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد گجرات اور دولت آباد سے ہوتے ہوئے 776ء میں بیجاپور آئے۔ انہوں نے سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ سے سلطان محمد شاہ ثانی تک پانچ بہمنی سلاطین کا زمانہ دیکھا۔ 1392ء مطابق 795 ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ شیخ عین الدین گنج العلم بہت بڑے عالم اور صوفی تھے۔ انہوں نے علوم متداولہ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ بعض تذکروں میں ان کی تعداد (132) بتائی گئی ہے۔ حکیم شمس اللہ

قادری اپنی کتاب 'اردوئے قدیم' میں لکھتے ہیں:

'' آپ نے چھوٹے چھوٹے کئی رسالے دکھنی زبان میں تصنیف کیے تھے۔من جملہ ان کے تین رسالے ایک مجموعہ میں کالج قلعہ سینٹ جارج کے کتب خانے میں موجود تھے۔ان کے اوراق کی مجموعی تعداد چالیس تھی اوران میں فرائض وسنن کے متعلق احکام ومسائل تحریر تھے۔(اردوئے قدیم،حیدرآباد،2015ء،ص40,41)''

دکن میں اردونثر کی ابتدا کے بارے میں جتنے علمانے لکھا ہے وہ حکیم شمس اللہ قادری کی روایت کو دہراتے رہے ہیں۔جب کہ حکیم صاحب کے بیان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ رسائل نثر میں تھے یا منظوم۔دوسرے یہ کہ ان رسائل کو حکیم صاحب کے سوا کسی محقق نے نہیں دیکھا کیونکہ اب یہ رسائل مفقود ہیں،ان کا پتہ نہیں چلتا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ: حضرت گیسودرازؒ 1321ء مطابق 721 ہجری میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے والد سید یوسف حسینی المعروف بہ شاہ راجو قتال سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی سے دولت آباد آئے۔ اس وقت حضرت گیسو دراز کی عمر 4 سال تھی۔شاہ راجو کے انتقال 795 ہجری کے بعد وہ اپنی والدہ کے ساتھ دہلی واپس چلے گئے۔انہوں نے حضرت نصیرالدین چراغ دہلی سے بیعت کی۔ہندوستان پر تیمور کے حملے کی شورش میں وہ 1398ء میں دہلی سے نکلے اور مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے 815 ہجری میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں گلبرگہ آئے اور یہاں طویل مدت تک تبلیغی اور دعوتی خدمت انجام دینے کے بعد 1421ء بمطابق 825 ہجری میں انتقال فرمایا۔خواجہ صاحب کثیر التصانیف واقع ہوئے ہیں۔'سیرت بندہ نواز' کے مصنف سید عطا حسین لکھتے ہیں:

''عام طور پر مشہور ہے کہ ان کی عمر ایک سو پانچ کی تھی اور ان کی تصانیف کی تعداد بھی ایک سو پانچ ہے۔''(سیرت بندہ نواز،ص16،بحوالہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،اردونثر کا آغاز اور ارتقا،ص79)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی تصنیف 'اردونثر کا آغاز وارتقا' میں خواجہ صاحب کی 11 اردو تصانیف کے نام دیے ہیں۔ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اپنے مرتبہ ''شکارنامہ'' کے مقدمہ میں حضرت گیسودراز کے 16 اردو رسائل کا ذکر کیا ہے۔ڈاکٹر الف۔د۔نسیم نے 'تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند' میں حضرت گیسودراز کی (9) اردو کتب کا ذکر کیا ہے۔پروفیسر عبدالقادر سروری نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں حضرت گیسودراز کے دس (10) رسائل سے بحث کی ہے۔خواجہ صاحب کے مرید ومعتقد سید محمد علی سامانی نے سیر محمدی کے نام سے خواجہ صاحب کی سوانح لکھی۔اس میں اس نے خواجہ صاحب کی چھتیس (36) عربی اور فارسی تصانیف کا ذکر کیا ہے لیکن اردو کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا۔اسی طرح خواجہ صاحب کے قریبی زمانے کے مصنف عبدالعزیز بن شیر ملک نے ''تاریخ حبیبی وتذکرہ مرشدی'' کے نام سے خواجہ صاحب کی سوانح لکھی۔اس نے ان کے کسی اردو رسالے کا ذکر نہیں کیا۔دکنی کے بیشتر محققین مثلاً ڈاکٹر زور،اکبرالدین صدیقی،ڈاکٹر جمیل جالبی،عبدالقادر سروری،مولوی عبدالحق وغیرہ نے جہاں خواجہ صاحب کے اردو رسائل کا ذکر کیا ہے وہیں ان کے خواجہ صاحب کی تصنیف ہونے کے بارے میں شک وشبہ کا بھی اظہار کیا ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے 1924ء میں 'معراج العاشقین' کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی اور اسے حضرت گیسودراز کی تصنیف قرار دیا۔برسوں تک یہ کتاب حضرت گیسودراز کی تصنیف اور اردو میں نثر کی پہلی کتاب کی حیثیت سے مشہور رہی لیکن 1968 میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے معراج العاشقین کا مصنف کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے تحقیق اور دلائل سے یہ ثابت کیا کہ 'معراج العاشقین'

حضرت گیسودراز کی تصنیف نہیں ہے بلکہ گیسودراز کے بہت بعد کے صوفی سید مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے، جو سید شاہ امین الدین اعلیٰ کے سگڑ پوتے حسینی پیر کا مرید تھا اور اس کا زمانہ اٹھارویں صدی کا ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل کی اس تحقیق کے بعد اب عام طور سے یہ مان لیا گیا ہے کہ معراج العاشقین حضرت گیسودراز کی تصنیف نہیں ہے اس لیے یہ اردو کا پہلا نثری رسالہ بھی نہیں ہے۔

دکنی محققین کے مطابق دکنی زبان میں حضرت گیسودراز سے منسوب جتنے نثری رسائل ہیں جیسے معراج العاشقین، ہدایت نامہ، سہ بارہ، در الاسرار، شکار نامہ، تلاوت الوجود، ہفت اسرار، تمثیل نامہ، خلاصہ توحید، رسالہ شرح کلمہ طیبہ وغیرہ حضرت گیسودراز کی تصنیف نہیں ہیں۔ ان میں بیشتر رسائل کے اصل مصنفین کے نام معلوم ہو چکے ہیں اس لیے انھیں حضرت گیسودراز کی تصنیف قرار دینا غلط ہے۔

سید عبداللہ حسینی: شمس اللہ قادری نے انہیں حضرت خواجہ بندہ نواز کا نبیرہ قرار دیا ہے۔ (اردوئے قدیم، ص 42) ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے میں انہیں خواجہ صاحب کا پوتا بتایا ہے۔ لیکن 'سیر محمدی' میں حضرت گیسودراز کا جو شجرہ دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید عبداللہ حسینی، خواجہ صاحب کی نواسی کے شوہر تھے۔ عبداللہ حسینی سلطان احمد شاہ ثانی (838ھ تا 862ھ) کے زمانے میں گزرے ہیں۔ انہوں نے شیخ عبدالقادر جیلانی کے رسالے ''نشاط عشق'' کا دکنی میں ترجمہ کیا تھا اور اس کی شرح لکھی تھی۔ اس کا ایک نفیس نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں موجود تھا۔ اسٹیوارٹ نے ٹیپو سلطان کے کتب خانے کی جو فہرست مرتب کی اس میں اس کا ذکر موجود ہے لیکن اب یہ رسالہ ناپید ہے۔ اس کا کوئی نسخہ ہندوستان یا یورپ کے کسی کتب خانے میں نہیں ملتا۔

اس طرح بہمنی عہد میں دکنی نثر کے آغاز و ارتقا کی مبہم اور غیر واضح تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس دور کے بعض رسائل کے نام ملتے ہیں لیکن رسائل موجود نہیں ہیں۔ کچھ رسائل موجود ہیں لیکن مصنفین سے ان کا انتساب درست نہیں۔ جب تک اس دور کے کسی مصنف کا مستند نثری رسالہ دستیاب نہ ہو اس وقت تک بہمنی دور میں دکنی نثر کے آغاز و ارتقا کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔

15.3 عادل شاہی دور میں دکنی نثر کا آغاز و ارتقا

پندرھویں صدی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی سلطنت زوال کا شکار ہوگئی تو اس سلطنت کے پانچوں صوبے خود مختار ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں گولکنڈہ میں قطب شاہی' بیجاپور میں عادل شاہی' برار میں عماد شاہی' بیدر میں برید شاہی اور احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔

عادل شاہی سلطنت کے بانی یوسف عادل شاہ نے 1490ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور بیجاپور کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ اس خاندان کے 9 حکمرانوں نے تقریباً 200 برس تک بیجاپور پر حکومت کی۔ ان کے عہد میں بیجاپور نے بڑی ترقی کی۔ دور دراز ممالک سے علما' فضلا اور اہلِ ہنر بیجاپور آتے اور شاہی سرپرستی سے مالا مال ہوتے۔ عادل شاہی دور میں دکنی زبان اور شعر و ادب نے بھی بڑی ترقی کی۔ اس خاندان کے بعض حکمران خود بھی دکنی زبان میں شاعری کرتے تھے' جیسے ابراہیم عادل شاہ ثانی' علی عادل شاہ ثانی وغیرہ۔ ذیل میں ہم عادل شاہی عہد کے نثر نگاروں اور ان کی نثری تخلیقات کا جائزہ لیں گے۔

حضرت میراں جی شمس العشاق: میراں جی شمس العشاق' بیجاپور کے بہت بڑے صوفی اور روحانی پیشوا تھے۔ میراں جی شمس العشاق نے مدینہ منورہ میں 12 برس تک قیام کیا۔ پھر غیبی اشارے پر ہندوستان آئے۔ میراں جی' کمال الدین بیابانی کے مرید و خلیفہ تھے۔ کمال

الدین کے پیرومرشد شاہ جمال الدین مغربی تھے جو حضرت گیسو درازؒ کے خلیفہ تھے۔اس طرح میراں جی کا سلسلۂ طریقت دو واسطوں کے بعد حضرت گیسو درازؒ سے جا ملتا ہے۔

میراں جی شمس العشاق نے مریدوں اور طالبوں کی تعلیم و تربیت کے لیے متعدد منظوم رسالے لکھے جیسے خوش نامہ، خوش نغز، شہادت التحقیق، مغزمرغوب، چہار شہادت، وصیت النور وغیرہ دکنی زبان میں میراں جی کی کوئی مصدقہ نثری تصنیف نہیں ملتی۔البتہ بعض نثری رسائل ان سے منسوب ہیں جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

جل ترنگ اور گل باس: شمس اللہ قادری نے اردوے قدیم میں ان رسایل کا ذکر کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''حضرت میراں جی شمس العشاق نے بھی نثر اردو میں کئی رسالے لکھے ہیں۔منجملہ ان کے دو رسالے ہم نے بھی دیکھے ہیں۔ایک کا نام جل ترنگ اور دوسرے کا گل باس ہے۔یہ چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں اور شاہ صاحب نے ان میں تصوف کے اسرار و نکات تمثیل کے پیرائے میں بیان کیے ہیں۔(اردوے قدیم۔ص 116) یہ رسالے اب ناپید ہیں۔انہیں حکیم صاحب کے علاوہ کسی محقق نے نہیں دیکھا۔اس لیے انہیں میراں جی سے منسوب کرنا تحقیقی حزم و احتیاط کے خلاف ہے۔

شرح مرغوب القلوب: سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے اس رسالے کو میراں جی شمس العشاق کی تصنیف قرار دیا (بحوالہ مضمون شاہ میراں جی شمس العشاق رسالہ اردو۔جولائی 1927ء) لیکن شمس اللہ قادری نے اس کی تردید کی اور بتایا کہ انہوں نے ڈاکٹر محمد قاسم ماہر سمیات کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ دیکھا جس کے خاتمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ میراں جی شمس العشاق کی نہیں بلکہ میراں جی خدانما کی تصنیف ہے جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔(اردوے قدیم۔دوسرا حصہ۔ص 233) مولوی عبدالحق کے علاوہ ڈاکٹر زور (اردو شہ پارے۔ص 26) اور ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص 216) بھی اسے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف سمجھتے ہیں۔لیکن فی الحقیقت یہ ان کی تصنیف نہیں ہے بلکہ میراں جی خدانما کی تصنیف جو شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید اور خلیفہ تھے۔

سب رس: کتب خانہ سالار جنگ میں ''سب رس'' کے نام سے ایک مخطوطہ ہے جس کے آغاز میں کاتب نے لکھا ہے'' کلام میراں جی شمس العشاق کہ کلام شاہ وجیہ الدین رابزبان دکنی ترجمہ نمودہ اند۔'' تمت الکتاب میں لکھا ہے۔''سب رس تصنیف میراں جی شمس العشاق'' اس فقرے سے غلط فہمی کا شکار ہو کر ڈاکٹر زور (اردو شہ پارے ص 26) اور ان کی تقلید میں نصیر الدین ہاشمی (فہرست سالار جنگ صفحہ 172) نے اسے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف قرار دیا۔ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اسے شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کی تصنیف بتاتی ہیں۔ (اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص 147) اس کتاب کا ایک مخطوطہ بمبئی یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی ہے۔اس کتب خانہ کے عربی اور فارسی مخطوطات کی وضاحتی فہرست (جو انگریزی میں شائع ہوئی ہے) کے مرتب عبدالقادر سرفراز نے اس کا نام تاج الحقائق بتایا اور اسے وجہی کی تصنیف قرار دیا۔بعد میں عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اس رسالے کا نام تاج الحقائق ہے اور یہ وجہی کی تصنیف ہے۔اس طرح میراں جی شمس العشاق سے اس کا انتساب کاتب کا سہو قرار پایا۔

سبع صفات: انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانہ میں پانچ صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے جو ''سبع صفات'' کے نام سے موسوم ہے۔اس کے سرورق پر

’’میراں جی‘‘ کا نام لکھا ہے۔اس بنیاد پر ڈاکٹر نذیر احمد نے اسے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف قرار دیا ہے۔(علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص 217) ڈاکٹر محمد ہاشم علی نے تحقیق سے ثابت کیا کہ رسالہ سبع صفات کو دو اور ناموں مرأت الانسان اور خلاصۃ الرویت کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے اور یہ میراں جی شمس العشاق کی نہیں بلکہ سید عبدالقادر میراں شاہ ولی اللہ منزوی الجبلین کی تصنیف ہے۔

اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ میراں جی شمس العشاق کے منظوم رسائل تو مصدقہ ہیں لیکن ان سے دکنی نثر کے کسی رسالہ کا انتساب ثابت نہیں ہوتا۔

شاہ برہان الدین جانم: جانم، میراں جی شمس العشاق کے مرید اور خلیفہ تھے۔ان کا سنہ ولادت نامعلوم ہے۔ڈاکٹر زور نے قیاساً 950ہجری کو شاہ برہان کا سالِ ولادت قرار دیا ہے۔(تذکرہ مخطوطات اردو جلد 5۔ص 54) ان کے سالِ وفات میں بھی اختلاف ہے۔ڈاکٹر حسینی شاہد نے ان کا سالِ وفات 1007ھ متعین کیا ہے۔(سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے، حیدرآباد 173۔ص 113) برہان الدین جانم دکنی زبان کے بلند پایہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی کتاب ’’اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء‘‘ میں اکبرالدین صدیقی نے اپنے مرتبہ ’’ارشاد نامہ‘‘ کے مقدمہ میں اور ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں جانم کی نثری تصانیف کے نام دیے ہیں۔ان میں بعض ناموں ک میں اختلاف پایا جاتا ہے۔تینوں کی ملی جلی فہرست درج ذیل ہے۔

1۔کلمۃ الحقائق	2۔مقصود ابتدائی	3۔ارشاد نامہ نثر	4۔ذکر جلی	5۔کلمۃ الاسرار
6۔معرفت القلوب	7۔ہشت مسائل	8۔رسالہ تصوف	9۔مجموعۃ الاشیا	10۔ذکر جلی ارشاد نامہ

لیکن یہ تمام رسائل برہان الدین جانم کی تصنیف نہیں ہیں۔صرف کلمۃ الحقائق کے بارے میں وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ جانم کی تصنیف ہے۔مقصود ابتدائی اور ارشاد نامہ نثر کے بھی جانم کی تصانیف ہونے کے دلائل موجود ہیں۔باقی رسائل میں بعض جانم کے فرزند امین الدین اعلیٰ کی تصنیف ہیں اور بعض گمنام مصنفین کی۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد اول میں برہان الدین جانم کی نثری تصانیف میں رسالہ وجودیہ کو بھی شامل کیا ہے جبکہ فی الحقیقت یہ رسالہ جانم کی نہیں بلکہ ان کے فرزند امین الدین اعلیٰ کی تصنیف ہے۔

مقصود ابتدائی کا موضوع تصوف و طریقت کے مسائل ہیں جن کی تشریح سوال و جواب کے پیرائے میں کی گئی ہے۔ارشاد نامہ نثر پانچ ذیلی رسائل پر مبنی ہے جن میں ذکر جلی۔ذکر قلبی، ذکر روحی، ذکر سری اور ذکر خفی کی وضاحت کی گئی ہے۔

دکنی نثر کی تاریخ میں جانم کا سب سے اہم کارنامہ ’’کلمۃ الحقائق‘‘ ہے جو دکنی زبان میں نثر کا پہلا رسالہ ہے۔اس کا سنہ تصنیف نامعلوم ہے،لیکن اندازہ لگایا گیا ہے کہ جانم نے یہ رسالہ ’’ارشاد نامہ‘‘ کے بعد لکھا کیونکہ اس میں کئی مقامات پر ارشاد نامہ کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔علاوہ ازیں اس کے ابتدائی حصہ میں اندرونی صفحات پر ارشاد نامہ کے اشعار کو نثر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔چونکہ ارشاد نامہ کا سنہ تصنیف 990ھ ہے، اس لیے کلمۃ الحقائق 990ھ کے بعد اور جانم کی وفات 1007ھ کے درمیانی دور کی تصنیف قرار پاتی ہے۔کلمۃ الحقائق میں تصوف و طریقت کے کچھ مسائل بیان کیے گئے ہیں۔اس میں قدیم منطق و فلسفہ کے ان موضوعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن پر زمانہ قدیم سے بحث ہوتی رہی ہے۔مثلاً خدا کی ذات وصفات، قدیم وحادث، ابتداء وانتہا، خدا تھا تو کیوں تھا، کہاں تھا؟ بے چون وچگون تھا؟ اسی طرح قدرت کیا ہے؟ قدرت وخدا میں کیا فرق ہے؟ تقدیر وتدبیر سے کیا مراد ہے؟ نفس کی قسمیں، خیر وشر، راہِ سلوک، راہِ شریعت، منزل ناسوت اور منزل ملکوت کے مسائل پر بھی

روشنی ڈالی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ وجود کی کتنی قسمیں ہیں اور ان کے کیا معنی ہیں؟ مرشد کی کیا اہمیت ہے؟ یہ اور اسی قسم کے موضوعات پر سوال و جواب کے انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مرید سوال پوچھتا ہے' مرشد جواب دیتا ہے۔

ارشادنامہ کی طرح کلمۃ الحقائق میں بھی جانم نے اپنی زبان کو'' گجری'' کہا ہے۔کلمۃ الحقائق میں لکھتے ہیں:'' یوزبان گجری' نام ایں کتاب کلمۃ الحقائق''۔کلمۃ الحقائق کی زبان پر گجراتی' مرہٹی اور ہندی کے واضح اثرات پائے جاتے ہیں۔کلمۃ الحقائق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے سامنے اردو نثر کا کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اسے اردو جملے بنانے میں دِقت ہو رہی ہے' اس لیے وہ اردو لکھتے لکھتے فارسی لکھنے لگتا ہے۔ کبھی ایک جملہ اردو اور دوسرا فارسی تو کبھی آدھا جملہ اردو اور آدھا فارسی۔ رسالے کے آخری چند صفحات تو پوری طرح فارسی میں ہیں۔ مجموعی طور پر کلمۃ الحقائق کی نثر اکھڑی اکھڑی اور ناہموار ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جانم کے عہد میں جو دکنی زبان رائج تھی' اس میں ابھی اتنی وسعت اور استعداد پیدا نہیں ہوئی تھی کہ اس میں تصوف' فلسفہ اور منطق کے پیچیدہ مسائل بیان کیے جاسکیں۔ ذیل میں کلمۃ الحقائق کی نثر کا نمونہ دیا گیا ہے' جس سے اس رسالے کے موضوع' زبان اور اسلوب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

> '' اللہ کرے سو ہوے کہ قادر' توانا' قوی کہ او قدیم القدیم ہے۔ اس قدیم کا بھی کرنہار۔ سہج سہج سو تیرا ٹھار۔ و سہج ہوا بھی تو چ تھے بار۔ جدھاں کچھ نہ تھا' بھی تھا تہیں' دو جا شریک کوئی نہیں۔ ایسا حال' سمجنا خدا تھے خدا کوں۔ جس پر کرم خدا کا ہوئے۔ سب یو زبان گجری (زبان) نام ایں کتاب'' کلمۃ الحقائق'' خلاصہ بیان و تجلی عیاں روشن شود۔ انشاء اللہ تعالیٰ کہ خدائے تعالیٰ قدیم القدیم کیوں تھا۔ ذات و صفات و کل مخلوقات ابتداء و انتہاء' باقی و فانی' قدیم و جدید' باہمہ و بے ہمہ' بدیں سبب سوال و جواب روشن کر دیکھلایا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کہ خدائے تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ۔ خدائے تعالیٰ کی نظر ادراک کرن ہاری ہے۔ جملہ مخلوقات پر کہ وہاں ہماری نظر نہیں۔ انپڑ نہاری ہے۔''

(برہان الدین جانم' کلمۃ الحقائق' مرتبہ اکبرالدین صدیقی' حیدرآباد 1961ء' ص 26-21)

محمود خوش دہاں: محمود خوش دہاں بیجاپور کے مشہور صوفی شاہ ابوالحسن قادری (مصنف سکھ انجمن) کے بھانجے تھے۔ ان کے والد کا نام شیخ داؤد قریشی تھا۔ جانم کے علاوہ انہیں اپنے ماموں شاہ ابوالحسن قادری سے بھی خلافت حاصل تھی۔ خوش دہاں سے فارسی اور دکنی زبان میں متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ دکنی زبان میں ان کی چند مختصر مثنویاں ملتی ہیں۔ فارسی نثر میں ان کا سب سے اہم کارنامہ رسالہ'' معرفت السلوک'' ہے۔ اس میں انہوں نے جانم کے فلسفہ وجود اور صوفیانہ تعلیمات کو نہایت وضاحت اور دلائل کے ساتھ لکھا ہے۔ دکنی زبان میں بھی تصوف کے موضوع پر ان کا ایک نثری رسالہ ملتا ہے جسے حمیدالدین شاہد نے'' رسالہ محمود خوش دہاں بیجاپوری'' کے نام سے مرتب و شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول'' اس رسالہ کے موضوعات وہی ہیں جو جانم کے کلمۃ الحقائق میں ملتے ہیں۔ سوالوں میں بھی یکسانیت ہے اور جوابات کی روح بھی ایک ہے۔ فرق یہ ہے کہ خوش دہاں نے اختصار سے کام لیا ہے اور کئی کئی سوالوں کو یکجا کر کے ان کے جواب ایک ساتھ دیئے ہیں۔ (بحوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو' جلد اول' دہلی 2013' ص 233) اس رسالہ کے مرتب خواجہ حمیدالدین شاہد نے قیاس کیا ہے کہ یہ رسالہ 1591ء کے لگ بھگ تحریر کیا گیا ہوگا (رسالہ محمود خوش دہاں۔ص 21)۔

اس رسالہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جانم کے مقابلہ میں خوش دہاں کی نثر صاف اور ہموار ہے۔ اس میں گنجلک پن نہیں۔ دکنی جملوں میں فارسی کی پیوندکاری جو جانم کے یہاں بکثرت نظر آتی ہے خوش دہاں کے رسالے میں نہیں ہے۔ خوش دہاں کے یہاں جملے کی بناوٹ اور لفظوں کی ترتیب میں باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ جانم کی نثر میں اس طرح کی باضابطگی بہت کم ہے۔ خوش دہاں کے رسالے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنی نثر ترقی کی طرف گامزن ہے اور اس نے کسی حد تک اپنا راستہ مقرر کرلیا ہے۔ نمونہ دیکھیے۔

سوال: اگر کوئی تجہ کوں پوچھیں کہ نفس سو کیا' دل سو کیا' روح سو کیا' نور سو کیا ہے؟

جواب: نفس سو منگتا پنا و خطرہ' دل سو جانتا پنا و رحمانی فعلاں' و روح سو بینائی یعنی دیکتا پنا' نور سو شاہدی یعنی سمجھتا پنا ہے۔

سوال: نفس کا' دل کا' روح کا فعل سو کیا' وصف سو کیا' وذات سو کیا؟

جواب: نفس کا فعل سو برے عملاں' اس کا صفت سو خدا کوں نا سمجھ کرے۔ اُس کا ذات سو خدا سوں منہ پھرانا' و دل کا عمل سو خوب عملاں کرنا' وصفت سو خدا کوں سمجھنا۔ وذات سو خدا طرف توجہ کرنا۔ و روح کا فعل سو خدا کوں دیکھنا وصفت سو ذوق شوق دھرنا و ذات سو خدا دیکھنا۔

(رسالہ محمود خوش دہاں بیجاپوری۔ مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد۔ کراچی' سنہ ندارد۔ ص 27-24)

امین الدین اعلیٰ: امین الدین اعلیٰ بیجاپور کے مشہور صوفی شاہ برہان الدین جانم کے فرزند اور میراں جی شمس العشاق کے پوتے تھے۔ وہ 1007ھ میں پیدا ہوئے۔ (بحوالہ ڈاکٹر حسینی شاہد' سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ حیدرآباد 1973ء۔ ص 119)۔ امین الدین اعلیٰ کو محمود خوش دہاں سے بیعت وخلافت حاصل تھی۔ ہزاروں لوگ ان کے مرید و معتقد تھے۔ امین الدین اعلیٰ نے اپنے مریدوں اور طالبوں کی تعلیم و تربیت اور ہدایت و تلقین کے لیے دکنی زبان میں متعدد منظوم اور نثری رسالے تحریر کیے۔ ن کے نام یہ ہیں:

(1) گنج مخفی (2) وجودیہ (3) گفتار شاہ امین (4) ارشادات (5) ظاہر و باطن

(6) بیان کرتے ہیں سجدیاں کا (7) کلمۃ الاسرار

رسالہ گنج مخفی شاہ امین کا اہم رسالہ ہے۔ اس میں انہوں نے گنج مخفی سے لے کر شہادت تک تنزلات کے مختلف مدارج کی وضاحت کی ہے۔ اعلیٰ نے ہر مرتبہ کے لیے خاص اصطلاحیں بھی وضع کی ہیں۔ اس رسالہ کی اصطلاحوں کو نو بطون کے نام سے بڑی مقبولیت حاصل ہے اور اس سے اخذ و استفادہ کر کے دکنی میں کئی رسائل لکھے گئے۔

رسالہ وجودیہ میں مسائل وجود سے بحث کی گئی ہے جو امین الدین اعلیٰ کا مرغوب موضوع ہے۔ اس موضوع پر وجودیہ ہی کے نام سے ان کا ایک منظوم رسالہ بھی ملتا ہے۔ اس میں انہوں نے ممکن الوجود سے عارف الوجود تک ہر مرتبہ وجود کے موکل' روح' قلب' نفس' فہم' توحید' راہ' ذکر' منزل' شہادت اور شغل کی تفصیلی وضاحت کی ہے۔

رسالہ گفتار شاہ امین کا موضوع رسالہ وجودیہ سے مماثلت رکھتا ہے۔ رسالہ ارشادات میں نفس امارہ اور دل کی کشمکش کے نازک مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ رسالہ ظاہر و باطن میں تصوف و طریقت سے متعلق عام معلومات سوال جواب کے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ رسالہ بیان کرتے ہیں سجدیاں میں سجدہ تحیت (تعظیمی) کی بحث ہے۔

نثر میں امین الدین اعلیٰ کا اصل کارنامہ رسالہ کلمۃ الاسرار ہے جو ان کا سب سے طویل رسالہ ہے۔ اس رسالہ میں انہوں نے کلمۂ طیبہ اور

نورِ محمدی کی تشریح سیدھے سادے انداز میں کی ہے اور اپنی دیگر تصانیف کے برخلاف اس میں اپنے مخصوص نظام تصوف اور پانچ عناصر پچیس گن کے علاوہ اپنی اختراع کی ہوئی دیگر اصطلاحوں کا استعمال نہیں کیا ہے۔

کلمۃ الاسرار کی زبان گیارہویں صدی ہجری کی دکنی زبان ہے لیکن کلمۃ الحقائق کے مقابلہ میں صاف ہے۔کلمۃ الحقائق کی طرح اس میں فارسی فقروں اور فارسی جملوں سے مدد نہیں لی گئی ہے بلکہ اپنے دور کی سلیس اور شستہ دکنی استعمال کی گئی ہے۔شاہ امین نے کلمۃ الاسرار میں ادبی اسلوب اختیار کیا ہے۔اس کے فقروں اور جملوں میں چستی و روانی اور عبارت میں شگفتگی و زورِ بیان کا احساس ہوتا ہے۔شاہ امین نے معنی و مطالب کی وضاحت کے لیے قرآنی آیات، احادیث قدسی، احادیثِ رسولؐ اور فارسی اشعار کا برجستہ اور برمحل استعمال کیا ہے۔اپنی بات کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے وہ جگہ جگہ دلکش تشبیہوں، مثالوں، کہاوتوں اور دلچسپ حکایتوں سے بھی مدد لیتے ہیں جس کی وجہ سے اس رسالے میں ادبی شان پیدا ہوگئی ہے۔عبارت کا نمونہ دیکھیے۔

"نقل ہے مچھلیاں نے اپس میں پانی میچ اچھ کر فکراں کیاں کہ لوگاں کہتے ہیں کہ مچھلیوں کا جیومول سو پانی ہے، ہور ہمیں تو پانی کیا ہے کر دیکھیاں نئیں۔ پانی کوں دیکھنا کہ پانی کیا ہے ہور پانی ہمارے سوں کیتک دور ہے۔کدھر ہے۔اپس میں اپیں بہوت فکراں کیاں ہور پانی کوں بہوت دھونڈیاں، ولیکن پانی اونوں کوں نئیں دستا۔پچھیں اُنوں میں سوں ایک مچھلی بولی کی پانی ہمنا کوں دِس آئے گا، چلو فلانی بڑی مچھلی کے پاس، او ہمنا کوں پانی بتلائیں گی، ہور پانی کہاں ہے کیتک دور ہے سو دِکھلائیں گی۔تب اس بڑی مچھلی پاس اوسب مل کر گیاں ہور اپنی حقیقت بیان وار کھیاں کی تو سب مچھلیاں سوں بڑی ہور ہم سب مچھلیاں کی سردار ہے۔ تجھے پانی معلوم اچھے گا ہور توں پانی کوں دیکھی اچھے گی، تو خدا واسطے پانی ہمنا کوں دیکھلا۔ کس واسطے کہ لوگاں کہتے ہیں کہ پانی مچھلیاں کا ٹھاؤ ٹھکان ہے ہور پانی مچھلیاں کا جیومول۔ہور مچھلیاں ہمیشہ پانی میچ رہتیاں ہیں۔ہور پانی نہ ہوئے تو مچھلیاں تڑپڑا مر جاتیاں ہیں۔ہمیں تو پانی کیا ہے کر دیکھیاں نہیں ہور یو بات کیا کہ اپنے جیومول کوں نادیکھنا ہور جس مکان میں رہتے سہتے ہیں، اس مکان کوں نا جاننا بڑی بے وقوفی ہور، احمقی ہور، نادانی ہے بلکہ جو کوئی اپنے جیون مول کوں نا پیچانے تو اس پر کھانا پینا حرام ہے۔ہور سب زندگی اس کی مردار ہے۔" (کلمۃ الاسرار۔مرتبہ ڈاکٹر حمیرہ جلیلی۔حیدرآباد 1979ء۔ص 64-62)۔

مخدوم شاہ حسینی: مخدوم شاہ حسینی چشتیہ سلسلہ کے ایک صوفی تھے۔شائد تلقین وارشاد کی مشغولیت کے سبب ان کے مرید و معتقد انہیں رہنما کہتے تھے۔ان کا وطن قصبۂ بلکانور پرگنہ کوتال محل رائچور صوبہ بیجاپور (کرناٹک) تھا۔ان کے حالات پردہ خفا میں ہیں۔ان کی ایک تصنیف تلاوت الوجود کے آخر میں درج اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مخدوم شاہ حسینی کے پیر و مرشد پیر اللہ حسینی تھے۔ڈاکٹر حفیظ قتیل لکھتے ہیں "مخدوم شاہ حسینی کے پیر کا نام پیر اللہ حسینی ہے جو میراں جی خدا نما کے مرید اور خلیفہ تھے"۔(معراج العاشقین کا مصنف، حیدرآباد 1968ء ص 96)، لیکن حسینی پیر شاہ امین الدین اعلیٰ کے سکڑ پوتے (پوتے کے پوتے) کا بھی نام تھا۔ہوسکتا ہے یہ انہی کے مرید ہوں۔مخدوم شاہ حسینی بلکانوری شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔شاعری میں ان کی ایک مثنوی "میزبانی نامہ" ملتی ہے۔دکنی نثر میں مخدوم شاہ حسینی کی تین کتابیں ملتی ہیں جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

تلاوت الوجود: یہ رسالہ 192 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے مضامین کو (35) ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس میں تصوف کے مختلف مسائل خصوصاً خانوادہ امینیہ کے مخصوص پانچ عناصر پچیس گن کے فلسفہ پر سوال جواب کے پیرائے میں بحث کی گئی ہے۔اس کا قلمی نسخہ آغا حیدر حسن کے کتب خانہ میں تھا۔

تلاوت الوجود حقیقت المعراج ومعرفت المحبوب: مختلف کتب خانوں میں اس رسالہ کے نسخے دس مختلف ناموں سے ملتے ہیں جیسے تلاوت الوجود وگنج العرش، حقیقت المعراج، معراج نامہ، وجود المعراج العاشقین وغیرہ۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل کے مطابق یہ رسالہ تلاوت الوجود سے ماخوذ ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''مخدوم شاہ حسینی نے پہلے رسالہ [تلاوت الوجود] لکھا۔ اس کے بعد اسی کے آخری حصہ کو 23 ویں باب سے آخر تک علاحدہ کر کے اور اس میں قدرے ترمیم کر کے تقریباً 100 صفحات کا ایک علاحدہ رسالہ مرتب کیا۔ اس طرح یہ دوسرا رسالہ وجود میں آیا۔

معراج العاشقین: مخدوم شاہ حسینی کے اس رسالہ کو مولوی عبدالحق نے 1343ھ میں شائع کیا اور اسے حضرت گیسو درازؒ کی تصنیف بتایا۔ ایک عرصہ تک معراج العاشقین کو حضرت گیسو درازؒ کی تصنیف اور اردو میں نثر کی پہلی کتاب مانا جاتا رہا۔ 1968ء میں ڈاکٹر حفیظ قتیل (عثمانیہ یونیورسٹی) نے اپنی کتاب ''معراج العاشقین کا مصنف'' میں مدلل طور پر یہ ثابت کیا کہ معراج العاشقین حضرت گیسو درازؒ کی تصنیف نہیں ہے بلکہ سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کے اوائل کے زمانے کے صوفی مخدوم شاہ حسینی بلکانوری کی تصنیف ہے۔

معراج العاشقین دراصل مخدوم شاہ حسینی کے مذکورہ بالا دوسرے رسالہ کی تلخیص ہے۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو 18 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ کی عبارتوں میں بڑی بے ربطی، ابہام اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل لکھتے ہیں کہ اس مختصر رسالہ میں مشکل سے چند سطریں ایسی ملیں گی جو دُرست، مربوط اور بامعنٰی ہوں۔

مخدوم کی نثر پر قدامت اور بیجاپوری اسلوب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس کے جملوں میں روانی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ جگہ جگہ قرآنی آیات اور احادیث کا استعمال کرتا ہے۔ تاکہ معنویت میں اضافہ ہو۔ اس میں مذہبی اور صوفیانہ اصطلاحات بھی بکثرت استعمال کی گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے عبارتیں بوجھل اور کیف واثر سے عاری محسوس ہوتی ہیں۔ معراج العاشقین کا درج ذیل اقتباس دیکھیے۔

> ''قال النبی علیہ السلام کہے انسان کے بوجنے کوں پانچہ تن۔ ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود، مقام اس کا شیطانی، نفس اس کا امارہ یعنی واجب کی آنک سوں غیر نا دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نا سننا سو۔ حسد نک سوں بد بوئی نا لینا سو۔ بغض کے زبان سوں بد گوئی نا لینا سو۔ کینہ کے شہوت کوں غیر جا گا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا نبض پچھان کو دوا دینا...... پیر منع کیے سو پرہیز کرنا۔ مراقبے کی گولی مشاہدے کے کانسے میں میکائیل کے مدد کے پانی سوں۔ جلی کا کاڑا کر کو پلانا۔ سکن کا کاڑا دینا۔ نرگن ہوا تو شفا پاوے گا۔ طبیب فرمائے تیوں پرہیز کرے۔ تو اُنے بھی طبیب ہووے گا۔ ہور ماٹی میں ماٹی۔ ماٹی میں پانی۔ ماٹی میں آگ۔ ماٹی میں بار۔ ماٹی میں خالی ان پانچہ عناصراں کا واجب الوجود بوجا تو معرفت تمام ہوا۔ دوسرا تن ممکن الوجود، اس کا نگہبان اسرافیل۔ نفس لوامہ۔ حواس خمسہ ممکن کی آنک سوں غیر نا دیکھنا سو۔ غفلت کے کان سوں غیر نا سننا سو۔ وسواس کی نک سوں بد بوئی نا لینا سو، کی زبان سوں غیر نا بولنا سو، مغروری کی شہوت کوں غیر جا گا نا دوڑانا سو، غفلت اور غضب ان پانچہ خواص کا مراقبہ کرنا، پیر کے ممکن کا مشاہدہ قائم کرنا۔ ذکر قلبی کر شریعت کے کانسے میں پلانا، نرگن ہوا تو ممکن کا درد جاوے گا۔''

مذکورہ بالا نثر نگاروں کے علاوہ مابعد دور میں متعدد کم معروف دکنی نثر نگار گزرے ہیں جنہوں نے دکنی نثر کے فروغ میں اہم حصہ لیا۔ان میں شاہ معظم بیجاپوری نے جو امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے۔گیسو درازؒ سے منسوب فارسی شکار نامہ کی شرح لکھی۔اسی طرح شاہ برہان الدین قادری راز الٰہی نے تصوف وسلوک کے موضوع پر رسالہ وجودیہ، شاہ نور محمد قادری نے رسالہ نور دریا (وجودیہ) اور رسالہ نو بطون' محمد شریف نے رسالہ گنج مخفی تصنیف کیا اور دکنی زبان میں نثر نگاری کی روایت کو برقرار رکھا۔

15.4 قطب شاہی دور میں دکنی نثر کا ارتقا

بہمنی سلطنت کے زوال پذیر ہونے کے نتیجہ میں قطب شاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا جس کا دارالخلافہ گولکنڈہ تھا۔قطب شاہی خاندان کے بانی سلطان قلی نے جو تلنگانہ کا صوبہ دار تھا' 1508ء میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔یہ سلطنت کم وبیش 180 سال تک پورے جاہ و حشم کے ساتھ سرزمین دکن پر قائم رہی۔قطب شاہی سلطنت کا بڑا حصہ تلگو زبان کے علاقوں کو محیط تھا۔تاہم بہمنی اقتدار کے 175 سال کے دوران اردو ایک مشترک زبان کی حیثیت سے دکن کے بیشتر علاقوں میں پھیل چکی تھی۔قطب شاہی سلطنت میں بھی عام بول چال اور رابطے کی زبان یہی تھی۔

قطب شاہی سلاطین کے دربار علما' فضلا' شعرا' ادبا' مورخین اور دیگر ماہرین فن اور ارباب کمال کے ماویٰ ومرکز بنے ہوئے تھے۔ان کی معارف پروری اور فیاضی کے چرچے سن کر عرب اور عجم کے علما اور فضلا دکن آئے اور ان کی قدردانی وسرپرستی سے فیضیاب ہوئے۔

قطب شاہی سلاطین نے دکنی زبان وادب کی بھی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی۔انہوں نے وجہیؔ اور غواصیؔ جیسے شعراء کو ملک الشعرا بنایا۔ان کے عہد میں دکنی شعر وادب کو نہایت فروغ حاصل ہوا۔دکنی نثر کو بھی اس دور میں بڑی ترقی ہوئی۔ذیل میں قطب شاہی عہد کے اہم نثر نگاروں اور ان کی نثری خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔

ملا وجہی: وجہی دکنی زبان کا عظیم المرتبت نثر نگار اور بلند پایہ سخنور تھا۔اس کا اصل نام اسداللہ اور وجہی تخلص تھا۔اس کے آبا واجداد خراسان کے رہنے والے تھے لیکن وجہیؔ کا وطن تلنگانہ تھا۔اس کے حالاتِ زندگی پردہ خفا میں ہیں۔قیاس کیا جاتا ہے کہ وجہی' گولکنڈہ کے چوتھے حکمران ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوا، محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں اس کی شاعری عروج کو پہنچی اور محمد قلی قطب شاہ نے اسے ملک الشعرا مقرر کیا۔محمد قلی کے بعد محمد قطب شاہ کے زمانہ میں وہ گمنامی میں چلا گیا لیکن عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں شاہی دربار سے دوبارہ اس کا تعلق استوار ہوگیا۔عبداللہ قطب شاہ کے عہد ہی میں اس کا انتقال ہوا۔وجہی کی تصانیف میں مثنوی قطب مشتری' چند غزلیات' فارسی دیوان غزلیات کے علاوہ دکنی نثر میں دو کتابیں سب رس اور تاج الحقائق شامل ہیں۔

سب رس: دکنی نثر کی شاہکار تصنیف ہے۔یہ اردو کی پہلی داستان' پہلی تمثیل اور پہلی غیر مذہبی کتاب یا پہلی ادبی تصنیف ہے۔وجہی نے یہ کتاب سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1045ھ مطابق 1635ء میں تصنیف کی۔سب رس ایک عشقیہ داستان ہے جس کا قصہ وجہی کا طبع زاد نہیں ہے۔یہ قصہ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی مثنوی ''دستور العشاق'' (1436ء) کے نثری خلاصے قصہ حسن ودل سے ماخوذ ہے لیکن وجہیؔ نے کہیں اس کا اعتراف نہیں کیا ہے۔فتاحی کی مثنوی کا قصہ بھی طبع زاد نہیں ہے۔یہ پنڈت کرشن مشر کے سنسکرت ڈرامے ''پربودھ چندرودے'' (1065ء) کی کہانی پر مبنی ہے جس کے ترجمے مغرب اور مشرق کی متعدد زبانوں میں ہوئے ہیں۔سب رس میں وجہی نے ملک سیستان کے بادشاہ

عقل کے فرزند دل اور مشرق ولایت کے سلطان عشق کی بیٹی حسن کے معاشقے کی داستان پیش کی ہے۔

سب رس کا پلاٹ سیدھا سادہ اور اکہرا ہے۔اس میں انسانی اعضاء اور مجرد اوصاف کو انسانی کرداروں کی شکل دی گئی ہے جیسے عقل، عشق، دل، حسن، ہمت، نظر، ناموس، غمزہ وغیرہ۔اس طرزِ بیان کی وجہ سے سب رس تمثیل (Allergory) کہلاتی ہے۔

وجہی نے سب رس آج سے کوئی پونے چار سو سال قبل اپنے عہد کی فصیح دکنی زبان میں لکھی لیکن اس کے بہت سے الفاظ اور محاورات اب متروک ہو چکے ہیں۔سب رس کا طرہ امتیاز اس کی نثر ہے۔وجہی نے اس میں مسجع و مقفی نثر استعمال کی ہے۔وہ ایک ساتھ چار چار، پانچ پانچ ہم قافیہ جملے نہایت روانی اور بے تکلفی سے لکھتا چلا جاتا ہے۔لیکن زبردستی کی ٹھوس ٹھانس اور بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔اس کو خود یہ پتہ تھا کہ وہ نظم اور نثر کو ملا کر نثر نگاری کا ایک نیا اسلوب ایجاد کر رہا ہے جو اس سے قبل کسی نے نہیں کیا تھا۔وجہی کے سامنے دکنی میں مقفیٰ نثر کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔اس نے اپنی طبیعت کی اختراع سے رنگین بیانی اور عبارت آرائی کا یہ نیا راستہ نکالا۔نقادوں کی نظر میں سب رس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا حسین و جمیل اور زندہ و شگفتہ اسلوب بیان ہے۔اس زمانہ میں جب کہ زبان ابھی طفلی کے مرحلے میں تھی، مافی الضمیر کا سادگی کے ساتھ مکمل اظہار کرنا بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا۔اس وقت تحریر میں ادبی حسن، جمالیاتی دلکشی اور دلفریبی پیدا کرنا وجہی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔نثر میں ادبی چاشنی اور کیف و جاذبیت پیدا کرنے کے لیے وجہی نے مختلف تدابیر اختیار کی ہیں۔اس کی عبارت خوبصورت تشبیہات اور استعاروں کے علاوہ مجاز مرسل، کنایہ، تجنیس، ایہام اور رعایت لفظی جیسی صنعتوں سے مزین اور آراستہ ہے۔بات میں زور اور اثر پیدا کرنے کے لیے وہ حسبِ موقع قرآنی آیات، احادیث، عربی و فارسی مقولوں اور اشعار کا پیوند لگاتا ہے۔اس نے ہندوستان کے لسانی ورثے سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔دکنی کے علاوہ مرہٹی اور برج بھاشا کی کہاوتوں، ضرب الامثال اور دوہوں کو متن میں شامل کر کے اس نے اپنے علم و فضل اور ہمہ گیری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

''سب رس'' کے جملوں میں ربط و تسلسل اور ایک خاص آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔داستان کے درمیان وجہی نے جگہ جگہ بات سے بات نکالتے ہوئے مختلف مذہبی، اخلاقی، صوفیانہ، سماجی، ثقافتی وغیرہ، دنیا بھر کے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔اس کے یہ خیالات انشائیے معلوم ہوتے ہیں۔اس طرح سب رس میں انشائیے کے اولین نقوش کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔مختصر یہ کہ پروفیسر گیان چند جین کے بقول اردو نثر کی ابتدائی صدیوں کی تاریکی میں سب رس روشنی کے مینار کی طرح دور تک ضو پاش اور جلوہ بار ہے۔(اردو کی نثری داستانیں۔صفحہ 134)۔ذیل میں ''سب رس'' کا اقتباس پیش کیا گیا ہے۔

> ''القصہ حسن نار نے، گل عذار نے، انکھیاں کے سنگار نے، دل کے آدھار نے، سنی کہ غمزے کا بھائی جو نھن پن تے بچھڑیا تھا، سوملیا۔غمزے کے دل کا غنچہ جوں پھول کھلیا۔حسن نار چتر چوسار۔صاحب صورت، صاحب دیدار، دُسرے دیس غمزے کوں بلائی، کہی کہ میں سنی ہوں کہ بہوت دیساں پچھیں بچھڑیا تھا سوملیا ہے تیرا بھائی۔کیا نام دھرتا ہے، کیا کام کرتا ہے۔غمزہ بولیا کہ میرے بھائی کا ناؤں نظر، عجب مرد ہے باخبر۔بولی کہ کیا ہنر جانتا ہے۔بولیا کہ لعل مانک، ہیرے رتن خوب پہچانتا ہے۔حسن نار، دل پرور، دلدار، جیو کے آدھار پاس بڑی مول کا، بہوت تول کا عجب ایک جوہر تھا کہ کسی بادشاہ کے خزانے میں ویسا جوہر نہ تھا کہ جو پڑتا اس جوہر کا جھلک، روشن ہوتے ساتوں فلک۔بولی کہ میرے دل میں بہوت دیساں

تے یوتھا' خبر لیتی تھی جا بجا کہ کوئی مرد خاص پیدا ہووے' جو ہر شناس پیدا ہووے کہ جو ہر کو جانے' جو ہر کی قدر کو پچھانے۔ بارے الحمدللہ ایسا جو ہر شناس آدمی آیا' خدا نے اسے یہاں لیایا۔''

(ملا وجہی' سب رس' مرتبہ ڈاکٹر حمیرہ جلیلی (سب رس کی تنقیدی تدوین) حیدرآباد' 1983ء' ص 255-254)

تاج الحقائق: وجہی کی اس تصنیف کے دو قلمی نسخے ملتے ہیں جن میں سے ایک سالار جنگ میوزیم لائبریری میں اور دوسرا بمبئی یونیورسٹی لائبریری میں۔ کتب خانہ سالار جنگ میں جو نسخہ ہے' اس کے شروع میں کاتب نے لکھا ہے'' کلام میراں جی شمس العشاق کہ کلام شاہ وجیہ الدین را بزبان دکھنی ترجمہ نمودہ اند''۔ اس جملہ کی بنا پر ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی نے اسے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف سمجھا اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اسے شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی سے منسوب کیا۔ مولوی عبدالحق نے وجہی کی تصانیف میں اس کا شمار کیا۔ عبدالقادر سرفراز نے بمبئی یونیورسٹی کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست میں اسے وجہی کی تصنیف قرار دیا۔ ڈاکٹر زور نے بعد میں اسے وجہی کی تصنیف مانا لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی اسے وجہی کی تصنیف ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نور السعید نے تاج الحقائق کو مرتب کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ اس کے مقدمہ میں انہوں نے سب رس اور تاج الحقائق کی عبارتوں کے اقتباسات کی مماثلتوں اور بعض دیگر شواہد کی بنیاد پر اسے وجہی کی تصنیف قرار دیا۔ ان کا خیال ہے کہ وجہی نے پہلے تاج الحقائق لکھی پھر سب رس۔ تاج الحقائق کا موضوع تصوف اور معرفت کے مسائل ہیں۔

میراں جی خدا نما: دکنی ادب کی تاریخوں میں ان کا نام میراں جی خدا نما اور سید میراں حسینی دنوں طرح سے ملتا ہے۔ ان کے والد کا نام شاہ قاسم محمود تھا۔ ان کے مرید و خلیفہ میراں یعقوب کی تصنیف'' شمائل الاتقیا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ میراں جی خدا نما 1004ھ میں پیدا ہوئے اور 70 برس کی عمر پا کر 1074ھ میں انتقال کیا۔ میراں جی خدا نما بیجا پور کے مشہور صوفی سید شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید و خلیفہ تھے۔

''انہوں نے کئی اردو رسالے اور نظمیں لکھیں۔ رسالہ وجودیہ' شرح تمہیدات عین القضات اور شرح مرغوب القلوب ان کی وہ اردو نثر کی کتابیں ہیں جو اب تک محفوظ ہیں''۔

(دکنی ادب کی تاریخ۔ ص 75)

مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ تذکرہ مشکوٰۃ النبوۃ میں میراں جی خدا نما کی ایک اور تصنیف'' قربیہ'' کا ذکر ملتا ہے' لیکن یہ رسالہ مفقود ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ منظوم تھا یا منثور۔ (بحوالہ ڈاکٹر حفیظ قتیل' میراں جی خدا نما' حیدرآباد 1961ء' ص 39)

اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی میراں جی خدا نما کی ایک اور تصنیف'' چہار وجود'' کا ذکر کیا ہے جس میں کلمۃ الحقائق کی طرح سوال جواب کے پیرائے میں تصوف کے مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ (تاریخ ادب اردو' دہلی' 2013ء' جلد اول' ص 373)

میراں جی خدا نما کی تمام تصانیف کا موضوع شرع و عقائد اور تصوف و سلوک کے مسائل ہیں۔

شرح تمہیدات عین القضات: ''تمہیدات عین القضات'' یا ''تمہیدات ہمدانی'' تصوف کی ایک مشہور کتاب ہے جس کے مصنف ابو الفضائل عبداللہ بن محمد عین القضات ہمدانی (م۔ 533ھ مطابق 1138ء) ہیں۔ اس کتاب میں قاضی ہمدانی نے اسرار الٰہیہ کے انکشاف میں بڑی جسارت کا مظاہرہ کیا تھا جس پر علماء نے ان کے قتل کا فتویٰ دیا تھا۔ یہ فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے فارسی زبان میں اس کی شرح لکھی۔

میراں جی خدا نما کی شرح تمہیدات عین القضات حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ کی فارسی شرح تمہیدات عین القضات کا دکنی ترجمہ ہے۔لیکن بعض مقامات پر وہ گیسودرازؒ کی شرح سے زیادہ اصل متن کے قریب نظر آتے ہیں۔ترجمے میں میراں جی نے وضاحت کے لیے کہیں کہیں چند الفاظ یا چند جملے اپنی طرف سے بڑھائے بھی ہیں۔

رسالہ وجودیہ: میراں جی خدا نما کے مرشد امین الدین اعلیٰ نے رسالہ ''وجودیہ'' کے نام سے دکنی زبان میں ایک منظوم اور ایک نثری دو رسالے لکھے تھے۔ان کی تقلید میں میراں جی نے بھی دکنی زبان میں رسالہ وجودیہ کے نام سے ایک نثری رسالہ لکھا جس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔میراں جی کے علاوہ امین الدین اعلیٰ کے سلسلہ کے بعض دوسرے صوفیا نے بھی ''وجودیہ'' کے نام سے صوفیانہ رسالے لکھے جس کی وجہ سے اکثر محققین کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے ایک مصنف کا رسالہ دوسرے سے منسوب کر دیا ہے۔

شرح مرغوب القلوب: اس رسالہ کا ذکر مولوی عبدالحق نے کیا اور اسے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف قرار دیا۔(مضمون' حضرت میراں جی شمس العشاق' مشمولہ قدیم اردو' کراچی 1961ء' ص 21)

لیکن حکیم شمس اللہ قادری نے مولوی عبدالحق سے اختلاف کرتے ہوئے اسے مدلل طور پر میراں جی خدا نما کی تصنیف قرار دیا کیونکہ انہیں اس کا ایک ایسا قلمی نسخہ دستیاب ہوا تھا جس کے خاتمہ میں میراں جی خدا نما کا نام درج تھا۔(بحوالہ اردوئے قدیم' حیدرآباد' 2015ء' حصہ دوم' ص 59)

مرغوب القلوب ایک فارسی مثنوی ہے جو شمس الدین تبریزی سے منسوب ہے۔میراں جی خدا نما نے دکنی زبان میں اس رسالہ کی شرح لکھی جو اصل مثنوی کی طرح دس ابواب پر مشتمل ہے۔شرح کے آغاز میں ایک طویل تمہید بھی ہے جس میں آیات و احادیث کی مدد سے معرفت کے مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔

میراں جی خدا نما کی نثر عموماً ہموار اور شفاف ہے لیکن اس میں بعض مقامات پر ناہمواری اور گنجلک پن کا بھی احساس ہوتا ہے۔لیکن جب ہم ان کی نثر کا برہان الدین جانم کی نثر سے تقابل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ میراں جی کی نثر زور' وضاحت اور قوتِ اظہار میں جانم سے بہت آگے بڑھ گئی ہے۔یہاں جملوں کی ساخت میں بھی بہتری آ گئی ہے۔فاعل' مفعول اور فعل کی ترتیب میں بھی باقاعدگی آ گئی ہے۔جانم کے یہاں دیسی الفاظ کی کثرت ہے۔میراں جی کے ذخیرہ الفاظ پر فارسی کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔میراں جی کی نثر سے نہ صرف زبان کے ارتقاء کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس کی ابلاغی اور ترسیلی قوتوں کی ترقی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ذیل میں شرح تمہیدات سے میراں جی کی نثر کا نمونہ دیا گیا ہے۔

> ''اللہ بڑا صاحب ہے' اس کو بہوت سرانا ہور بہوت نوارنا کہ اس کی خدائی تھے دونوں عالم پیدا کرنے میں عقل کیاں انکھیاں حیراں ہیں۔خدا دائم قائم ہے۔اس کی بزرگی کا مہر سب پر ہے۔ہور خدا اکیلا ہے۔پیدا کرتا ہور مارتا ہے سب کوں۔نہ اپنے ہاتوں کرتا ہے نہ دُسرے کوں فرماتا ہے۔ہوکنے میں دونوں عالم ہوکر آئے۔ایک اشارت میں' دوجی بار کا حاجت نہیں کہنے کا۔خدا تعالیٰ ایسا پاک ہے او کسے ایسا [پاکی] نہیں۔خدا کو صورت نہیں۔خدا پیدا کرنہار ہے **قولہ تعالیٰ الا لہ الخلق والامر**۔خدا کھیا تمیں منجے بوجھو۔میں تمنا پیدا کیا ہور کام فرمایا''

(شرح شرح تمہیدات عین القضات۔بحوالہ: پروفیسر سیدہ جعفر' دکنی نثر کا انتخاب' دہلی' 1983ء' ص 89)

میراں یعقوب: میراں یعقوب، میراں جی خدا نما کے خاص مرید تھے۔ بچپن ہی سے ان کی تعلیم و تربیت میراں جی خدا نما کی سرپرستی میں ہوئی۔ جوان ہوئے تو میراں جی نے انہیں اپنا مرید کیا اور تصوف و طریقت کے رموز و اسرار کا عرفان بخشا۔ میراں یعقوب شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی لیکن دکنی ادب میں انکی اہمیت نثر نگار کی حیثیت سے ہے۔ دکنی نثر میں ان کا کارنامہ ''شمائل الاتقیا'' کا ترجمہ ہے۔ شمائل الاتقیا، شاہ برہان الدین غریبؒ کے مرید رکن عماد الدین دبیر معنوی کی فارسی زبان میں لکھی ہوئی ضخیم کتاب ہے۔ عماد دبیر نے یہ کتاب متعدد بزرگوں کے کتب و رسائل کا مطالعہ کر کے لکھی تھی۔ ترجمہ کرنے کے سبب کی وضاحت کرتے ہوئے کتاب کے ابتدائی حصہ میں میراں یعقوب لکھتے ہیں کہ میراں جی خدا نما کے انتقال کے بعد ان کے فرزند و سجادہ نشین علی امین الدین نے ان سے شمائل الاتقیا کو فارسی سے ہندی (قدیم اردو) میں منتقل کرنے کی خواہش کی لیکن اس وقت میراں یعقوب سے یہ کام نہ ہو سکا۔ علی امین الدین کے انتقال کے بعد ان کے بھانجے اور خلیفہ شاہ میراں ابن سید حسین کی خلافت کے زمانہ میں انہوں نے شمائل الاتقیا کے دکنی ترجمے کا آغاز کیا۔ ترجمہ کا یہ کام 1084ھ میں مکمل ہوا۔

شمائل الاتقیا کا دکنی ترجمہ نہایت ضخیم ہے۔ یہ (1299) صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ میراں یعقوب نے اسے 4 ابواب اور 91 بیانات میں تقسیم کیا ہے۔ اس کتاب میں اولیا، صالحین اور پرہیزگاروں کی پاک خصلتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے اس کا نام شمائل الاتقیا ہے۔ اس میں ان کتابوں اور رسائل کے نام دیے گئے ہیں جن سے استفادہ کیا ہے۔

میراں یعقوب کی نثر سادہ اور دکنی روزمرہ سے قریب ہے۔ اس میں جدید نثر کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔ میراں یعقوب نے نہ صرف فارسی اشعار کا ترجمہ کیا بلکہ اس میں اپنے اشعار اور رباعیاں بھی شامل کی ہیں جس کی وجہ سے عبارت میں رنگینی اور دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ انہوں نے تصوف و طریقت کی اصطلاحات کو بھی اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس میں سلاست اور بے تکلفی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے کہیں کہیں مقفیٰ اور مسجع جملے بھی لکھے ہیں۔ انہوں نے بہت سے قدیم الفاظ ترک کر کے جدید الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ذیل میں شمائل الاتقیا کی نثر کا نمونہ دیا گیا ہے۔

> ''مہتر ابراہیم اپنے فرزند اسمٰعیل کوں کہے کہ میں سپنا دیکھا جو تجے ذبح کرتا ہوں۔ اسمٰعیل کہے اگر تمے ناسوتے تو ایسا نا دیکھتے۔'' رسالہ رموز الواصلین **لو كان فی النوم خير لكان فی الجنة نوم** ۔یعنی اگر سونے میں کچھ خوبی اچھتی تو بہشت میں سونا ہوتا۔ پس معلوم ہوا جو سونا برا ہے اس خاطر بہشت میں سونا نہیں۔ اے عزیز جنے سُتا سو موا۔ کیا سبب کہ مرتا ہور سوتا دونوں بھایاں ہیں۔ توں نکو سو۔ تا دل تیرا جاگتا رہے، نیند کی بلا تھے۔ قال النبی ﷺ ''**الليل طول فلا تقصره بمنا مكم والنهار مضی فلا تكدره باثآ مكم**'' نبی علیہ السلام کہے کہ رات لمبی ہے، پس کوتی نکو کرو تمیں اسے تمارے سونے سوں ہور دیس اجالا ہے پس اندھارا نکو کرو تمیں اسے تمارے گناہاں سوں۔۔۔ سپنے میں ہور واقعہ غیبی میں فرق یو ہے۔ مرصاد۔ سپنا او ہے جو حواس سب پورا بے کار ہوویں ہور خیال برکار اچھے، سب حواس مغلوب ہوویں پر خیال کی نظر میں کچھ کچھ دس آوے۔ اسے سپنا کہتے ہیں۔ یو دو وزا کا ہے۔ یک اضغاث و احلام یعنی برا۔ سپنا نفسانی۔ دُسرا رویائے صالح یعنی خوب سپنا۔''
>
> (انتخاب شمائل الاتقیا، مرتبہ بدیع حسینی، مشمولہ قدیم اردو، جلد دوم، بابت 1967ء شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، ص 232-231)

عابد شاہ: یہ دکنی کے آخری دور کے اہم نثر نگار ہیں۔ ان کا نام نواب الدین عابد شاہ حسینی اور عابد تخلص تھا۔ عابد شاہ گولکنڈہ کے مشہور صوفی شاہ راجو کے مرید و معتقد تھے جو حضرت گیسو دراز کی اولاد میں تھے۔ سلطان ابوالحسن تانا شاہ بھی ان کا مرید تھا۔ عابد شاہ صاحبِ علم صوفی تھے۔ شریعت اور طریقت کے مسائل کے علاوہ انہیں طب سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ دکنی نثر میں ان کے تین رسائل دستیاب ہوئے ہیں جن کے نام یہ ہیں (1) معالجات بندہ نواز (2) کنز المومنین (3) گلزار السالکین۔

معالجات بندہ نواز' حضرت گیسو دراز کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ ایک طبی رسالہ ہے جو 63 امراض کے نسخوں پر مشتمل ہے۔

کنز المومنین کا موضوع ''مسائل شریعت'' ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف میں عابد شاہ نے علمائے سلف کی (153) کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور فقہ حنفی کے مختلف مسائل کی توضیح کی ہے۔ یہ کتاب 19 ابواب اور 73 فصلوں پر مشتمل ہے۔

عابد شاہ کی تیسری نثری تصنیف ''گلزار السالکین'' ہے جس کا ایک اور نام مخزن السالکین بھی ہے۔ اس کتاب میں عابد شاہ نے سوال و جواب کے پیرائے میں تصوف و معرفت کے مسائل کی توضیح و تشریح کی ہے۔

پروفیسر سیدہ جعفر اطلاع دیتی ہیں کہ عابد شاہ کی ایک اور تصنیف مراۃ السالکین ہے جس کا مخطوطہ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری میں موجود ہے۔ اس کی تاریخ تصنیف ماقبل 1092ھ بتائی گئی ہے۔ اس میں تصوف و فلسفہ کے بعض مسائل جیسے روح' عقل' نفس اور اس کی اقسام' نور وحدت اور سلوک پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (بحوالہ: تاریخ ادب اردو' دہلی' 1920ء' جلد چہارم' ص 425)۔

عابد شاہ کا اسلوب بیان سادہ اور عام فہم ہے۔ انہوں نے ''گلزار السالکین'' میں اپنی زبان کو ''دکھنی'' کہا ہے تاہم ان کی زبان دکنی کے اولین نثر نگاروں کے مقابلہ میں جدید معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے قدیم دکنی الفاظ کے ساتھ ان کے نئے روپ بھی استعمال کیے ہیں جیسے کہیں ''ہور'' لکھا ہے تو کہیں ''اور'' استعمال کیا ہے۔ اپنے خیالات کی وضاحت کے لیے وہ عبارتوں کے درمیان اشعار بھی درج کرتے ہیں اور مثالوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ انہوں نے برمحل تشبیہات اور استعارات سے بھی اپنی نثر کو مزین کیا ہے۔ ان کی نثر میں کہیں کہیں انشا پردازی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ مجموعی طور پر عابد شاہ کی نثر سادہ اور شگفتہ کہی جاسکتی ہے۔ گلزار السالکین سے ان کی نثر کا نمونہ دیکھیے:

> ''اول ثنا و صفت کرنا اللہ تعالیٰ کا کہ او قادر ہے۔ تمام چیز او پر قدرت رکھتا ہے اور ہر شئے میں حاضر و ناظر جیسا کہ شکر میں مٹھاس اور پھول میں باس۔ اسی طرح سب میں صنعت گری رکھتا ہے۔ ہور تمام اشیا پر اس کی ذات بالاتر ہے۔ موافق دلیل کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے دلیل **من ذلک علو** معنیٰ اس کا یوں ہے کہ خدائے تعالیٰ عالم کے قیاس سو بالاتر ہے' ہور بے زوال ہے۔ وہ بے مثال ہے۔ دلیل اس کا یوں ہے **لم یزال و لایزال الذی لیس کمثلہ شئً وھو السمیع العلیم** ۔ معنی اس کا یوں ہے کہ خدائے تعالیٰ ہمیشہ اور بے زوال ہے۔ وہ کسی شکم سوں پیدا نہیں ہوا۔ ہور اس کے پیٹ سوں کوئی نہیں پیدا ہوا۔''
>
> (گلزار السالکین' بحوالہ: پروفیسر سیدہ جعفر' دکنی نثر کا انتخاب' ص 122-121)

شاہ عبداللہ: یہ گجرات کے مشہور عالم اور صوفی شاہ وجیہ الدین گجراتی کے فرزند تھے۔ بیجاپور کے صوفی سید شاہ ہاشم حسینی علوی ان کے عم زاد بھائی اور مرید و خلیفہ تھے۔ شاہ عبداللہ علما اور فقہا کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ابراہیم عادل شاہ کے زمانہ میں بیجاپور آئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد بیجاپور سے

حیدرآباد آئے اور یہیں 1035ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

شاہ عبداللہ نے دکنی زبان میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام ''احکام الصلوٰۃ'' ہے۔ یہ کسی فارسی رسالہ کا ترجمہ ہے۔ اس میں نماز کے فرائض اور احکام کی وضاحت کی گئی ہے۔ احکام الصلوٰۃ کے نام سے شاہ ملک کا بھی ایک منظوم رسالہ ملتا ہے۔ غالباً شاہ عبداللہ اور شاہ ملک دونوں کے پیش نظر ایک ہی فارسی کتاب رہی ہوگی۔ ذیل میں شاہ عبداللہ کی نثر کا نمونہ دیا گیا ہے۔

''بات کرنے سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں آدمیاں کی مثال دُعا منگنے نماز جاتا ہے۔ 'ہے وآہ' کہنے سوں نماز جاتا ہے۔ دردسوں یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے۔ رونے سوں یا دنیا کے سبب سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں کسی کی موت کی خبر سن کر قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون بولنے سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں سبحان اللہ بولنے سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں قہقہہ ہنسنے سوں نماز جاتا ہے''۔

دکن میں قطب شاہی سلطنت کے زوال 1687ء کے بعد بھی دکنی زبان میں نثری کتب، رسائل اور داستانوں کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ ذیل میں نمونتاً صرف دو مصنفین اور ان کی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ قادری:

یہ شاہ حبیب اللہ قادری کے خلف اکبر تھے جو شاہ مرتضیٰ قادری بیجاپوری کے مرید و خلیفہ تھے۔ شاہ حبیب اللہ قادری گلبرگہ میں مقیم تھے۔ گلبرگہ پر مرہٹوں کے حملے کے بعد وہ حیدرآباد چلے آئے۔ یہیں 1144ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ شاہ ولی اللہ قادری اپنے والد شاہ حبیب اللہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی فرمائش پر شاہ برہان الدین جانم کے خلیفہ محمود خوش دہاں کی تصنیف معرفت السلوک کا فارسی سے دکنی میں ترجمہ کیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ 1157ھ مطابق 1744ء میں شاہ ولی اللہ قادری نے اس رسالہ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ (تاریخ ادب اردو، دہلی، 2013ء، ص 233)۔ معرفت السلوک برہان الدین جانم کے نظام سلوک کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے۔ معرفت السلوک کے دکنی ترجمے کی نثر کا نمونہ درجِ ذیل ہے۔

''کیتک ایسے طالباں حق کے ہیں جو نا عربی جانتے ہیں ہور نا فارسی، پچھانتے ہیں ولیکن اپنے مطلوب کی طلب میں سچے ہیں۔ ہور ظاہری عالم کی نظر میں کچھ نیں۔ ہور اپنے معشوق کے عشق میں جلتے ہیں، ہور اپنے محبوب کی بے نیازی دیک کر مہتاب کی ضرب گلتے ہیں۔ ہور حق کی باتاں کے پیاسے ہوکر حیران ہور سرگردان پھرتے ہیں۔ لیکن خضر کہاں جو اس مانی (معانی) کے پانی کوں اَن سمجھے لفظاں کی ظلمات تے نیکال کر سمجی زبان کے کوزے میں بھر کر اس پیاسیاں کے حلق کوں تر کرے۔ ہور ابدی زندگی بخشتے تا اوسے دعا خیر سوں یاد کریں۔ تو تجکوں لازم ہے جو اس معانی کی عروس کو فارسی ہور عربی کے خلوت خانے کے باہیر کھار (کاڑ) کو ہندی زبان کے تخت پر بیسلا۔''

(بحوالہ: ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اردو نثر کا آغاز و ارتقا، ص 233)

فقیر اللہ شاہ حیدر: یہ قندھار (ناندیڑ، مہاراشٹرا) کے مشہور صوفی اور عالمِ دین شاہ رفیع الدین اور ان کے خلیفہ رحمٰن شاہ کا مرید تھا۔ یہ

سقوط گولکنڈہ کے بعد کے دور سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے 1244ھ میں ''تناولی'' کے نام سے دکنی زبان میں ایک قصہ لکھا جس کا واحد قلمی نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔ فقیر اللہ شاہ حیدر نے یہ داستان قصہ بکاولی (یعنی مذہب عشق جو نہال چند لاہوری کی تصنیف کردہ ہے) کے جواب میں لکھی ہے۔ داستان کے آغاز میں وہ کہتا ہے کہ مدت سے کتاب بکاولی کے بڑے چرچے ہیں۔ مجھے بھی اس کے پڑھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ مشائخ لاڈلے حسینی ورنگل آئے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کتاب بکاولی اور چہار درویش کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں، ہم تمہیں عنایت کرتے ہیں۔ آگے وہ لکھتا ہے۔

> ''کتاب زبان اردو میں اور اس فقیر کو کم وقفیت اس زبان سے۔ پس خدمت والا میں انہیں کے بیٹھ پڑھنا شروع کیا۔ انہوں نے کچھ تعلیم کر فرمائے مجھے بھی خود اس زبان میں درک نہیں۔ فقیر سات آٹھ روز کے عرصہ میں بکاولی اور چہار درویش دونوں ایک ہی جلد میں تھے، دیکھ لیا۔ بارے کچھ کچھ اس زبان سے واقفیت ہوئی۔''

فقیر اللہ شاہ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف دوم میں حیدرآباد اور ورنگل کے دکنی بولنے والوں کو شمالی ہند کی اردو ایک اجنبی زبان معلوم ہوتی تھی۔ اس لیے فقیر اللہ شاہ نے بکاولی کے مقابلہ میں تناولی کا قصہ تصنیف کیا۔ تناولی کی نثر کا نمونہ درجِ ذیل ہے:

> ''یہ سن کر گرو نے ایک خریطہ کھولا۔ اس میں سے ایک کھڑاویں کا جوڑا نکالا اور ڈبہ نکالا اور ایک تعویذ نکالا۔ کہا کہ یہ تعویذ بازو سے باندھ اور ڈبے سے الوپ انجن ایک ذرا مار کے دو سلائیاں اس کی آنکھ میں پہن اور کھڑاؤں پر سوار ہو کر حکم کر۔''

(بحوالہ: پروفیسر گیان چند جین، اردو کی نثری داستانیں، دہلی، 2002ء، ص 181)

15.5 ارکاٹ میں دکنی نثر کا ارتقا

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتوحات دکن کے نتیجے میں عادل شاہی وقطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا اور بیجاپور و گولکنڈہ کے علاوہ جنوبی دکن کے وہ علاقے جو ان سلطنتوں کی عملداری میں تھے مغل سلطنت کا حصہ بن گئے۔ مغل شہنشاہ کی جانب سے ان علاقوں میں صوبہ دار اور فوجدار مقرر کیے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ صوبے دار نیم خود مختار ہو گئے اور نواب کہلانے لگے۔ ارکاٹ، کڑپہ (سدھوٹ) کرنول وغیرہ کے نواب نہایت مشہور ہیں۔ بیجاپور اور گولکنڈے کے زوال کے بعد ان نوابوں نے دکنی زبان اور دکنی شعرا وادبا کی بڑی سرپرستی کی، جس کی وجہ سے یہ علاقے شعر وادب کا مرکز بن گئے۔ جنوبی دکن کے ان نوابوں میں نوابان ارکاٹ کو ان کے اعلیٰ علمی وادبی ذوق اور فیاضی ومعارف پروری کی بدولت امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

ارکاٹ پر دو نواب خاندانوں کی حکمرانی رہی اول نائط خاندان جس کا دور اقتدار 1710 سے 1743 تک رہا۔ دوّم والا جاہی خاندان جس نے 1744 سے 1855 تک ارکاٹ پر حکومت کی۔ ان نوابوں کے عہد میں ارکاٹ علماء وفضلاء، مشائخین، شعراء وادباء اور ارباب ہنر کا مرکز بن گیا۔ لالہ جسونت رائے منشی اور قزلباش خاں امید نواب سعادت اللہ خاں نائط کے دربار سے وابستہ تھے۔ اسی طرح شیخ مخدوم ساوی، ولی ویلوری، خواجہ رحمت اللہ نائب رسولؐ، شاہ ابوالحسن قربی، شاہ تراب، والہ موسوی، ملک الشعراء ابجدی، شاہ عبداللطیف ذوقی، باقر آگاہ، اظفری گورگانی، معجز

ملک الشعرا مستقیم جنگ نامی وغیرہ نے والا جاہی دور میں شعروسخن کی بڑی خدمت کی۔اس علاقے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی طرح یہاں بھی شاعری کے خوب چرچے رہے لیکن نثر کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔شاید اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ اہل قلم شاعری کو ہی ذریعہ عزت اور وسیلہ روزگار سمجھتے تھے۔ذیل میں اس علاقے کے اہم نثر نگاروں کی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

شاہ سلطان ثانی: نثر نگاری کے حوالے سے یہ ارکاٹ کے سب سے قدیم نثر نگار ہیں جو نوابوں کے اقتدار کے ماقبل دور سے تعلق رکھتے ہیں۔شاہ سلطان ثانی سید فخر الدین سلطان حسینی کے فرزند تھے۔شاہ سلطان ثانی 1609ء میں پیدا ہوئے۔سلطان ثانی چونکہ اپنے والد فخر الدین سلطان کے مرید و خلیفہ تھے اس لیے وہ خود کو ''مرید سلطان'' لکھتے تھے۔دکنی کے معروف شعراء شغلی، مرتضیٰ گیانی اور افضل گولکنڈوی انہی کے سلسلے میں مرید تھے۔کہا جاتا ہے کہ ان کے بزرگ گجرات سے گلبرگہ پہنچے پھر وہاں سے نکل کر جنوبی ارکاٹ کے ایک قصبے وڈی گرام پونڈی تعلقہ ولی پورم پہنچے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔شاہ سلطان ثانی نے 1685ء میں انتقال کیا اور مذکورہ قصبے میں اپنے والد کے مزار کے پہلو میں مدفون ہیں۔دکنی نثر میں شاہ سلطان ثانی کے دو رسالے ملتے ہیں۔(1) درالاسرار (2) زنجیرہ۔

ان میں رسالہ درالاسرار کو نہایت مقبولیت حاصل ہوئی اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے کئی قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں جو مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔درالاسرار کو بعض محققین نے حضرت گیسودراز کی تصنیف بتایا ہے جو غلط ہے۔عبارت کا نمونہ درج ذیل ہے۔

> ''قولہ تعالیٰ وفی انفسکم افلا تبصرون'' یعنی خدا کہیا تمہارے تناں میں ہوں پس تمے کی نئیں دیکھتے۔یعنی قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔یعنی جو کوئی اپس کو سمجھیا سو خدا کوں سمجھیا۔پس اے سالک اس آیت ہور اس حدیث کی خبر سوں...... پچھانت اپنی کر کر اپس کوں پچھاننا واجب و فرض ہوا ہے۔اے سالک تو اپیں اپس کوں پچھانیا ہے تو بول، تو کون ہے۔ہور کہاں تے آیا ہے ہور آتے وقت کیا لایا ہے۔ہور توں کہاں جاوے گا ہور جاتے وقت کیا لے جاوے گا۔ہور توں تج میں خدا کوں کہاں دیکھتا ہے۔ہور خدا کا نور کس رنگ کا ہے کر پچھانیا ہے۔ہور توں تُج میں رسول کوں کہاں دیکھتا ہے۔ہور رسول کا نور کس رنگ کا ہے کر پچھانیا۔''

(درالاسرار، بحوالہ سیدہ جعفر، دکنی نثر کا انتخاب، دہلی 1997ص 127)

سید شاہ عبدالقادر میراں حسینی منزوی الجبلین: سید شاہ عبدالقادر المعروف بہ شاہ میراں حسینی ولی اللہ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ سید شاہ ہاشم حسینی خداوند ہادی (مزار، چنچولی، کرناٹک) کے پوتے تھے۔انہوں نے پا پیادہ حج کیا تھا اس لیے ان کے نام کے آگے حاجی الحرمین بھی لکھا جاتا ہے۔چونکہ انہوں نے پہاڑوں میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی اس لیے انہیں منزوی الجبلین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔شاہ میراں حسینی ولی اللہ نے 1146ھ میں انتقال کیا مزار ارکاٹ کے مضافات میں آدم کی پہاڑی پر واقع ہے۔شاہ میراں حسینی ولی اللہ نہ صرف صاحب سلوک تھے بلکہ صاحب تصنیف بھی تھے۔انہوں نے خلاصۃ الرویت کے نام سے تصوف کا ایک رسالہ لکھا جو دکنی نثر کا ایک اہم رسالہ ہے۔اس رسالے کو ''سبع صفات'' اور ''مرأۃ الانسان'' کے ناموں سے بھی موسوم کیا گیا چونکہ اس میں سات صفات یعنی حیات، علم، ارادہ، قدرت، سماعت، بصارت اور کلام کی تفصیلی وضاحت کی گئی ہے اس لیے اسے سبع صفات کہا گیا۔اسی طرح اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی وجود ان سات صفات کا آئینہ ہے اس لیے اسے مرأۃ

الانسان کا نام دیا گیا۔شاہ میراں حسینی کی نثر میں ادبیت جھلکتی ہے۔ وہ تصوف کے خشک موضوعات کو بھی دلچسپ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ دقیق اصطلاحات کی تشریح کے لیے وہ حکایتیں بھی بیان کرتے ہیں۔ادبی حسن کے اعتبار سے خلاصۃ الرویت کو امین الدین اعلیٰ کے رسالے کلمۃ الاسرار کے ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔خلاصۃ الرویت کی نثر کا نمونہ درج ذیل ہے:

> ''بیان ذات ہور صفات کا ہور مراقبہ اور مثال کے چند کلمہ ظاہر کیا جاتا ہے۔اگر کوئی طالب خدا کا سالک راہ کا اس بیان کے تئیں خوب تامل اور تفکر سے دیکھے' پانے' تو انشاء اللہ تعالیٰ پچھانت ذات اور صفات کا حامل ہوکر دونوں عالم میں دیدار خدا عیاں ہو۔ ہر ایک شخص کوں کسی چیز کے پانے کی تلاش ہوتی ہے تو لازم ہے کہ اول اس چیز کی صفت اور ذات کی خبر معلوم کرے، بعدازاس چیز کی تلاش۔نئیں تو اس چیز کے پانے میں دھوکہ کھاوے گا اور دغا پاوے گا۔ اگر کوئی شخص ہیرے کو پانے کا طلب کرے تو اول ہیرے کا صفت اور خاصیت معلوم کرے بعد ازاں ہیرے کو ڈھونڈ ھنے کی تلاش میں ہوئے۔''
>
> (بحوالہ:اردو نثر کا ارتقاء،ص213،212)

باقر آگاہ ویلوری: جنوبی ہند کی علمی وادبی تاریخ میں باقر آگاہ کی شخصیت نہایت نمایاں اور ممتاز حیثیت کی حامل ہے وہ اپنے وقت کے نہایت جید عالم، قادرالکلام سخنور اور متدین صوفی تھے۔ باقر آگاہ 1157ھ میں ویلور میں پیدا ہوئے۔حضرت قربی ویلوری سے ظاہری و باطنی علوم کا درس لیا۔ان کی علمی قابلیت کے پیش نظر نواب والا جاہ نے انہیں اپنے لڑکوں کا اتالیق مقرر کیا۔پھر اپنا دبیر خاص بھی بنالیا۔آگاہ نے 1805ء میں وفات پائی۔ مدراس میں دفن ہوئے۔آگاہ کو تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور مسائل تصوف پر تبحر حاصل تھا۔عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ان کی تصانیف ملتی ہیں۔وہ اردو کے بہت بڑے ادیب تھے۔انہیں نظم اور نثر دونوں پر عبور حاصل تھا۔ڈاکٹر زور کا ماننا ہے کہ ''دکھنی علم و فضل اور شعر وسخن ان پر ختم ہوگیا۔ان کے بعد جنوبی ہند میں اتنا بڑا ادیب اور شاعر پیدا نہ ہوسکا۔ وہ میرؔ اور سوداؔ کے ہم عصر تھے لیکن زبان قدیم استعمال کی ہے۔'' (تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول، حیدرآباد، 1996،ص134)

آگاہ صاحب دیوان شاعر تھے۔انھوں مذہبی موضوعات جیسے سیرت، مناقب، عقائد، فقہ کے علاوہ داستانی مثنویاں بھی لکھیں۔کئی مثنویاں انہوں نے خواتین کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے مقصد سے لکھیں۔نثر میں ان کا ایک رسالہ ''ریاض السیر'' کے نام سے ملتا ہے جس کا موضوع سیرت رسولؐ ہے۔اس کے علاوہ آگاہ نے اپنی مثنویوں کی ابتدا میں نثری دیباچے قلمبند کیے ہیں جن کی بڑی علمی وادبی اور تحقیقی و تنقیدی اہمیت ہے۔ان دیباچوں میں انہوں نے زبان اور اصناف سخن کے متعلق مفید معلومات پیش کی ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اردو اور دکنی کو دو علاحدہ زبانیں سمجھتے تھے۔ذیل میں مثنوی گلزار عشق کے دیباچے کا اقتباس درج کیا گیا ہے۔

> ''مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان بے معنیٰ وہرزہ درایان لایعنی زبان دکنی پر اعتراض اور گلشن (گلشن عشق) وعلی نامہ کے پڑھنے سے اعراض کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب لگ ریاست سلاطین دکن کی قائم تھی زبان ان کی درمیانے ان کے خوب رائج اور طعن وشماتت سے سالم تھی۔ اکثر شعراء وہاں کے مثل نشاطی، فراقی وشوقی وخوشنود وغواصی......وغیرہم کہ بے حساب ہیں اپنی زبان میں قصائد وغزلیات ومثنویات ومقطعات نظم کیے اور داد سخنوری کی دیے۔لیکن نصرتی ملک الشعراء تنگ

نظری سے مبریٰ ہے۔ جب شاہان ہنداس گلزار جنت نظیر کوتسخیر کیے طرز روزمرہ دکنی، نہج محاورۂ ہندی سے تبدیل پانے لگی تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی...... ولی گجراتی غزل ریختہ کی ایجاد میں سبھوں سے مبدا اور استاد ہے۔ بعداس کے جوسخن سنجانِ ہند بے شبہ اس نہج کو اس سے لیے اور من بعد اس کو بہ اسلوب خاص مخصوص کر دیے اور اسے اردو کے بھاکے سے موسوم کیے۔''

(بحوالہ علیم صبانویدی، اردو ادب کا اولین نقاد باقر آگاہ ویلوری، چنئی، 2009، ص 169-168)

15.6 سلطنتِ خداداد میسور میں دکنی نثر

سلطنت خداداد میسور چند در چند تاریخی وسیاسی وجوہات کی بنا پر ہندوستان کی تاریخ میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کی حامل ہے۔ اس سلطنت کے بانی حیدرعلی تھے جنہوں نے 1761ء میں میسور کے کمزور اور نااہل راجا کو حکومت سے بے دخل کر کے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لی۔ حیدرعلی نہایت بہادر، بلند حوصلہ اور آزمودہ کار فوجی جنرل تھے۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد انہوں نے سلطنت میسور کے حدود میں توسیع کی۔ حیدرعلی ناخواندہ تھے لیکن علوم وفنون سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے علما، فضلا، شعرا اور پنڈتوں کی بڑی قدردانی کی اور اکثر کے وظائف مقرر کیے۔ انہیں کتابیں جمع کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔

1782ء میں حیدرعلی کی وفات کے بعد انکے فرزند ٹیپو سلطان تخت نشین ہوئے۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح نہایت دلیر اور شجیع تھے۔ علمی اعتبار سے بھی وہ نہایت لائق وفائق واقع ہوئے تھے۔ مختلف علوم کے علاوہ شعروادب کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ بڑے بڑے علما ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ سلطان کا نہایت بیش قیمت کتب خانہ بھی تھا جس میں مذہبی کتابوں کے علاوہ سائنس، ریاضی، فلسفہ، طب جیسے موضوعات پر سینکڑوں قلمی کتابیں محفوظ تھیں۔ 1799ء میں انگریزوں سے مقابلہ کرتے ہوئے ٹیپو سلطان نے شہادت پائی اور سلطنت خداداد کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطنت خداداد کا عہد نہایت مختصر (38 سال) رہا جس کے دوران حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کا زیادہ تر وقت میدانِ جنگ میں گزرا لیکن اس کے باوجود دونوں حکمرانوں نے جو علمی اور تمدنی خدمات انجام دیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ حیدرعلی اور ٹیپو سلطان دونوں کے درباروں میں ملک الشعرا کا تقرر ہوتا تھا۔ (بحوالہ: میر محمود حسین، ادبیات میسور، مطبع کا نام اور سنہ اشاعت ندارد، ص 11)۔ اس دور کے شعرا وادبا میں شاہ محمد صدرالدین، سعید مہکری عاصیؔ، سید محمد شاہ میر، مہتاب رائے سبقت، زین العابدین شوستری، حسن علی عزت، حسین علی کرمانی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ نثر نگاری کے حوالے سے شاہ محمد صدرالدین اور سید محمد شاہ میر اس دور کے اہم نثر نگار ہیں جن کی نگارشات اپنے عہد کی دکنی زبان اور محاورے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ذیل میں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

سید محمد شاہ میر: سید محمد حسینی المعروف بہ شہ میر اولیاء کا شمار بارہویں صدی ہجری کے اکابر صوفیا میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق سادات بخاری کے خانوادے سے تھا۔ یہ حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت کی اولاد میں تھے۔ شہ میر 1081ھ میں تولد ہوئے اور 1186ھ میں انتقال کیا۔ انہیں اپنے والد خواجہ سید جمال الدین بخاری سے بیعت وخلافت حاصل تھی۔ ان کا سلسلہ بیعت میراں جی شمس العشاق سے ہوتا ہوا حضرت گیسودراز تک پہنچتا ہے۔ نواب حیدرعلی خاں والی سلطنت خداداد میسور ان کے بڑے عقیدت مند تھے۔ کڑپہ فتح کرنے کے بعد نواب نے انہیں سرینگ پٹن آنے کی دعوت دی لیکن انہوں نے از راہ توکل قبول نہ کی۔ البتہ نواب کے اصرار پر اپنے برادر خورد شاہ کمال کو سرینگ پٹن روانہ کیا۔ شہ میر شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ نثر میں ان سے کئی رسائل یادگار ہیں جن میں انتباہ الطالبین، اسرار التوحید، رسالہ عینیت وغیریت، رسالہ قادریہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ شہ

میر کی نثر کے اسلوب اور زبان و بیان پر دکنی روزمرہ اور محاورے کا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ انتباہ الطالبین سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''ابتدا میرا اس کے نام سوں ہے جو یک ناوں نہیں رکھتا بلکہ جس ناوں سوں توں اوسے بلاوے گا سراوٹھاوے گا یعنی جواب دیوے گا ہور حاضر ہووے گا۔ اے طالب حق وجود ہے کہ اوسے یک نام مقرر نہیں بلکہ اوس کے نام بے حد ہور بے عدد ہیں۔ ہور عدم کوں سوائے یک نام کے دوسرا نام نہیں۔ اس سبب سوں کہ اسم بے مسمٰی ہے یعنی لاشی اور وجود شئے ہے۔ ایسا کہ بہت کمالات رکھتا ہے۔ ہر یک کمال کے سبب سوں اوسے یک نام علاحدہ رکھتے ہیں ہور توحید کی اصطلاح میں وجود ہست کو کہتے ہیں۔ ہور ہست حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ اول بی ہے ہور آخر بی ہے، ہور درمیانے ہے یعنی ہمیں نئیں تھے اور ہمیں نا ہوینگے تب بی رہے گا۔ اور ہمیں ہیں تو اب بی ہے۔ است کہے تو ہے، ہور ہے کوں سب کچھ ہے اور نئیں کوں کچھ بی نہیں۔''

(بحوالہ: حبیب النساء بیگم، ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما، بنگلور 1962ء، ص 79-78)

شاہ صدرالدین: شاہ صدرالدین، شاہ میراں حسینی ولی اللہ منزوی الجبلین کے فرزند تھے۔ وہ 1102ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد نلونگل چلے گئے، جو بنگلور سے 17 میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں نواب دلاور خاں نواب سرا نے انہیں ایک جاگیر عطا کی تھی۔ (بحوالہ: ڈاکٹر آمنہ خاتون، مضمون، شاہ صدرالدین اور ان کی مثنویاں، مشمولہ نوائے ادب بمبئی بابتہ اپریل۔ جولائی 1967ء، ص 96)۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ آپ نواب حیدر علی خاں کے زمانہ میں نلنگل سے آکر سرینگ پٹن میں مقیم تھے''۔ (بحوالہ: حبیب النساء بیگم، ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما، بنگلور 1962ء، ص 71)۔ ڈاکٹر محمد ہاشم علی کے مطابق سلطنت خداداد میسور کے حکمران ٹیپو سلطان نے شاہ صدرالدین کے دست پر بیعت کی تھی۔ (ڈاکٹر محمد ہاشم علی، مضمون، ایک صوفی خاندان کی اردو خدمات مشمولہ سب رس، حیدرآباد، نومبر 1978ء، ص 12)۔ شاہ صدرالدین نے 1193ھ میں وفات پائی۔ مزار نلنگل میں واقع ہے۔ شاہ صدرالدین کثیر التصانیف صوفی تھے۔ انہوں نے 17 مثنویاں اور 7 نثری رسائل لکھے جو دکنی زبان میں ہیں۔ کسب محویت، کسب عروج، مرأۃ الاذکار وغیرہ ان کی اہم مثنویاں ہیں۔ ان سب کا موضوع سلوک و عرفاں کے مسائل و مباحث ہیں۔ شاہ صدرالدین کا ایک نثری رسالہ ''مجمع المقالات'' ہے جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں محفوظ ہے۔ (بحوالہ: افسر صدیقی، مخطوطات انجمن، جلد دوم، ص 286)۔ ''مرأت الاسرار'' شاہ صدرالدین کا دکنی نثر میں ایک اہم رسالہ ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے اپنے فرزند محمد امیرالدین کے لیے تصنیف کیا تھا۔ ان کی زبان ان کے معاصر شعرا و ادبا کے مقابلہ میں زیادہ قدیم معلوم ہوتی ہے۔ نمونہ درج ذیل ہے:

''خدا فرماتا ہے تحقیق پیدا کیا میں انسان کے تئیں اور پچھانتا ہوں جو کچھ اندیشہ کرتا ہے، بچہ دل کے اور نزدیک ہوں میں اس کی رگ گردن سوں۔ اوس رگ کوں شاہ رگ بولتے ہیں۔ یعنی پادشاہ ہے رگوں کا۔ دل اور دیدے سوں ملیا ہوا۔ ذات اللہ اقرب الانسان۔ یعنی ہستی اللہ کی نزدیک ہے طرف انسان کے اور خدا کہیا نزدیکی کا علم لدنی ہے یعنی علم نزدیکی کا۔ **العلم نقطة** کی خبر دیا ہے۔ **الحمد لله رب العالمين** ۔ شکر اور ثنا خاص اللہ تعالیٰ کے تئیں کہ او ذات اللہ کی رب ہے عالم کا۔ یعنی رب ہے مربوبوں

کا۔اسم رب کا تقاضہ رکھتا ہے مربوب سوں۔سوائے مربوب کے رب کا ظہور نہیں۔سوائے رب کے مربوب کوں وجود نئیں۔یکتائی ربوبیت (کی)اوردوتائی مربوبیت کی ظاہر کیا۔''

(شاہ صدرالدین،مرأت الاسرار،مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری،بنگلور،1944ء،ص 11-10)

سلطنت خداداد میسور کے خاتمہ کے بعد یہاں اردو(دکنی)نظم ونثر کی تخلیق کا سلسلہ یکلخت ختم نہیں۔بعد کے زمانہ میں یعنی عہد راجگان کے دوران بھی علاقہ میسور سے قادرالکلام شاعر اور ادیب اُبھرتے رہے جنہوں نے دکنی نثر کی آبیاری میں اہم حصہ لیا۔اگرچہ ان کی زبان اور اسلوب بیان شمالی ہند کے اثرات واضح ہونے لگے تھے تاہم دکنی رنگ ہنوز برقرار تھا۔

15.7 فورٹ سینٹ جارج کالج کی نثری خدمات

ایسٹ انڈیا کمپنی نے یورپ سے آنے والے انگریز ملازمین کی تعلیم وتربیت کے لیے 1812ء میں مدراس میں فورٹ سینٹ جارج کالج کا قیام عمل میں لایا۔فورٹ سینٹ جارج کالج نے بھی دکنی زبان وادب کی نشرواشاعت میں اہم حصہ لیا۔چونکہ مدراس' گوا' میسور اور ارکاٹ میں متعینہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں کا صدر مستقر (ہیڈکوارٹر)مدراس تھا۔اس لیے ان کی تعلیم وتربیت کے لیے جو زبان منتخب کی گئی وہ اس علاقہ کی اردو یعنی دکنی زبان تھی۔یہاں مختلف علوم وفنون ریاضی' تاریخ' جغرافیہ' سائنس' قانون وغیرہ سے متعلق جو درسی کتابیں لکھوائی گئیں' وہ مروجہ دکنی میں تھیں۔ یہ بات نہایت تعجب خیز ہے کہ انیسویں صدی میں دکن کے شعراء نے شمالی ہند کے اردو محاورے کو قبول کرلیا تھا اور ریختے میں دادِسخن دے رہے تھے لیکن یہاں کی نثر میں دکنی روایت کا تسلسل باقی تھا۔اس زمانہ میں دکنی زبان کے مصنفین نے فارسی کی بہت سی داستانوں کو دکنی کا جامہ پہنایا۔فورٹ سینٹ جارج کالج میں لکھی گئی دکنی داستانوں میں دکنی انوار سہیلی' حکایات جلیلہ' سنگھاسن بتیسی اور قصہ ملکہ زماں وکام کندلہ مشہور ہیں۔ذیل میں ان داستانوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

دکنی انوار سہیلی: انوار سہیلی ملاّ حسین واعظ کاشفی(متوفی 1505ء)کی فارسی تصنیف ہے جسے عالمی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔یہ دراصل سنسکرت کی مشہور کتاب ''پنچ تنتر'' کا فارسی روپ ہے۔ابراہیم بیجاپوری نے دکنی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔

محمد ابراہیم بیجاپوری فورٹ سینٹ جارج کالج میں منشی تھے۔انہوں نے ایک انگریز عہدیدار تھامس ہنری منک کی فرمائش پر 1822ء میں فارسی انوار سہیلی کا دکنی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام ''دکن انجن'' رکھا لیکن فورٹ سینٹ جارج کالج کی مجلس انتظامی کے حکم سے یہ کتاب ''دکنی انوار سہیلی'' کے نام سے 1824ء میں کالج کے مطبعے سے شائع ہوئی۔اس کتاب کے ترجمے کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجی افسروں کو دکنی زبان سے واقف کروانا تھا۔

منشی ابراہیم بیجاپوری نے انوار سہیلی کا ترجمہ اس دور میں کیا جب دکنی زبان کا چلن کم ہوتا جارہا تھا اور شمالی ہند کا محاورہ تیزی سے اس کی جگہ لے رہا تھا۔اس سے تقریباً بیس سال قبل باغ وبہار جیسا اردو نثر کا شاہکار وجود میں آچکا تھا۔دکنی انوار سہیلی اسی سال طبع ہوئی جس سال رجب علی بیگ سرور نے ''فسانہ عجائب'' میں مسجع ومقفیٰ اور رنگین اردو نثر کا بے مثال نمونہ پیش کیا تھا۔لیکن ابراہیم بیجاپوری کی زبان اور اسلوب باغ وبہار اور فسانہ عجائب سے بالکل الگ اور قدامت کی گہری چھاپ لیے ہوئے ہے۔اس میں دکنی الفاظ' محاورات اور دکنی گویائی کی کثرت ہے کیونکہ ابراہیم نے

بڑی محنت اور عرق ریزی سے دکنی الفاظ اور محاورات کا اکتساب کیا تھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے بقول ''قدیم اردو میں لسانی اعتبار سے سب سے اہم تصنیف منشی محمد ابراہیم بیجاپوری کی ''انوار سہیلی'' کا دکنی اردو میں ترجمہ ہے۔ جس کی زبان کیا بہ اعتبار صرف' کیا بہ اعتبار نحو اور کیا بہ اعتبار فرہنگ وجہی کی اس زبان کا تسلسل ہے جو اس نے ''سب رس'' میں استعمال کی ہے۔ (مضمون قدیم و جدید اردو کی کشمکش سرزمین دکن میں' مشمولہ مقدمات شعر و زبان' حیدر آباد' 1966ء' ص 198)

دکنی انوار سہیلی کی نثر کا نمونہ درج ذیل ہے۔

''دابشلیم فجر پچ ہشیار ہو کر نہا دھو کر سواری سوں تلاٹے کدھن چلایا' بستی سوں پہاڑ کے دامن میں جنگل پکڑ کو چلایا تو وہاں ایک بڑا ڈونگا غار دسیا۔ اس کے کڑے کے پو ایک بزرگ بیٹھا تھا۔ بادشاہ دل میں اس سوں مل بیٹھنا کر کو جھانسا۔ اُنے اس بات کو جان لیا کہ سوچ بولنے لگیا کہ مجھ غریب پر مہر کرنے کو آئے تو بہت بھلا ہے۔ پادشاہ اس کنے جا کر میرے خاطر خدا کے پاس دُعا منگ کر کو بولیا۔ جب چلانے کھڑا رہا تب فقیر بولیا میرے کنے تمنا دینے کو ویسی کچھ چیزنیں ولے میرے باپ کا بستار خزانہ یہاں گڑیا ہے۔ اس میں نورتن بھی بستار ہیں۔ مجھے کیا کرنے۔ تمیں لے کر گئے تو میری بڑی خوشی ہے۔ اچھا کر کو اسے کھودنے خاطر بول دیا۔ بیلداراں آ کر کھودنے لگ گئے۔

حکایات الجلیلہ ترجمہ الف لیلتہ ولیلتہ: پنچ تنتر کی طرح ''الف لیلتہ ولیلتہ'' بھی عالمی ادب میں نہایت مقبول ہے۔ مدراس کے منشی شمس الدین احمد نے الف لیلہ کی دوسو کہانیوں کا دکنی میں ترجمہ کیا۔ منشی شمس الدین احمد' فورٹ سینٹ جارج کالج میں مدرس تھے۔ وہ عربی' فارسی اور اردو میں مہارت رکھتے تھے اور انگریزی بھی جانتے تھے۔ انہوں نے کالج کے رکن اول جان اسٹوکس کی فرمائش پر الف لیلہ کے ترجمے کا بیڑہ اٹھایا۔ ان کے پیش نظر شیخ احمد بن محمود کی عربی الف لیلہ ولیلہ تھی۔ شمس الدین نے ابتداء میں اس کی سو کہانیوں کا راست عربی سے دکنی میں ترجمہ کیا جو 1836ء میں مدراس کے چھاپہ خانے سے شائع ہوا۔ یہ اس کی پہلی جلد تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مزید سو کہانیوں کا ترجمہ کیا جو دوسری جلد کی شکل میں 1839ء میں مدراس ہی سے شائع ہوا۔ منشی شمس الدین کی حکایات الجلیلہ کی تاریخی اہمیت ہے کیونکہ یہ الف لیلہ ولیلہ جیسی مشہور و مقبول داستان کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے بعد کئی ترجمے منظر عام پر آئے۔

منشی شمس الدین نے الف لیلہ کے ترجمے میں سادہ' سلیس اور بامحاورہ دکنی زبان استعمال کی ہے جو اہل دکن کے عام محاورے کے موافق ہے۔ انہوں نے عربی و فارسی الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں لیکن قواعد میں وہ دکنی مصنفین کی پیروی کرتے ہیں۔ حکایات الجلیلہ کے اسلوب کا مطالعہ لسانیاتی نقطہ نظر سے بہت دلچسپ ہے۔ اس میں دکنی اسلوب اور شمالی ہند کے اسلوب کی کشمکش محسوس ہوتی ہے۔ نمونہ درج ذیل ہے:

''سخن کا نقاش اس حکایت کی تصویر کو صفحہ بیان پر یوں کھینچا ہے کہ اگلے زمانہ میں ایک بادشاہ تھا۔ دلیر و صاحب تدبیر' عدل و سخاوت میں بے نظیر' روئے زمین کے بادشاہوں کو اپنی شجاعت و بہادری سے عاجز و فرماں بردار کر رکھا۔ دوست تھا عدل و انصاف کا' دشمن ظلم و اسراف کا' نام اس کا شہر یار' دارالخلافت اس کا سمرقند عجم۔ اس کو ایک بھائی تھا عمر میں چھوٹا ذہن و چالاکی میں بڑا۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ بادشاہ شہر یار اپنے بھائی کو جس کا نام شاہ زماں تھا' دیکھنے کا مشتاق و آرزومند ہوا''۔ (بحوالہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر' دکنی نثر کا انتخاب' دہلی 1904ء' ص 152)

سنگھاسن بتیسی: سنگھاسن بتیسی سنسکرت الاصل داستان ہے جس کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ یہ بتیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں چتر بھوج داس نے سنسکرت سے فارسی میں اس کا پہلا ترجمہ کیا اور اس کا نام ''شاہ نامہ'' رکھا۔ چتر بھوج داس کے فارسی شاہ نامہ کا ایک دکنی ترجمہ بھی ملتا ہے جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ اس کے مترجم کا نام نامعلوم ہے۔ ''قیاس ہے کہ یہ ترجمہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے لیے ہوا تھا۔ کیونکہ مترجم نے اس کا ترجمہ ''دانش مندان'' اور ''صاحب کمالوں'' کے لیے کیا تھا۔ اس طرح کے الفاظ اس زمانہ میں استعمال ہوتے تھے۔ (بحوالہ: ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال' ایسٹ انڈیا کمپنی کے علمی ادارے۔ حیدرآباد' 2003ء' ص 152)۔

کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد) میں بھی دکنی سنگھاسن بتیسی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جس کا سنہ کتابت 1217ھ مطابق 1802ء ہے۔ مترجم اپنی زبان کو ''دکھنی'' کہتا ہے: دکنی سنگھاسن بتیسی کی نثر کا نمونہ درجِ ذیل ہے:

> ''جب راجہ بھوج تخت کے تئیں طرف دھارانگر کے لے گیا۔ یک باندی خبردار کو بلا کر ساعت حاصل کیا کہ اُوس تخت پر بیٹھے۔ یک پتلی نام اس کا جنپا تھا' یک مرتبہ کہی کہ اے راجہ بھوج یہ تخت راجہ بکرماجیت کا ہے۔ جو کوئی مانند اوس راجہ کے سخاوت کرے وہ لایق ہے کہ اس تخت پر بیٹھے۔ راجہ پوچھیا وو حقیقت سخاوت کی کس طرح سے ہے۔ تب پتلی کہی کہ اوجین نام شہر کا ہے۔ نہایت آباد و خوش آب و ہوا رکھتا ہے۔ اور حویلیاں لوگوں کی بہوت رنگین اور صفائی سے آراستہ ہیں۔ اور ساکنان اس جگہ کے نہایت خوش وقتی اور جمعیت سے رہتے ہیں۔ اور حلقہ اوس کا مانند فولاد کے استواری اور بستی اوس کو بہت بہتر اور نادر ہے۔''

ملکہ زمان و کام کندلہ: یہ داستان مدراس کے فورٹ سینٹ جارج کالج کے کسی منشی کی تصنیف ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں محفوظ ہے لیکن اس میں داستان کے مصنف کے نام اور سنہ تصنیف کی وضاحت نہیں ہے۔ البتہ ترقیمے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا سنہ کتابت 1234ھ (مطابق 1819ء) ہے۔ اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ داستان 1819ء یا اس سے قبل کے زمانہ میں لکھی گئی۔ یہ داستان (184) صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے مصنف نے (14) عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ ہر عنوان داستان کے ایک نئے موڑ کی نشاندہی کرتا ہے۔ داستان کی تمہید میں مصنف نے لکھا ہے کہ یہ نثری قصہ ''جواہر سخن'' نامی مثنوی سے ماخوذ ہے۔ وہ اپنی زبان کو ''محاورہ کرناٹکی'' کہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرناٹک یا مدراس کا باشندہ تھا۔ اس نے یہ داستان نو آموز سرداران والا شان (انگریز افسروں) کے لیے لکھی ہے۔ نثر کا نمونہ درجِ ذیل ہے:

> ''روایت کرنے والے اس طرح بیان کیے' آب خور ایک جا سے اٹھے پر زنجیراں میں جکڑ رکھے تو وہ شخص نہ ٹھہرتا ہے۔ جب شہزادے اور وزیرزادے کا آب خور اٹھا' ویسی قید شدید میں سے ہر دو رہائی پا روانہ ہوئے۔ کہتے ہیں شہزادے اور وزیرزادے میں شرط استوار سفر کا ہوا تھا۔ وزیرزادہ اسی شب کو قید خانہ سے اپنے گھر میں جا کچھ زر جواہر موافق خواہش اپنی ہم دست کر گھوڑوں کے طویلے میں آ خاطر خواہ دو گھوڑے تیار کرا۔ ایک پر سوار ہو دوسرا گھوڑا ہاتھ میں پکڑ روانہ ہوا۔ اس جا شہزادے کی انتظاری کرتا رہا۔''

دکنی میں نثر نگاری کی روایت کے جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس زبان میں شاعری کے مقابلے میں نثر کا سرمایہ نہایت قلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ دکنی میں بیشتر رسائل کا موضوع تصوف ہے۔ تصوف سے ہٹ کر دیگر موضوعات پر نثر میں بہت کم لکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ دکنی میں پہلا نثری رسالہ تصوف سے متعلق تھا اس کے بعد صوفیا ہی نے نثر نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا اس لیے دکنی نثر میں متصوفانہ رسائل کی بہتات ہے۔ خصوصاً بیجاپور کا سارا نثری اندوختہ تصوف پر مبنی ہے۔ گولکنڈے میں وجہی نے سب رس کے ذریعے اس روایت سے انحراف کیا۔ سب رس کو نہ صرف دکنی نثر بلکہ پوری اردو نثر کی تاریخ میں کئی امتیازات حاصل ہیں۔ یہ اردو کی پہلی داستان، پہلی تمثیل، مسجع ومقفیٰ عبارت آرائی کا پہلا نمونہ اور بہ حیثیت مجموعی اردو نثر کا پہلا خالص ادبی نقش ہے۔ وجہی کے اس تجربے کو اس کے ہم عصر دور میں شاید مقبولیت نصیب نہیں ہوئی اس لیے کہ اس دور میں کوئی اور نثری داستان نہیں لکھی گئی لیکن بعد کے دور میں فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس میں نثری داستانیں لکھی گئیں۔ دکن میں نثر کی بہ نسبت منظوم داستانیں زیادہ مقبول رہیں۔ کلمۃ الحقایق کی لڑکھڑاتی، شکستہ اور ناہموار نثر سے سب رس کی سلیس ورواں اور دلکش وتوانا نثر تک دکنی نثر نے ایک لمبا سفر طے کیا۔ گولکنڈہ میں نثر نگاری کی روایت میں ایک نیا تجربہ یہ بھی ہوا کہ یہاں ترجمے کا آغاز ہوا۔ میراں جی خدا نما نے حضرت گیسودراز کی تصنیف شرح تمہیدات ہمدانی کا ترجمہ کیا جو ایک طرح سے آزاد ترجمہ کہا جاسکتا ہے۔ ان کے مرید میراں یعقوب نے سیکڑوں صفحات پر مشتمل شمائل الاتقیا کا فارسی سے دکنی میں ترجمہ کیا۔ ان ترجموں سے دکنی نثر میں نہ صرف لفظیات وتراکیب اور اصطلاحات کا اضافہ ہوا بلکہ اس میں اظہار وابلاغ کے نئے سانچے وجود میں آئے جس کے نتیجے میں نثری اسلوب کی جمالیات اور اثر آفرینی میں بھی ترقی ہوئی۔

دکن میں بیجاپور اور گولکنڈے کو سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور ادبی مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اورنگ زیب عالم گیر کی تسخیر دکن کے نتیجے میں یہاں کی تہذیبی بساط اجڑ گئی۔ شاہی دربار کی سرپرستی نہ رہی تو یہاں کے شعرا، ادبا، اور دیگر ارباب ہنر پریشان حال اور آشفتہ روزگار ہوگئے۔ لیکن خوش قسمتی سے جنوبی دکن میں ارکاٹ، ویلور، کڈپہ، سدھوٹ، کرنول اور پھر بعد میں میسور میں جو نوابی خاندان برسراقتدار آئے انہوں نے دکنی شعرا و ادبا کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جس کی بدولت ان علاقوں میں دکنی زبان میں تخلیق ادب کا سلسلہ جاری رہا اور شاعری کے ساتھ کم کم ہی سہی نثری کتابیں بھی لکھی جاتی رہیں۔ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے زوال کے بعد شمال سے لوگوں کی آرجار کا تانتا بندھ گیا۔ ان کے ساتھ شمالی ہند کی اردو کا نیا محاورہ بھی دکن میں پھیلنے لگا لیکن اس کے اثر و نفوذ کی رفتار دھیمی تھی۔ اورنگ آباد چونکہ اورنگ زیب کا مستقر تھا اس لیے وہاں کی زبان محاورۂ شمال سے فوری اور زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کے بعد حیدرآباد کی دکنی پر بھی شمال کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ لیکن کرناٹک اور ٹامل ناڈو کے دور دراز کے علاقوں میں شمالی ہند کی اردو کے اثرات شدت اور سرعت کے ساتھ نہیں پہنچے۔ چنانچہ ان علاقوں کے تخلیق کاروں خصوصاً نثر نگاروں نے دکنی لفظیات، لہجے اور طرز اظہار کو ہاتھ سے جانے نہ دیا یہاں تک کہ کچھ مصنفوں نے دکنی کو اپنی شناخت اور امتیاز کا وسیلہ سمجھا۔ چنانچہ باقر آگاہ اپنی زبان کو دکنی کہتے ہیں اور دکنی شعرا کے ادبی اکتسابات پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح فورٹ سینٹ جارج کالج کے مصنفین، منشی مظفر جنہوں نے 1814ء میں حیدر نامہ (نواب حیدر علی کے حالات) لکھا، منشی شمس الدین احمد جنہوں نے 1836ء میں حکایات الجلیلہ کے نام سے الف لیلہ ولیلہ کا دکنی میں ترجمہ کیا اور سید تاج الدین جنہوں نے 1846ء میں گلدستہ ہند کے نام سے مختصر تاریخ ہندوستان لکھی اپنی زبان کو ''محاورہ کرناٹکی'' کہتے ہیں جو یہاں کے خاص وعام کی زبان ہے یعنی دکنی۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ شمالی ہند کی اردو کو سمجھنے میں اہل دکن کو بڑی دشواری ہوتی تھی۔ چنانچہ فقیر اللہ شاہ حیدر جس نے 1828ء میں تناولی کے نام سے ''بکاولی'' (مذہب عشق) کے قصے کا جواب لکھا کہتا ہے کہ

بکاولی کے قصے کو سمجھنے میں اسے بڑی دقت پیش آئی کیونکہ وہ شمالی ہند کی اردو سے واقفیت نہیں رکھتا تھا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے نصف دوم تک بھی محاورۂ شمال، اہل جنوب کے لیے اجنبی اورغریب تھا، جسے عوام تو درکنار پڑھے لکھے لوگ بھی سمجھنے سے قاصر تھے،لیکن آہستہ آہستہ شمال سے آئی جدیداردو کا حیطۂ عمل اوردائیرۂ اثر بڑھتا گیااوردکن کے اہل علم واہل قلم نے اردو کے جدید روپ کوشعری ونثری اظہار کے وسیلے کے طور پرقبول کرلیا۔تاہم بول چال کی سطح پردکنی الفاظ،دکنی لہجے کی مٹھاس اورنغمگی ہنوز باقی ہے۔

15.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعدآپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ دکنی زبان میں ادب کی تخلیق کا آغاز شاعری سے ہوا۔نثر بعد میں وجود میں آئی۔

☆ بہمنی دور میں شاعری کے نمونے ملتے ہیں، جیسے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔

☆ حضرت عین الدین گنج العالم سے منسوب دکنی رسائل کا وجودنہیں ہے۔حضرت گیسودراز سے منسوب معراج العاشقین ان کی تصنیف نہیں ہے۔ان کے فرزند اکبرحسینی اوردیگرصوفیا شاہ کمال الدین اورشاہ قلندر کے نثری رسائل بھی مشکوک ہیں۔

☆ عادل شاہی دور میں دکنی نثر کا آغاز ہوا،لیکن اس دور سے تعلق رکھنے والے میراں جی شمس العشاق سے منسوب نثری تخلیقات فی الاصل ان کی تصنیف نہیں ہے۔

☆ شاہ برہان الدین جانم دکنی کے پہلے نثر نگاراوران کا رسالہ کلمۃ الحقائق دکنی میں پہلی نثری تصنیف ہے،جس کی تاریخی اورلسانی اہمیت ہے۔ ان کے خلیفہ محمودخوش دہانے بھی نثری رسائل لکھے۔

☆ جانمؔ کے فرزندشاہ امین الدین اعلیٰ کا رسالہ کلمۃ اسرار دکنی نثر کی ترقی کا اشارہ ہے، کیوں کہ اس کی نثر کلمۃ الحقائق سے بہترطور پر مفاہیم کی ترسیل کرتی ہے۔

☆ مخدوم شاہ حسینی بلکانوری کا نثری رسالہ ’’تلاوت الوجود‘‘ بھی دکنی نثر کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے، کیوں کہ اس کے خلاصے کا خلاصہ ’’معراج العاشقین‘‘ ہے۔

☆ گولکنڈے میں نثری تخلیقات کا آغاز قدرے تاخیر سے ہوا۔ ملا اسد اللہ وجہی کی تصنیف نہ صرف دکنی ادب بلکہ پورے اردوادب کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اردو کی پہلی نثری داستان اور پہلی تمثیل ہے۔اس کی عبارت آرائی سے جدید اردو نثر کا راستہ ہموار ہوا۔

☆ میراں جی خدا نما کاروانی دکنی کے بڑے نثر نگار تھے۔نثر میں ان کی تین تصانیف دریافت ہوئی ہیں: ’’شرح تمہیدات عین القضات‘‘، ’’رسالہ وجودیہ‘‘اور’’شرح مرغوب القلوب‘‘۔

☆ میراں یعقوب، خدانما کے مرید تھے، انھوں نے رکن الدین عماد کاشانی کی تصنیف ’’شمائل الاتقیا‘‘ کا فارسی سے دکنی میں ترجمہ کیا، جو سینکڑوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

☆ قطب شاہی اقتدار کے آخری زمانے میں ابوالحسن تاناشاہ کے مرشد شاہ راجو کے ایک مرید نواب الدین عابدشاہ نے شریعت اورطریقت کے موضوع پرنثر میں کتابیں لکھیں، جن میں ’معالجات بندہ نواز‘‘، ’’کنزالمومنین‘‘ اور’’ گلزارالسالکین‘ شامل ہیں۔

☆ گولکنڈے کے بعض غیر معروف مصنفین کی بھی نثری تخلیقات ملتی ہیں۔

☆ مدراس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قائم کردہ فورٹ سینٹ جارج کالج نے بھی دکنی نثر کے فروغ میں اہم حصہ لیا۔اس کالج کا ذریعہ تعلیم دکنی اردو تھی۔ یہاں کی نصابی کتابیں بھی دکنی اردو میں لکھی گئی ہیں۔

☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کا سب سے اہم ادیب منشی محمد ابراہیم بیجاپوری ہے،جس نے انوار سہیلی کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا، جو کالج نے شائع کروایا۔

15.9 کلیدی الفاظ

الفاظ		معنی	الفاظ		معنی
کرن ہار	:	کرنے والا	پچھیں	:	پیچھے
سہج	:	آسان	میچ	:	میں ہی
جدھاں	:	جدھر	کیتک	:	کتنا/ کتنی/ کئی
لوڑے	:	چاہے	دِسنا	:	نظر آنا
تھے	:	سے	ہمنا	:	ہمیں
اَپیں	:	خود	کوں	:	کو
او	:	وہ	جیوں	:	جان/روح
وَھیچ	:	وہ ہی/وہی	مول	:	اصلیت،حقیقت
آفریدگار	:	پیدا کرنے والا	کایکا	:	کس چیز کا
نھن پن	:	بچپن	انپڑنا	:	پہنچنا،سمجھنا
دیساں	:	دیس(دن)جمع	دھرنا	:	رکھنا
سنگات	:	ساتھ	اگوچر	:	جونظر نہ آئے
آدھار	:	سہارا	نرنکار	:	جس کی کوئی شکل وصورت نہ ہو
دھن	:	عورت	چینت	:	غور،فکر
بیگ	:	جلدی/فوراً	جاگا	:	جگہ/مقام
سرانا	:	تعریف کرنا	یو	:	یہ

15.10 نمونہ امتحانی سوالات

15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ معراج العاشقین کس کی تصنیف ہے؟

2۔ شمائل الاتقیا کا دکنی میں ترجمہ کس نے کیا؟

3۔ شمس الدین احمد نے الف لیلہ کی کتنی کہانیوں کا ترجمہ کیا؟

4۔ حضرت عین الدین گنج العلم کے رسائل کی اطلاع کس نے دی؟

5۔ محمود خوش دہاں بیجاپوری کا نثری رسالہ کس نے مرتب کیا؟

15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ میراں جی شمس العشاق سے منسوب نثری رسائل کا تذکرہ کیجیے۔

2۔ دکنی انوار سہیلی کس نے اور کس کی فرمائش پر تالیف کی؟ وضاحت کیجیے۔

3۔ شمائل الاتقیا کا موضوع کیا ہے؟ بیان کیجیے۔

4۔ طوطا کہانی کیا ہے؟ اس کے دکنی ترجمے میں کتنی کہانیاں ہیں؟ تفصیل پیش کیجیے۔

5۔ کلمۃ الاسرار کی زبان اور اسلوب کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سب رس کی ادبی اور لسانی اہمیت پر اظہار خیال کیجیے۔

2۔ کلمۃ الحقائق کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ میراں جی خدانما کے نثری کارناموں کا جائزہ لیجیے۔

15.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	اردو نثر آغاز وارتقا	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ
2۔	دکنی نثر کا انتخاب	ڈاکٹر سیدہ جعفر
3۔	مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما	پروفیسر محمد افضل الدین اقبال
4۔	دکھنی نثر پارے	پروفیسر رفیعہ سلطانہ
5۔	تاریخ ادب اردو (1700ء تک جلد سوم و چہارم،)	پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین

اکائی 16: دکنی نثر کا مطالعہ

(کلمۃ الحقائق ،تعارف: ابتدائی بیس [20] صفحات کا متن مع تشریح)

اکائی کے اجزا

16.0		تمہید
16.1		مقاصد
16.2		کلمۃ الحقائق کا تعارف
16.3		کلمۃ الحقائق کا متن (ابتدائی بیس صفحات)
	16.3.1	شامل نصاب متن کی تشریح
16.4		اکتسابی نتائج
16.5		کلیدی الفاظ
16.6		نمونہ امتحانی سوالات
	16.6.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	16.6.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	16.6.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
16.7		تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید

گزشتہ اکائی میں آپ نے دکنی نثر کی روایت کا بالخصوص برہان الدین جانم، ملا وجہی، امین الدین اعلیٰ اور میراں جی خدا نما کے حوالے سے مطالعہ کیا۔ اس اکائی میں آپ برہان الدین جانؔم کے معروف رسالے ''کلمۃ الحقائق'' کا مطالعہ کریں گے۔ کلمۃ الحقائق کا شمار دکنی نثر کے اولین نمونے کے طور پر ہوتا ہے۔ اس رسالے میں برہان الدین جانؔم نے تصوف و عرفان خدا کے پیچیدہ اور باریک مسائل کو سوال و جواب کے طرز میں بیان کیا ہے۔ عام طور پر انسان خدا، رسولؐ، انسانی ذات وصفات اور دوسرے مختلف متصوفانہ مسائل سے متعلق جن سوالوں کے جوابات جاننا چاہتا ہے ان سوالوں کو برہان الدین جانؔم نے پہلے قائم کیا ہے پھر ان کے جوابات بھی اس رسالے میں پیش کیے ہیں۔ جانؔم نے اپنی اس تصنیف کی زبان گجری بتائی ہے، لیکن انہوں نے اس میں سنسکرت کے تت سم اور تت بھو الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی زبان کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں تو پورے پورے جملے فارسی میں لکھے گئے ہیں۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ کلمۃ الحقائق کا تعارف پیش کر سکیں۔

☆ کلمۃ الحقائق کے متن (ابتدائی بیس صفحہ) کا مطالعہ کر سکیں۔

☆ کلمۃ الحقائق میں پیش کیے گئے تصوف اور عرفان خدا کے مسائل کو بیان کر سکیں۔

☆ شامل نصاب متن کی تشریح کا مطالعہ کر سکیں۔

16.2 کلمۃ الحقائق کا تعارف

''کلمۃ الحقائق'' دبستان بیجا پور کے ایک صوفی بزرگ برہان الدین جانمؔ کی تصنیف ہے۔ جانمؔ کا تعلق صوفی خانوادے سے تھا۔ ان کے والد کا نام ''میراں جی شمس العشاق'' تھا، جو اعلیٰ پائے کے صوفی بزرگ تھے اور انہوں نے متصوفانہ مسائل پر بہت کام کیا تھا۔ برہان الدین جانمؔ نے اپنے والد کا خاصہ اثر قبول کیا اور ''وصیت الہادی''، ''منفعت الایمان''، ''ارشاد نامہ''، ''ہشت مسائل''، ''سکھ سہیلا''، ''کلمۃ الحقائق'' وغیرہ تصانیف یادگار چھوڑیں۔ ان کی سبھی تصانیف کا موضوع تصوف اور عرفان خدا سے متعلق ہے۔

کلمۃ الحقائق کے سنہ تصنیف کا صحیح علم نہیں ہو سکا ہے۔ جانمؔ کی مثنوی ''ارشاد نامہ'' کا تصنیف کا سنہ 990ھ مطابق 1582ء ہے، چوں کہ کلمۃ الحقائق میں ارشاد نامہ کے اشعار ملتے ہیں اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ کلمۃ الحقائق 990ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔ کلمۃ الحقائق کے مرتب محمد اکبر الدین صدیقی کے مطابق کلمۃ الحقائق کے حسب ذیل قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں:

1۔ مولوی عبدالحق صاحب کا نسخہ مکتوبہ 1068ھ جس کی نقل خانہ خانقاہ عنایت اللہی میں موجود تھا۔

2۔ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد ایک نسخہ

3۔ کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد ایک نسخہ

4۔ کتب کانہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد ایک نسخہ

5۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ایک نسخہ

6۔ ایک نسخہ مولوی سید محمد مورخ بیدری کے پاس بھی تھا۔

اس میں بلحاظ تاریخِ کتابت (1068ھ) سب سے قدیم نسخہ مولوی عبدالحق کا ہے اور اس کے بعد ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ کا نسخہ بھی بہ لحاظ تحریر و کاغذ وغیرہ بہت قدیم ہے۔ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد میں موجود نسخہ میں حسب ذیل ترقیمہ شامل ہے:

> ''خاتمہ: تمت تما شد بتاریخ بست و نہم ماہ ذالحجہ روز دوشنبہ بوقت یک پہر چار گھڑی درگاہ میراں صاحب نوشتہ شد ایں کتاب کلمۃ الحقائق بہ سرکار حضرت صاحب است ہر کسے دعویٰ کنہ گنہ گار شرع باشد۔''

اس طرح اس مخطوطے کی کتابت دوشنبہ 29/ذلحجہ کو یک پہر چار گھڑی پر ختم ہوئی لیکن سنہ موجود نہیں ہے۔ عام طور پر قدیم دکنی کے بیشتر

تصانیف اور رسائل کے قلمی نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن کلمتہ الحقائق کے جتنے بھی مخطوطے دریافت ہوئے ہیں ان میں کوئی اہم اختلاف دیکھنے کو نہیں ملتا۔ یہ اس رسالے کی بڑی خوبی ہے۔

کلمتہ الحقائق اپنے عہد کی دوسری تصانیف کے مقابلے میں دو اہم خصوصیات کی وجہ سے منفرد ہے۔ ایک اس کی لسانی خصوصیات اور دوسری موضوعی خصوصیات۔ برہان الدین جانم نے اس کتاب کی زبان کو ''گجری'' سے تعبیر کیا ہے، لیکن اس میں عربی، فارسی، سنسکرت، دکنی (اردو)، مراٹھی، گجراتی وغیرہ زبانوں کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ ان میں بعض زبانیں ایسی ہیں جو اپنے ابتدائی مرحلے میں تھیں۔ اردو زبان کے عہد طفلی کے اثرات اس کتاب میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ گویا اس کتاب کو دکنی اردو کے نقش اولین میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ محققین کا خیال بھی یہی ہے کہ کلمتہ الحقائق کی زبان اور الفاظ دکنی الفاظ و بولی کی خصوصیات لیے ہوئے ہے۔

کلمتہ الحقائق کا موضوع تصوف ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بزرگان دین کا بنیادی مقصد بندوں کو اللہ سے قریب کرنا، دین اسلام کا پیروکار بنانا اور اللہ کی قدرت سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ مورخین کا یہ ماننا ہے کہ جب یہ کتاب لکھی گئی اس وقت یہ صورت رہی ہوگی کہ اسلامی تعلیمات اور صحیح نظریے کو اپنے فلسفیانہ و منطقیانہ زور بحث سے مجروح و مشکوک کرنے والوں کے مقابلے میں صحیح و صداقت پر مبنی بات جاننے کے لیے آپ کی خدمت میں سوالات رکھے گئے ہوں گے اور کلمتہ الحقائق کی صورت میں آپ نے ان کے جوابات پیش کیے ہوں گے۔

کلمتہ الحقائق کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہو جاتی ہے کہ اس میں برہان الدین جانم نے اللہ رب العزت کی احدیت و ابدیت، قدرت و اختیار، شکل و صورت سے اس کی ذات کے منزہ ہونے، اس کے عالم الغیب والشہادہ ہونے، اس کی معرفت کے طریقے کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔ اس کتاب میں دوسری بحث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت پر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نبیؐ پاک کے نور کو پیدا کیا اور پھر پوری کائنات کی تخلیق اسی نور سے کی۔ اس ضمن میں اللہ کے نور ہونے کی حقیقت، حضورؐ کی نورانیت بلکہ آپ کے نور من نور اللہ ہونے اور عام انسانوں کے جسم میں موجود نور بشکل روح کی حقیقت اور اس کی بنیاد پر جملہ خلائق پر انسان کی فضیلت پر برہان الدین جانم نے جو عالمانہ و عارفانہ بحث کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

کتاب کے آخر میں برہان الدین جانم نے تصوف کے بعض اصول و طریق مثلاً مراقبہ اور مشاہدہ، ذکر جلی و ذکر خفی، اسمائے الٰہی کے ذکر کے طریقے اور اس کے فوائد اور قلب کی صفائی و لطافت اور اس راہ کے سالک کے لیے مرشد کامل کی ضرورت کو بھی بہت اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلمتہ الحقائق کی اہمیت و افادیت دور حاضر میں موضوعاتی اعتبار سے نہ صرف مسلم ہے بلکہ مزید بڑھ گئی ہے، لیکن لسانی تبدیلیوں کی وجہ سے عام قاری بلکہ اہل علم بھی اس استفادہ کرنے سے قاصر ہیں۔

16.3 ''کلمتہ الحقائق'' کا متن (ابتدائی بیس صفحات)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کرے سو ہوئے کہ قادر توانا توئی کہ اوقدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرنہار سہج سہج سو تیر اٹھار۔ و سہج ہوا بھی توج تھے بار۔ جدھاں کچھ نہ تھا بھی تھا تہیں دوجا شریک کوئی نہیں۔ ایسا حال سمجنا خدا تھے خدا کوں، جس پر کرم خدا کا ہوے سب۔ یوزبان گجری (زبان) نام ایں کتاب کلمتہ الحقائق خلاصۂ بیان و تجلی عیاں روشن شود انشا اللہ تعالیٰ کہ خدائے تعالیٰ قدیم القدیم کیوں تھا۔ ذات وصفات وکل مخلوقات ابتدا و انتہا، باقی و فانی، قدیم و جدید،

باہمہ وبے ہمہ، بدیں سبب سوال وجواب روشن کردیکھلایا ہے۔ انشااللہ تعالیٰ کہ خدائے تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ خدائے تعالیٰ کی نظر ادراک کرنہاری ہے۔ جملہ مخلوقات پر، کہ وہاں ہماری نظر نہیں انپڑ نہاری ہے ذات قدیمی پر۔ اگر کوئی اوس کے قدیمی بوجھے تو شریک کھڑا رھیا۔ اس سبب فرمایا کہ قال اللہ تعالیٰ "لَا تُدْرِكُهُ الْأَ بْصَارُ وَهُوَيُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَا اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ". ایسا کسی کا مجال ہوے گا کہ پچھان ذات کا کرے گا۔ کہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "تَفَكَّرُ وْافِيْ صِفَاتِ اللّٰهِ وَلَا تَفكَّرُ وْافِي ذَاتِ اللّٰهِ." ولیکن جیسے خدا لوڑے اسے راہ دیوے اپس میں کہ "يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ" امید دیکھلایا و مدد کیا کہ قوله تعالیٰ: "والَّذِيْنَ جَاهَدُ وا فِيْنَا لَنَهْدِ يَنَّهُمْ سُبُلَنَا". تو جہد کشش کرے خدا میں خدا تھے کہ قال علی کرم اللہ وجہہ کہ عَرَفْتُ رَبِّي برَبّي.

سوال: کہ خدائے تعالیٰ اول تھے اول کیوں ہے؟

جواب: قدیم تھے قدیم اول تھے اول اپیں تھا۔

سوال: کہ کیوں تھا و کہاں تھا؟

جواب: بے چوں وبے چگونہ تھا و چون و چرا نہ باید گفتن ولیکن ہستی باقی لاشک ولاشبہ۔

سوال: او کہاں تھا کہیں تو تعلقات جا گاسوں دھرتا تھا بھی؟

جواب: تیرے بھی وقت سوں تعلق دھرتا ہے تو اس ہر شے کا آفریدگار و ہچ جان اور اس جا گا کا سب کا آفریدگار وہی پچھان، اس تھے اول، واول کا بھی اول وآخر، قدیم وجدید، سب اس تھے بے زبان ہوتا۔ اس تھے بول میں آیا کہ اول تھے اول ہے جملہ مخلوقات تھے لامکان ہے۔ کہ چنانچہ خواجہ روم او خواجہ شبلی پرسید "قال ماالتوحيد؟ قال من أجاب عن التوحيد فَهُوَ مُشْرِكٌ ولم يعرِفْ ذٰلک فَهُوَ كافِرٌ. وسأل عنه فهو جاهلٌ".

سوال: پس سمج نہیں کیوں قرار دینا و تحقیق کوں کیوں انپڑنا کہ کچھ نہیں پس کیوں؟

جواب: اے عارف تو مخلوق ہے۔ تیرا تعلق ورہنا یک جا گاسوں تعلق دھرتا ہے کہ توں بندۂ عاجز بے قدرت وخدائے تعالیٰ کوں یہ آرزومندی نہیں کہ توں بے قدرت، وخدائے تعالیٰ باقدرت اپس سوں اپے تھا۔

سوال: قدرت کیا؟

جواب: خدا اپنا کہ من خداوندیم، "اني أنا اللهُ" جس فرمایا آن منی بر ہمہ منی باشد۔

سوال: درقدرت وخدا فرق چہ باشد؟

جواب: کہ قدرت تعلق بافعل دارد۔ کہ اپنے فعل پر نمودار شاہد باشد واللہ تعالیٰ از منی خود واپنے فعل تھے منزہ ودر پنہاں گنج باشد حدیث قدسی کہ كنتُ كَنْزاً مَخْفِياً فأحبَبْت ،اَن أُعْرفَ.

سوال: پس آں گنج را چگونہ باید شناخت؟

جواب: کسے را کہ او خواہد۔

سوال: پس جہد اپنا کیا نہیں؟

جواب: جہدا اپنا ہے کہ فاعل مختار کیا ہے۔ قدر حال اس کا جان اپنا اس کوں دیا ہے ولیکن توفیق الی الله.

سوال: پس کیا کیں شناس ہوے ذات کا؟

جواب: اس باب نبیؐ ہمارے فرمائے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ".

سوال: تو میں کون؟

جواب: توں نور محمد کا صلی اللہ علیہ وسلم۔

سوال: کہ کیوں کہو مجکوں؟

جواب: اول آفرینش نبیؐ نور دیکھ کہ چگونہ آشکارا کرد بعدۂ تمام عالم واشیا اس نور تھے بار کیا۔ یوں منقول جنایا قول علیہ السلام۔ أنا مِنْ نور الله و كل شيءٍ مِنْ نورِيْ.

سوال: جد کچھ نہیں کیا تھا؟ آپیں آپ تھا۔ پس نور نبیؐ کیا کیوں ظہور؟

جواب: سن کی اللہ تعالیٰ مخفی گنج تھا۔ در امرامنیت درخودی خود، نہ پنہاں نہ اظہار، نہ آکار نہ نرنکار، نہ جلال نہ جمال، نہ شوق نہ ذوق، نہ یاد نہ فراموش، نہ رنج نہ گنج، ولیکن گوید کہ امر امنیّت المقصو د، مقصود پس درخودی خود ارادت کر و مثل ہچوں تخم در زمین غبار گرفت بعدۂ انگور جنایا تخم تھے دکھایا کوم، وآں غبار کہ درقدرت پنہاں بود و چوں از تخم بیروں آمد وآں قدرت کہ پنہاں بود اظہار شد کہ اسم اللہ در آ گاہ خود۔ آ گاہ جے ذات کا آ گاہ پنا، سو قدرت جدید و در غبار اول ذات قدیم۔ برائے آں عارفاں می گویند کہ قدیم وجدید اوست پس پوچھ بعدۂ پوچھو مد انکہ اسم اللہ کہ من اللہ درخود اظہار کرد بعدۂ برقدرت منی آں گنج کہ پنہاں بود شاہد شد برخودئی خود بعد ازاں میانِ ہر دو عشق افروخت۔

جوں کی لکڑی بھیتر آگ بھڑکا، نیکلیا، جیوں کہ جاگ
بازو عشق تھے کرنے سار کیتا نور نبیؐ کا بار

جان اے عارف! خدا میں واس کی قدرت میں کچھ فرق نہیں بلکہ اوسو قدرت، قدرت سواو، چنانچہ یک است جیوں کی کافور ہور خوشبوی در گل یا شیریں جیوں کی شکر یا بوئی در دونی نہ کہتیں کھری یک۔ نہ کہے جائیں دو۔ کیا تابش جوہر کی جوہر تھے جدا ایسا معمہ خلاصۂ جز مرشد نہیں۔ ایسا ذات دوپنے بغیر یکسو۔ محمدؐ نوراسی کا دیکھ کہ ان لوڑیا کہ اپسیں اپیں دیکھوں کہ عشق کا غلبہ تو کرنے ہوا سار تو قدرت سوں نظر کیا اگو چرکی آرسی کیا۔ سن نرنکار کی۔ اس ہوا تھے وہ ہوا آدھی۔ جہاں نور محمدؐ کیا شاد ہے۔ پس آں ہوائے صفارا آئینہ ساخت ومشاہدہ خود بخود دید۔ چوں ذات اللہ شاہد است وہم ثانی شاہد، نور محمدؐ در آئینہ صفا کی امرارادت تھا کی، کن فیکون وجان اے عارف! نہ کاف ونون کون جا گا اس میں۔ اس پنے میں اظہار نور در صفا ہوا ولیکن درکلمۂ کن فیکوں معذور ہے۔ پس و پر تو ذات کا سو نور محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم قدرت سوں چینت کر شاہد کیا محمدؐ کے نور کوں۔ پس از شاہد نور ہمہ نور را آفرید۔ کہ انس وجن وملک و ہمہ عالم شد وآن ہچوں چراغ از چراغ افروخت وآں نور را روح القدس گویند۔ برائے آں محمدؐ نور را ابوالا رواح گویند۔ پس ثابت شد کہ أ نا مِن نور الله وَ كُلُّ شِيءٍ مِن نُوري سبحانهٗ و تعالیٰ۔ اس نور کے عشق تھے لطافت کیا پس لوڑیا کی ظہور کروں بادز اس صفا تھے ہوا کیا، وہوا تھے باؤ کیا، وباؤ تھے آگ کیا، وآگ تھے پانی کیا، وپانی تھے خاک کیا کہ جز ہوا باؤ کوں جا گا نہیں وجز باؤ آگ کوں پرورش نہیں وجز گرمی پانی کوں جوش اظہاری نہیں وجز پانی زمین کوں وجود نہیں۔

سوال: کہ تحقیق کیوں؟

جواب: کہ قدرت میں کل موجودات اما حکیمے حکمت دیکھلایا یا سمجا لوڑے کہ خاک تھے سنگ وشجر بارولیکن ہمہ خاک است۔ جان، اے عارف ایکس میں یک چیز ہیں سب فنا بھی، یکس میں یک ہونہارے ہیں زمیں پگلے تو پانی میں مل جائے۔ پانی کا ہیزم آگ میں، آگ کا ہیزم باؤ میں، باو کا ہیزم ہوا میں، ہوا کا ہیزم صفا میں، صفا کا ہیزم قدرت میں، قدرت کا ہیزم ذات قدیمی میں۔ جان، اے عارف! جے چیز جہاں تھے آیا وہاں چہ فدا ہونہارا ہے دِسنے میں دو۔ آپس تھے فدا ہونے میں یک جیبوں جل ہولے کوں کیا جدائی وجود دوسرا ولے پانی تو یک بیت، تو ایسی قدرت بار۔ یوکے عناصر چار، پس وہ نور محمدؐ وآں گوہر لطیف درصدف خاک نہاد، باترتیب چہار عناصر آمیختہ کرد، اللہ تعالیٰ اپس تھے، وقدرت تھے ان دو کا بستار عالم آشکارا کہ یکس تھے یک کہیں، پن دوتو کچ نہیں۔ قدرت وخدا، یک میں دوتشبیہ جیوں یک قلم جز چیز سیں کیوں بھی ایسا رمز، خدا وقدرت کے ملن میں عالم ہوا کہ جز دوتِسرا نہیں......الثالث بالخیر۔

عجب قادر قیوم کہ در شکم قدرت عالم را بیرون آورد ہمچو فرزند از شکم مادر زاید تو عالم فرزند خدا کا۔

سوال: تو کلام ربانی خبری وہد کہ'' **لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُولَدْ**''۔

جواب: اے عارف! جیوں بکار مخلوق کا یو تشبیہ نہیں ملتا وہاں یہ عالم کیوں ہوا۔ کام، کام نہیں تشبیہ جیوں کی سریا کنتہ آفتاب تھے پڑے آگ۔ یوقدرت تھے عالم اٹھے جاگ پس اینجا صحیح نماید۔ نہ کسے زادش اورانہ کسے از وے زاد۔ ذات اللہ تعالیٰ منزہ ہے وتمام آفرینش دوستی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھا خبر **لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَ فْلَاکَ** ۔ پس اے عارف! توں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس خاک میں ظہور دیکھلایا تا کلام ربانی کہ **اللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ مَثَلُ نُورِہٖ کَمِشْکَاۃٍ فِیھَا مِصبَاحٌ** ۔ تا آں گوہر قدیم در خاک نمود۔ جز پچھان شناس نہیں وپچھان کیے نا اندھلا کہیں کہ اللہ تعالیٰ بندہ پر دو چیز فرض کیا۔ اپسیں پچھانا اور خدا کوں۔ حدیث نبی علیہ السلام۔ **من عرف نفسہ فقد عرف ربہ.**

سوال: اپنا پچھان کیوں؟

جواب: کہ توں نور قدیم ازل ازلی، اپنے وجود میں تفکر کہ میں کون؟

سوال: میں خاک کہ **خُلِقَ الاِنْسَانُ مِنْ طِیْنٍ.**

جواب: کلامِ ربانی حق ہے۔ اما فکر کیا لوڑے کہ میں وقتِ میثاق تھے ہوں کہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ **خَلَقَ الْاَرْوَاحَ مِنْ قبلِ الْاَجْسَادِ**۔ وپس جان کہ توں گوہر کہنہ قدیم است۔ تر اظہور راز خاک است۔ اس سبب کلام ربانی **مِنْ طِیْنٍ** واگر نطفہ بدانی کہ **خلق الانسان من نطفتہ**۔ پس فہم کن کہ آدم علیہ السلام را بیا فرید آں وقت نطفہ کجا بود تا ایں کلام ربانی سرشت حکمتاں را۔ انسان کو یو دیکھلایا ولیکن اوس کی قدرت میں کچ مشکل نہیں کہ اس کے من سنگھار۔ ومن میں اُتپت پس قدرت میں اشکلاۃ کچھ نہیں سب باب سکتا قادر ہے۔ وعیسیٰ از شکم مریم آنجا نطفہ کئے۔ وملائکاں وحوراں جیو پنے میں شک نہیں کہ نور قدیم اس نور تھے جن وانس وملک تو نور پر بُرقا قدرت کا وجود کیا تو نور ہوائے صفا تھے نمودار ہوا وقت میثاق کوں، پس فکر کن کہ روح قدیم اول آدم کا خاکی بر قامرتب کیا۔ بعدۂ روح پر امر ہوا کہ وجود میں دخل کر پس روح آدم خوف کرد در ظلمات، پس فرمان شد کہ **اُدْ خل کراھیتۃً و اُخْرُج کرا ھیتۃً** پس جوں دخل کیا۔ امر شد ملائکہ را کہ **اَسجُدُ وا لِآدَمَ** نہ کہ امر بر خاک۔ امر برروح لطیف گوہر قدیم۔

سوال: تو اپیں کون؟ اگر دم کہوں تو باؤ ہے یو حرکت سب باؤ کا تن میں کہ شناس جز دم جیو کون ہے؟ اور سو کہنا؟

جواب: دم ٹکڑا باؤ کا خدائے تعالیٰ حکمت وستر گی بدل حرکت ساندھیاں کا چلنا۔اس سبب دم یو سرشت چہار عناصر میں ہے تو فہم کر کہ دم پر تو کوئی ہے جان کہ یودم تیرے فرمان میں ہے وقتے یک جا گا کا دم مرتا تو وہاں کا حرکت مند ہوتا۔پس تون جانہارا تو ہے قدیم۔

سوال: توفہم نہیں ہوتا کہ اس دم تھے اورتن تھے خارج نہیں دستا ہوں؟

جواب: اس منزل میں توں دیکھ۔اگر دستِ کسے ببرند وبہبیں کہ در دست دم کجا رفت ہموں طریق اگر دست و پائے و ہمہ اعضا ببرند ودم ہم بر باد رفت ولیکن تو ہم دیدبان بوجھن ہارا قدیم ہے۔یہی طریق بہ فرمان رب العزت روح تن تھے کنارے ہوتا تن تمام خاک درشد۔ولیکن روح نہ میرد کہ روح قدیم است۔فرمان شد کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُم وروح جواب داد کہ قالوا بلیٰ۔

سوال: تو کچھ فہم نہیں دیتا کہ تن میں حرکت کرنے ہارا روح ہے ولیکن کیوں بیان یاں کیا۔غفلت میں نظر پھوٹتا نہیں درحمیں۔

جواب: اے عارف! تیری نظر میں غفلت آتا سو تیرا تسرا تن غفلت کا بھی یو دوزخ ظلمات ہے ہور یو فہم داری ہے چیتیا سوں عارف الوجود یو عرفاں تیرے روح کے مرکب کی ان کوں ہے۔ایسے تین تن غیب کے،سو تیرے خاکی اس تن میں ہیں وہ توں گوہر نور خدائے تعالیٰ ترا درتن ہر چہار صدف اندر نہادہ است۔تا تو فہم کن کہ من کدام؟ ایتال یو فہم کر، اے عارف! اس کلمۃ الحقائق میں آسان کر دیکھلایا ہوں۔برکت مرشد کہ وجود چہار، یکے واجب الوجود یہ دستا ماٹی کا۔ممکن الوجود، دستا وقت میثاق کا۔ممتنع الوجود نہیں آتا دکھلانے میں آشکارا۔اشارات کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔وعارف الوجود۔ہر شئے راشناس کنندہ باصحبت مرکب روح است و دریں ہر سر محیط است۔اما تمام یو معما جز انجن مرشد گمان دور ہوتا ہے۔ایتال کہ علم الیقین بے نہایت و جز عین الیقین تحقیق شود۔تا اے طالب تسلیم باش وفہم نیک کن۔ایتال تیرا تجھے دیکھلانا لگے گا اگر لوڑے خدائے تعالیٰ تو توں ارے فکر کر دیکھ۔یہ نکات قرار رکھ کہ جیتا رمز ہوتا و اشارت وفعل وحرکات وسکنات، تیرے وجود میں جیتے فعل پر اس کا محاسبہ لین ہارا کوئی ہے تو عارف اپیں عقل کبیرا اگر اسی خاطر خوف قرار کر سن۔اس وجود خاکی دیکھین ہارا ہو کہ میں تو اس کا جانہارا گوہر توں خاک نہ ہوئے۔اس جان اپنے کوں مرگ نہیں۔ایسا اس تن میں جان سوتوں سب چیزاں پر دوکھ سوکھ،مرنا وجیونا، فانی یا باقی یا ہوتا وجاتا۔اس کا جانہارا سوتوں۔یہ تن خاکی نہ ہوئے توں۔

سوال: کہ صحی نرالا دستا ہوں میں اس تن تھے؟

جواب: اس کی آنکھیں تن تھے خارج بھی نظر کر دیکھ کچھ دستا یا نہیں؟

سوال: یہ تن الا دھا دستا ولیکن جیتا بکار سوٹوٹے نہیں بلکہ سنتنتر بکارروپ دستا ہے۔یک تل قرار نہیں جیوں کی مرکٹ روپ؟

جواب: اے عارفؑ ظاہر تن کے فعل تھے گزریا و باطن کر تب سب دِستے،اس کا نانوں سو ممکن الوجود۔دوسرا تن سو یہی کہ اس ایندرین کا بکار وچیشٹا کرنہارا سو وہی تن،نہیں تو یو خاک وو سوکھ دوکھ بھوگن ہارا اجیتا بکارروپ وہی دوسرا تن تو توں نظر کر دیکھ یہ تن فہم سوں گزریا تو کن اس کے کیوں رہے۔

سوال: جیوں باؤ آیا و نکل گیا ولیکن جھاڑ کا ڈول تو رہیا۔

جواب: صحیح ولیکن پت جھڑی ہوئی جھاڑ کوں تو باو نا رہی اس سبب تیرے نفس کے فعل کے پات تیری روح کے سات لگے ہیں۔وبارا سو نفس اس سبب جھولے میں پڑیا تو پس وہاں کا بھی دیکھن ہارا ہو۔وہاں کے بکارروپ کا جیتا چیشٹا ہوتا جہاں تھے سوچ دوسرا تن وہ توں اس کا الادا دیکھن ہارا سو اس میں نکو گن ایسا بکارروپ سو روح کا مرکب وجیسا تن یہ ویسا چھا اسی کا عکس۔وہ تن قدیم، میثاق کے وقت کا۔اول وتن بازو یہ تن اسی کا

عکس یو، ایتال کے دیکھنے میں اس کا عکس ویوتن وقتی اور سیری وطیری کنارے ہوتا ہے۔ وروحانی تن وملائکاں وحوراں بھی تن دھرتے ہیں۔ وبت و قولیس بھی تن دھرتے ہیں۔ جسے چڑنا پاک دیوانگی کے یہ جیتا اس تن سوں شہوت، حرص ہوا حس کا مورچا اس کی صحبت سب اسی آزار ہوتا ہے۔ جیوں لوہا صحبت میاں بھوگنا، سونگنا، چاکھنا، دیکھنا یہ فعل سب اس تن کے یہ کیا باز دکن سب رہے بلکہ زیادت دیکھلانے کی ایسے قدرت خدا کی فہم میں آتا و نظر میں نہیں دستا ولیکن دل کی نظر باطن اس آتا ہے تو توں اس کا فہم دار ہو و دوزخ و بہشت کا حساب سب اس سوں تعلق دھرتا ہے۔ کہ توں وتے سب فعل پر قادر ہوا الا دھا توں اس کا شاہد ہو و جواب دہ۔

سوال: صحیح اس کا بھی بکار دیکھنہارا ہوں۔ جیوں اس تھے جدا ہوا تیوں اس حرص کے پیر تھے یہی جدا دستا ہوں تحقیق ان دونھوں مینج میں الا دھا چھ ہوں۔ جیوں سیپی میں کیڑا ہور سیپی میں موتی ہور سیپی کا ہلن کیڑے سوں و کیڑے تھے الپت ہور منزہ موتی۔ تیوں میں ان دونوں تن میں۔

یک اندیشہ کہ اس تھے میں الا دھا اپیں میرا رہن انکھی دستا نیں ان دونھوں تھے خیر از چپ تو مخفی منج میں جا گہ نیں۔ ظلمات کے کوے میں پڑیا اس سبب جا گا دستا نہیں۔ اس کا کھومیت سمجھ ہوئے تیوں۔

جواب: بھی ظلمات اندھارا سو ممتنع الوجود۔ پس اے عارف! وہاں توں کون سو دیکھ؟

سوال: ان دو کا شاہد سو وہاں میں دستا نہیں میرا منج گمان کی میں وہاں نہیں۔

جواب: اے عارف! یوں غفلت میں بھا کر اپیں کی چھپاتا؟ اس غفلت کا خبر توں کہتا ہور توں اپسے دیکھتا۔ دیکھن ہارا دستا سو نھوے۔ جوں کی انکھیاں ہور آرسی کوں تفاوت ہے۔ خوب فہم کرا ے عارف۔

سوال: صحیح میں دیکھتا سوں دستا کیوں ہوے گا۔ ولیکن کی کہ عقل کوں فراموش اپنے حال میں نہ بیداری و نہ خواب دستا جون غائب۔

جواب: اگر تو نہیں تو خبر کہن ہارا کون؟ اس کی کا یہ جے کچ یا دو بسر ہوتا ہے سب جا گا میں وہی عارف الوجود۔ غواص کرنہارا توں اس غفلت کا شاہد ہو۔

سوال: اس غفلت کا بھی میں دیکھن ہارا۔ اپے غفلت میرا گھر۔ اس کا چ ہوں سو۔

جواب: توں عارف و

سوال: عاقل میں منج تے دوسرا منج میں کوئی نہیں دستا ایسا فہم کرنہارا سو میں

جواب: آرے! یہ عرفان تجھ میں انہوں تینوں وجوداں کوں سمجھنہارا سو یو عارف الوجود چوتھا تن، اسی کا نانوں یو عقل بھی تج سیر بار کی رکھے یادِ کھے بسر توں عقل نہ ہوے۔ اس عقل کا بھی شاہد سو توں۔ جوں کی کشتی پر کا دیدبان اچھتا۔ دیدبان کشتی نھوے خوب فہم کر۔

سوال: صحیح۔ عقل پر میں شاہد ہوں۔ چند بار عقل آتا و عقل جاتا میں کوئی گواہ دار تو ہوں صحیح عقل نھوے ولیکن اقرار قرار نہیں آتا؟

جواب: اے عارف! سبب کیا خوب دیکھن ہارا ہو عقل تو توں نہیں ہے کہ توں نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بر سرِ تو عقل بار گیر داوالہی باشد۔

سوال: تو ایسی عقل پر میں گواہ دار سو وہ گواہ جز عرفان تو نہیں و گواہ داری یہی عارف الوجود۔ اس وجود کا عرفان مینج کیا تفاوت ہوے گا۔

جواب: تو تیری عقل کیا قدیمی ہے۔

سوال: قدیمی صحیح؟

جواب: ازشکم مادروقت زادن ترا عقل نہ بوداماتج میں تو گمان نہیں کہ توں ہے یا نہیں۔

سوال: صحیح ولیکن اس کا بھی شاہدتوں ہوں۔

جواب: تو توں شاہدنور تھانہ کی عقل۔

سوال: شاہدگواہ داروا صل شاہد سوچ عقل۔

جواب: صحیح وہ، ہدایت قدیم مستقیم سویوفہم ہےاماعارف الوجودنھوے۔

سوال: توعارف الوجودمیں وشاہدی میں کیا تفاوت سمجاؤ۔

جواب: فہم کن اے سالک! اینجاارادت لوڑے خدا کا فہم ہونے تیوں نہیں تو چرخ ہے اے عزیز۔ایں دونکات فہم کن کہ چہ نشان می دہیم یکے عقل مقیم است و یکے عقل دلالت کرنہاری ہے۔ ہر باب کا یوعقل عقلِ مقیم سوشاہد یوعقل دلالت سوعارف الوجودعقل دلالی کا اپچنا عقل مقیم میں تھے ہے۔مثلہ جون کی انکاری تھے بھڑ کا تو توں سدھ جان، واصل فہم مقیم سوتو عارف الوجود کا عارف سوشاہد سوتوں، تج شاہد وعقل میں تفاوت جیوں کہیو پگلیا اور تھیجا پگلیا سو عارف الوجود تھجیا سوشاہد۔

سوال: صحیح میں شاہد: بیت.... یہ چاروتوٹے بند = منجے ہوا سہج انند۔اس سب پر میں شاہد، نہ گھٹے نہ ٹوٹے یوں منج میں مینچھ اصل۔

جواب: یوشاہدی، یومیں پناہ بولنکار عقل دلات کا کہ عرفان تھے شاہد ہوا جیوں آرسی تھے دیکھتا۔اگر آرسی نہیں تو کیا دیکھتا۔اگر عرفان نہیں تو شاہدی بھی نہیں۔تو میں یوپناعارفی کا باقی ہوا تجھ میں اس تھے تیرا ناوں یک شاہد نہیں تو یو میں پنا جھوٹ بھی نور پنے میں ٹوٹ یوشاہدی عارف الوجود کا گن۔پس یوعارف الوجود جھوٹ تو یوشاہدی بھی نہیں کہ گاؤنچھ(گاؤں ہی)نہیں وہاں سیوں کیا، جوگھر نہیں وہاں انگن کہاں۔ جہاں تو نہیں وہاں میں کہاں۔تو توں نور نبی کا۔

سواال: اصل نور کا حال اصل کے نور بیچ کا یہ شناس کیوں چاکھنا؟

جواب: اصل حال وہ کہ جس وقت تیرا تج میں سماؤ۔

سوال: تو شاہدونور میں تفاوت کیا؟

جواب: شاہد برکار یعنی عرفان سوکار وبے کار نور اصل نور نہ جان نہ انجان، نہ یاد نہ بسر، نہ میں نہ توں۔اصل نور میں نہ میں رہ سی نہ جا سی۔کہ فرمان از دیوان میں پنا نہ رہ سی۔ولے میں کہنکہار نہ جاسی۔

سوال: اصل نور کا حال کہ نور بیچہ یہ شناس کیوں؟

جواب: اصل حال وہ ہے کہ جس وقت تیرا تج میں سماؤ جاگنے کا انتہا ہور نیند کا ابتدا ہر دو کے میاں آں حال اصل نور یعنی دوسرا جنس نہیں۔

سوال: تو میرا رہن کہاں بتاؤ ہور کہاں سماؤ ہور کہاں اپاؤ؟

جواب: تجھے قدرت میں سماؤ ہور قدرت میں اپاؤ۔

(ماخذ: کلمۃ الحقائق، مرتبہ: محمد اکبرالدین صدیقی)

16.3.1 شامل نصاب متن کی تشریح:

جب کچھ نہ تھا تب بھی تو ہی تھا۔ دوسرا کوئی تیرا شریک نہیں۔ اس طرح کے حال میں خدا کو خدا ہی سے سمجھنا۔ (وہی یہ بات سمجھ سکتا ہے۔) یہ گجری زبان ہے۔ اس کتاب کا نام کلمتہ الحقائق ہے۔ (اس کے ذریعے) انشا اللہ تعالیٰ (ان مطالب کا) خلاصہ بیان ہوگا اور (حق کی) تجلی واضح اور روشن ہوگی کہ خدا کی ذات قدیم القدیم کیوں تھی۔ ذات وصفات اور کل مخلوقات، ابتدا و انتہا، باقی وفانی، قدیم وجدید، باہمہ و بے ہمہ (سب کے ساتھ اور سب سے جدا) اس مقصد سے (میں نے) سوال اور جواب واضح کر کے دکھلائے ہیں۔ انشا اللہ تعالیٰ (جاننا چاہیے) کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ (یعنی چھپی ہوئی اور ظاہر باتوں کا جاننے والا) ہے۔ خدائے تعالیٰ کی نظر جملہ مخلوقات کو دیکھنے والی ہے وہاں (اس جگہ بھی) کہ جہاں ہماری نظر نہیں پہنچ سکتی۔ اگر کوئی اس کی ذات قدیم کے ساتھ کسی اور کو بھی قدیم سمجھے تو شرک لاحق ہوگا۔ اس وجہ سے فرمایا کہ قال اللہ تعالیٰ "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَيُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَا اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ"۔ کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ خدا کی ذات کو پہچان سکے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" تَفَكَّرُ وْافِيْ صِفَاتِ اللّٰهِ وَلَا تفَكَّرُ وْافِي ذَاتِ اللّٰهِ۔" لیکن خدا جسے چاہتا ہے اسے اپنی معرفت کا راستہ دکھاتا ہے کہ "يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ" (کے فرمان) سے انسانوں کیا مید بندھائی اور مدد بھی کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "والَّذِيْنَ جَاهَدُ وا فِيْنَا لَنَهْدِ يَنَّهُمْ سُبُلَنَا"۔ اس لیے جہد اور کوشش کرنا چاہیے خدا میں خدا سے، کیوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں عَرَفْتُ رَبِّي بِرَبِّي۔

سوال: (یہ ہے) کہ اللہ تعالیٰ اول سے اول کیوں ہے؟

جواب: قدیم سے بھی قدیم اور اول سے بھی اول آپ خود تھا۔

سوال: کہ کیوں تھا اور کہاں تھا؟

جواب: بے چوں و بے چگونہ تھا اور اس میں چون و چرا نہیں کرنا چاہیے، لیکن بلا شک وشبہ اس کا وجود ہمیشہ رہنے والا تھا۔

سوال: وہ کہاں تھا۔ جگہ (مکان) سے وہ تعلق رکھتا بھی تھا (یا نہیں)؟

جواب: وہ تیرے بھی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے جان لے ان تمام چیزوں کا بنانے والا وہی ہے اور (یہ بھی) جان لے کہ اس جگہ کا اور سب کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ اس سے (اس عالم سے) پہلے کا بھی اول اور (اس عالم کے) آخر کا بھی آخر وہی ہے۔ قدیم اور جدید سب اس کے آگے بے زبان ہیں۔ یہ بات اسی سے ہے کہ وہ جملہ مخلوقات کے اول سے اول ہے اور لا مکان ہے۔ (یعنی وہ مکان یا جگہ سے ماورا ہے) چنانچہ خواجہ روم نے خواجہ شبلی سے پوچھا "قال ما التوحيد؟ قال من أجاب عن التوحيد فَهُوَ مُشْرِكٌ ولم يَعرِفْ ذٰلک فَهُوَ كافرٌ. وسأل عنه فهو جاهلٌ"۔ (پوچھا توحید کیا ہے؟ کہا جس نے اس سوال کا جواب دیا وہ مشرک ہے اور جو اسے نہیں سمجھا وہ کافر اور جو اس کے بارے میں سوال کرے وہ جاہل ہے۔)

سوال: تو یہ کیوں قرار دیں کہ سمجھ (فہم) نہیں ہے اور تحقیق کو کیسے پہنچیں جب ہم کچھ نہیں۔ تو کیوں؟ (یعنی یہ فیصلہ کیوں کریں کہ ہمارے اندر فہم نہیں اور جب ہم کچھ نہیں ہیں تو تحقیق کیسے کریں اور اس کی ضرورت کیا ہے؟)

جواب: اے عارف! تو مخلوق ہے۔ تیرا تعلق اور وجود ایک جگہ سے تعلق رکھتا ہے۔ کیوں کہ تو لاچار اور کمزور بندہ ہے۔ لیکن خدا نہیں چاہتا کہ تو بے قدرت رہے۔ (یاد رکھ کہ) اللہ تعالیٰ خود اپنی ذات سے باقدرت ہے۔

سوال: قدرت کیا؟

جواب: خداپنا (الوہیت) کہ میں خداوند ہوں۔ ’’اني أنا اللهُ ‘‘ (یعنی میں ہی خدا ہوں) کہہ کر اس نے اپنی عظمت بیان کی تو وہ ’’میں ہوں‘‘ سب کے ’’میں ہوں‘‘ پر غالب ہے۔

سوال: قدرت اور خدا میں کیا فرق ہے؟

جواب: قدرت کا تعلق فعل سے ہے کہ وہ اپنے فعل کی شہادت دینے والا ظاہر گواہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے ’’میں پن‘‘ اور اپنے فعل سے پاک تھا اور گنج مخفی میں پنہاں تھا۔ حدیث قدسی ہے کـنـتُ كَـنْزاً مَخْفِياً فأحبَبْت ،اَن أُعْرف. (یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا تو میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں۔)

سوال: پھر اس خزانے کو کس طرح پہچاننا چاہیے۔

جواب: (وہ پہچانے گا) جسے وہ چاہے۔

سوال: تو پھر کوشش (جہد) بھی کیا اپنی نہیں ہے؟

جواب: کوشش (ضرور) اپنی ہے کہ (خدا نے انسانوں کو) فعل (عمل) کا اختیار دیا ہے۔ قدر جان اس کی کہ اسے علم دیا ہے لیکن توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔

سوال: پھر کیا کہیں ذات کی پہچان (معرفت) ہوگی؟

جواب اس سلسلے میں ہمارے نبیؐ نے فرمایا کہ ’’مَـنْ عَـرَفَ نَـفْسَـهُ فَـقَدْ عَرَفَ ربَّهُ‘‘. (یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔)

سوال: تو میں کون ہوں؟

جواب: تو نور ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا۔

سوال: وہ کیسے؟ مجھے بتائیے۔

جواب: تو یہ مان کہ خدا نے پہلے نبیؐ کا نور پیدا کیا۔ پھر اس کے بعد یہ دیکھ کہ اس نے کس طرح اس نور سے تمام عالم اور اشیا کو پیدا کیا۔ نبیؐ کا قول یوں نقل ہوا ہے أنا مِنْ نور الله و کل شيءٍ مِنْ نورِیْ. (یعنی میں اللہ کے نور سے ہوں اور ہر چیز میرے نور سے ہے۔)

سوال: جب کچھ بھی پیدا نہیں کیا تھا۔ آپ ہی آپ تھا۔ تو نبیؐ کے نور کو کیوں ظہور میں لایا؟

جواب: سن کہ اللہ تعالیٰ مخفی گنج (چھپا ہوا خزانہ) تھا۔ وہ میں پن اور اپنے وجود یا اپنی خودی میں (ایسا تھا کہ) نہ چھپا ہوا، نہ ظاہر، نہ کسی شکل میں، نہ غیر شکل میں، نہ جلال نہ جمال، نہ شوق نہ ذوق، نہ یاد نہ بھول، نہ رنج نہ خوشی، لیکن کہتا ہے کہ امـر امنیَّت المقصود (میں نے مقصود کا ارادہ کیا) لہٰذا خدا نے اپنی خودی کے اظہار کا ارادہ کیا۔ جیسے بیج زمین میں غبار سے ملا اور بعد میں انگور پیدا کیے۔ بیج سے کونپل نکلی اور وہ غبار جو قدرت میں چھپی ہوئی تھی، جب بیج سے باہر آئی تو وہ قدرت جو پوشیدہ تھی ظاہر ہوئی کہ اسم اللہ سے خود آگاہ ہوئی۔ یعنی وہ آگاہی جو ذات مطلق کی آگاہی کی

نشان ہے۔تو قدرت جدید لیکن پہلے غبار میں ذات قدیم ہے۔ان عارفوں کے لیے کہتا ہوں کہ وہی قدیم اور جدید ہے۔لہٰذا سمجھ اور اس کے بعد پھر سمجھ اور یہ نہ سمجھ کہ اللہ کا اسم اللہ یعنی ''میں اللہ'' کا اپنے آپ اظہار کیا اور اس کے بعد وہ گنج جو پوشیدہ تھا اپنی خودی پر شاہد ہوا، اس کے بعد دونوں میں عشق روشن ہوا۔

جیسے لکڑی کے اندر آگ جب بھڑک اٹھی تو شعلہ باہر آیا
اس کے بعد عشق کا تقاضہ پورا کرنے کے لیے نبیؐ کا نور پیدا کیا

اے عارف جان لے کہ خدا اور اس کی قدرت میں کچھ فرق نہیں بلکہ اس سے قدرت اور قدرت سے وہ۔اس طرح ایک ہیں جیسے کافور میں پھول میں خوشبو، جیسے شکر میں مٹھاس یا دونے میں مہک کہ دونوں کو نہ تو ایک کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی دو۔کیا جوہر کی چمک جوہر سے الگ ہے۔اس معمے کا خلاصہ مرشد کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ذات حق دوئی کے بغیر ایک ہے۔اس لیے محمدؐ کو اسی کا نور سمجھ کہ اس نے چاہا کہ اپنے آپ کو دیکھوں کیوں کہ تب عشق کا غلبہ اس طرح کرنے کا متقاضی ہوا تو قدرت سے نظر کیا۔غیب کو آئینہ کیا اور لاشکل کا حسن۔اس ''ہوا'' سے وہ ہوا۔ آدھا جہاں نور محمد سے شاد کیا (یعنی بنایا) لہٰذا اس ہوائے صفا کو آئینہ بنایا اور اپنا مشاہدہ خود کیا۔جب اللہ کی ذات شاہد ہے اور دوسری شاہدی بھی آئینہ صفا میں نور محمدؐ کی ہوئی۔یہ امر ارادت کا تھا اس لیے کہا کہ (کن فیکون) اور اے عارف جان کہ اس میں کاف اور نون کو بھی جگہ نہیں۔اس مرتبے میں نور کا اظہار صفا میں ہوا، لیکن کلمہ کن فیکون میں معذور ہے۔لہٰذا ذات کا پرتو ذات کا جو نور ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو اپنی ذات سے فکر کر کے شاہد کیا۔اس بعد اس شاہد نور سے ہر ایک کا نور پیدا کیا جیسے انسان، جن، فرشتے اور تمام اشیا کا نور۔اس طرح وہ نور صفا میں شاہد تھا پھر اس شاہد سے تمام عالم کا شاہد ہوا اور وہ سب چراغ سے چراغ کی طرح روشن ہوئے۔اور اس نور کو روح القدس کہتے ہیں۔اس محمد نور کو ابوالارواح کہتے ہیں۔اس طرح ثابت ہوا کہ أ نـا مِن نور الله وَ کُلُّ شِيءٍ مِن نُوري سبحانهٗ و تعالیٰ۔یعنی میں اللہ کے نور سے ہوں اور ہر چیز میرے نور سے ہے) اس نور کے عشق سے لطف کیا اور چاہا کہ ظہور کروں۔اس کے بعد اس صفا سے ہوا پیدا کیا اور ہوا سے باؤ کیا اور باؤ سے آگ پیدا کی۔آگ سے پانی پیدا کیا اور پانی سے خاک کہ ہوا کے سوا باؤ کو جگہ نہیں اور باؤ کے بغیر آگ کو پرورش نہیں اور گرمی کے بغیر پانی میں اظہار کا جوش نہیں اور پانی کے بغیر زمین کو وجود نہیں۔

سوال: کہ تحقیق کیوں؟

جواب: اس لیے کہ قدرت میں کل موجودات لیکن حکیم نے حکمت دکھلائی۔سمجھا اس نے چاہا کہ خاک سے پتھر، درخت اور پھل لیکن سب خاک ہیں۔اے عارف جان کہ سب ایک میں ہیں (یعنی ایک کے وجود میں دوسرے کا وجود ہے) اس لیے فنا بھی ایک کی ایک میں ہونے والی ہے۔زمین پگھلے تو پانی میں مل جائے۔پانی کا ایندھن آگ میں اور آگ کا ایندھن باؤ میں، باؤ کا ایندھن ہوا میں، ہوا کا ایندھن صفا میں، صفا کا ایندھن قدرت میں اور قدرت کا ایندھن ذات قدیم میں۔اے عارف جان کہ جو چیز جہاں سے آئی ہے وہیں فدا ہونے والی ہے۔دیکھنے میں دو نظر آتے ہیں لیکن آپس سے فدا ہونے میں ایک جیسے پانی اور اولے کو ایک دوسرے سے جدا وجود ہے لیکن پانی تو ایک ہے۔

شعر: تو ایسی قدرت بھر کر یہ چار عناصر پیدا کیے

اس طرح اس نور محمدؐ اور اس لطیف موتی کو خاک کی سیپ میں رکھا۔چار عناصر کو ترکیب دے کر ملایا۔اللہ تعالیٰ نے اپنے سے اور اپنی قدرت

سے۔ان دونوں کی وسعت دنیا کو معلوم ہے کہ ایک سے ایک کہیں دو پن کوئی چیز نہیں۔قدرت اور خدا ایک میں دو تشبیہہ جیسے ایک قلم۔۔۔۔۔۔۔ خدااور قدرت کے ملنے میں وہ کیفیت درپیش ہوئی کہ دونوں کے سوا کوئی نہیں الثالث بالخیر۔

خدا کی ذات عجب قادر اور قیوم ہے کہ قدرت کے شکم سے دنیا کو خارج میں لایا جیسے کہ ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔اس لیے یہ عالم خدا کا بیٹا ہے۔

سوال: تو رب کے کلام کی خبر دے کہ" لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُولَدْ"۔

جواب: اے عارف جہاں ناقص مخلوق کی یہ تشبیہہ درست نہیں وہاں یہ عالم کیسے ہوا؟ کا کام نہیں۔تشبیہہ جیسے کہ سریا گلا۔سورج سے جیسے آگ (گرمی) نکلتی ہے ویسے ہی قدرت سے یہ عالم جاگ اٹھا۔پس اس جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔نہ کوئی اس سے پیدا ہوا اور نہ کسی نے اسے پیدا کیا۔اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے اور تمام تخلیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں تھی۔ لَوْلاکَ لَماخَلَقْتُ الاَ فْلاکَ۔اس لیے اے عارف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نور اس طرح اس خاک میں ظہور دکھلایا۔اس لیے کہ اللہ کا کلام ہے اللهُ نُورالسَّمٰواتِ وَالاَرضِ مَثَلُ نُورِهٖ کَمِشکَاةٍ فِیهَا مصباح (یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔اس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہو،چراغ ایک فانوس میں ہو۔) تا کہ وہ قدیم گوہر خاک سے ظاہر ہو۔پہچاننے کے سوا علم نہیں اور جو نہ پہچانے اسے اندھا کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندے پر دو چیز فرض کیا اپنے آپ کو پہچاننا اور خدا کو پہچاننا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے من عرف نفسه فقد عرف ربه.(جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا۔)

سوال: اپنی پہچان کیسے؟

جواب: اس لیے کہ تو نور قدیم ہے اور ازل سے ہے۔اپنے وجود پر غور کر کہ میں کون ہوں؟

سوال: میں خاک ہوں۔اس لیے کہ خُلِقَ الاِنْسَانُ مِنْ طِیْنٍ.(انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔)

جواب: اللہ کا کلام حق ہے،لیکن فکر کا تقاضہ ہے کہ میں وقت میثاق سے ہوں۔نبی صلی اللہ وعلیہ وسلم کی حدیث ہے خَلَقَ الأَرْوَاحَ مِنْ قبلِ الأَجْسَاد ۔(روحوں کو جسموں سے پہلے پیدا کیا)اسی لیے جان کہ تو پرانا گوہر قدیم ہے۔تیرا ظہور خاک سے ہوا اس لیے رب کا کلام ہے مِنْ طِین (مٹی سے)اور اگر سمجھتا ہے کہ تو نطفہ ہے کیوں کہ خلق الانسان من نطفته.(انسان کو نطفے سے پیدا کیا) تو غور کر کہ آدم علیہ السلام کو بھی پیدا کیا۔اس وقت نطفہ کہاں تھا۔اس لیے رب کا یہ کلام حکمت کے تحت انسان کو یہ دکھلایا لیکن اس کی قدرت کے لیے کوئی چیز مشکل نہیں کہ اس کے اشارے پر ہر چیز ہو جاتی ہے۔لہٰذا قدرت میں دشواری کچھ نہیں۔وہ سب کچھ کر سکتا ہے کیوں کہ وہ قادر ہے۔حضرت مریم کے بطن سے حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔اس جگہ نطفہ کیسا؟اور فرشتے اور حور کہ جن کی حیات میں شک نہیں اس نور قدیم سے ہیں۔اس نور سے جن،انسان اور میثاق قدرت قدرت کے وجود نے نور پر برقع کیا۔تو نور ہوائے صفا سے نمودار ہوا۔لہٰذا فکر کر کہ روح قدیم نے پہلے آدم کے خاکی وجود کا برقع تیار کیا۔اس کے بعد روح کو حکم ہوا کہ وجود میں داخل ہو جا۔لیکن ظلمات کی وجہ سے آدم کی روح کو خوف ہوا۔تب فرمان ہوا کہ ناگواری سے داخل ہو اور ناگواری سے نکل۔تو جب روح داخل ہوئی تو فرشتوں کو حکم ہوا آدم کو سجدہ کرو،خاک کو نہیں۔سجدے کا یہ حکم تھا روح لطیف گوہر قدیم کے لیے جو آدم کے خاکی وجود میں تھا۔

سوال: آپ خود کون ہیں؟اگر دم کہیں تو ہوا ہے۔تن میں یہ تمام حرکت ہوا سے ہے،بتائیے۔دم کے علاوہ جان (روح) کیا ہے،اور

بھی کہئے۔

جواب: دم ہوا کا ٹکڑا ہے۔ خدائے تعالٰی کی حکمت اور عظمت بادل اور حرکت اعضا (جوڑوں کا) چلنا، اسی لیے دم چار عناصر کی فطرت میں ہے۔ تو اس بات کو سمجھ کہ دم پر کوئی حاکم ہے۔ جان کہ یہ دم تیرے فرمان میں ہے۔ اگر ایک ایک جگہ کا دم مرے وہاں کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ پس تو یہ جاننے والا بن گیا کہ تو قدیم ہے۔

16.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ کلمتہ الحقائق کا شمار دکنی اردو کے اولین نثری نمونے کے طور پر ہوتا ہے۔ اس رسالے میں برہان الدین جانمؔ نے تصوف و عرفان کے پیچیدہ اور باریک مسائل کو سوال و جواب کے طرز سے بیان کیا ہے۔

☆ جانمؔ نے اپنی اس تصنیف کی زبان گجری بتائی ہے، لیکن انہوں نے اس میں سنسکرت کے تت سم اور تت بھو الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی زبان کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں تو پورے پورے جملے فارسی میں لکھے گئے ہیں۔

☆ جانمؔ کا تعلق صوفی خانوادے سے تھا۔ ان کے والد کا نام ''میراں جی شمس العشاق'' تھا، جو اعلیٰ پائے کے صوفی بزرگ تھے اور انہوں نے متصوفانہ مسائل پر کافی کام کیا تھا۔

☆ برہان الدین جانمؔ نے اپنے والد کا خاصہ اثر قبول کیا اور ''وصیت الہادی''، ''منفعت الایمان''، ''ارشاد نامہ''، ''ہشت مسائل''، ''سکھ سہیلا''، ''کلمتہ الحقائق'' وغیرہ تصانیف یادگار چھوڑیں۔ ان کے سبھی تصانیف کا موضوع تصوف اور عرفان خدا کے متعلق ہے۔

☆ کلمتہ الحقائق کے سنہ تصنیف کا صحیح علم نہیں ہو سکا ہے۔

☆ جانمؔ کی ایک کتاب ''ارشاد نامہ'' کی تصنیف کا سنہ 990ھ مطابق 1582ء ہے۔ کلمتہ الحقائق میں ارشاد نامہ کے اشعار ہیں۔ لہٰذا یہ 990ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔

☆ کلمتہ الحقائق اپنے عہد کی دوسری تصانیف کے مقابلے میں دو اہم خصوصیات کی وجہ سے منفرد ہے۔ ایک لسانی خصوصیات اور دوسری موضوعی خصوصیات۔

☆ کلمتہ الحقائق کا موضوع تصوف ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بزرگان دین کا بنیادی مقصد بندوں کو اللہ سے قریب کرنا، دین اسلام کا پیرو کار بنانا اور اللہ کی قدرت سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔

☆ کلمتہ الحقائق کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہو جاتی ہے کہ اس میں برہان الدین جانم نے اللہ رب العزت کی احدیت، ابدیت قدرت و اختیار، شکل و صورت سے اس کی ذات کے منزہ ہونے، اس کے عالم الغیب والشہادہ ہونے، اس کی ذات کی معرفت کے طریقے کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔

☆ اس کتاب میں دوسری بحث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت پر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نبیؐ پاک کے نور کو پیدا کیا اور پھر پوری کائنات کی تخلیق اسی نور سے کی۔

☆ کلمتہ الحقائق کی اہمیت وافادیت دورحاضر میں موضوعاتی اعتبار سے نہ صرف مسلم ہے بلکہ مزید بڑھ گئی ہے، لیکن لسانی تبدیلیوں کی وجہ سے عام قاری بلکہ اہل علم بھی اس استفادہ اٹھانے سے قاصر ہیں۔

16.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی	الفاظ:	:	معنی
آپیں	:	آپ ہی	اَجت	:	غالب، فاتح
آرسی	:	آئینہ	اَچھنا	:	ہونا
آسی	:	آئے گا	اچھے	:	ہو
آکار	:	روپ، ہیئت	اچھینگا	:	ہوگا
آگاہ پنا	:	واقفیت	اشکالات	:	دشواریاں
آنہارا	:	آنے والا	الادا/الاھدا	:	علاحدہ
اپجنا	:	پیدا ہونا، ظاہر ہونا	الپت	:	کم
اَپرم پار	:	لامحدود، بے کنارہ	امریت/انبرت	:	امرت، تریاق
اپروپ	:	نایاب	انپڑانا	:	پہنچانا، سمجھانا
ایتال	:	اب	اُتپت	:	آغاز، پیدائش
انپڑنہارا	:	سمجھنے والا، پہنچنے والا	برقا	:	برقعہ
بِسر	:	بھول	اندھلا	:	اندھا
بکار	:	بگڑا ہوا، بدنما	او	:	وہ
بُند/بُندھ	:	بوند، قطرہ	بنب	:	عکس
اُوٹیا	:	اُٹھا	بوجھن ہارا	:	سمجھنے والا
اُور	:	طرف، جانب	اوپج	:	پہلے ہی
بوجھے	:	سمجھے	اے	:	یہ
بادز	:	بعداز	بھوڑنا	:	واپس ہونا، پلٹنا
برتنا	:	کام میں لانا	برتنہارا	:	کام میں لانے والا
بیس	:	شہر کا دروازہ	پچھان	:	پہچان، شناخت
پرتیو	:	پرتو	پرچنا	:	جانچنا
پوچنا	:	پوچھنا	پرچیت	:	جانچ، امتحان

تُرت	فوراً	تسرا	تیسرا
تنا	درخت	توں	تو
تھے/تے	سے	تھچنا	ٹھہرنا
تیوں	اسی طرح	ٹھار/ٹھانوں	جگہ،مقام
جاسی	جائے گا	جاگا	جگہ
جالنا	جلانا	جان پنا	جان پہچان، واقفیت
جدھاں	جدھر	جنایا	علم میں لایا
جولک	جب تک	جوں کہ	جیسا کہ
جیوپنا	جان رکھنا	چکان ہارا	دینے والا
چھایا	سایہ	چیتنا	روح، دانائی
چیتن ہارا	ہوشیار	چیشٹا	کوشش
دوپنا	دوئی	دوجا	دوسرا
دیدبان	دیکھنے والا	دیوا	چراغ
سانڈھنا	گرانا	سترگی	عظمت
شنتر	آزاد، سب سے الگ	سروپ	خوبصورت شکل
سکلیاں	تمام	سنگلات	ساتھ
سیوں	گاؤں کی حد	ککر	کہہ کر، سمجھ کر
کیرے	کے	گاونچ	گاؤں ہی
گن	خاصیت	مینچ	میں ہی
نراکار	بےصورت	نھوے	نہیں ہے
وو	وہ	وھانچ	وہیں
یکچ	ایک ہی	یکس میں ایک	ایک میں ایک
یونچ	یوں ہی، اسی طرح	میت	مطلب

16.6 نمونہ امتحانی سوالات

16.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ کلمتہ الحقائق کا مصنف کون ہے؟

2۔ کلمۃ الحقائق کا موضوع کیا ہے؟

3۔ کلمۃ الحقائق کو محمد اکبرالدین صدیقی کے علاوہ اور کس نے مرتب کیا ہے؟

4۔ ''ارشاد نامہ'' کا سنہ تصنیف کیا ہے؟

5۔ ''آپیں'' کا کیا معنی ہے؟

6۔ مصنف نے کلمۃ الحقائق کی زبان کو کس نام سے موسوم کیا ہے؟

7۔ کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد میں کلمۃ الحقائق کے کتنے نسخے موجود ہیں؟

8۔ کلمۃ الحقائق کے دستیاب نسخوں میں سے سب سے قدیم نسخہ کب کا ہے؟

9۔ ''چکان ہارا'' کا کیا مطلب ہے؟

10۔ ''دکنی نثر کا انتخاب'' کس کی تصنیف ہے؟

16.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ کلمۃ الحقائق کے مصنف کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ مختصراً لکھیے۔

2۔ کلمۃ الحقائق کا تعارف پیش کیجیے۔

3۔ کلمۃ الحقائق کے موضوع پر اظہار خیال کیجیے۔

4۔ ''کلمۃ الحقائق دکنی نثر کا اولین نمونہ ہے۔'' وضاحت کیجیے۔

5۔ کلمۃ الحقائق میں مسائل تصوف کی تشریح کس انداز میں کی گئی ہے؟ بیان کیجیے۔

16.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ کلمۃ الحقائق کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تفصیل سے لکھیے۔

2۔ کلمۃ الحقائق کے اسلوب و بیان پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ کلمۃ الحقائق کے شامل نصاب متن کی تشریح کیجیے۔

16.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	کلمۃ الحقائق	مرتبہ: محمد اکبرالدین صدیقی
2۔	کلمۃ الحقائق	مرتبہ: ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ
3۔	دکنی نثر کا انتخاب	ڈاکٹر سیدہ جعفر
4۔	دکنی ادب کا مطالعہ	سیدہ جعفر / محمد افضل الدین اقبال
5۔	دکنی ادب کی تخلیقی خصوصیات	پروفیسر مجید بیدار

نمونۂ امتحانی پرچہ

نشانات : ۷۰ Marks : 70 وقت: 3 گھنٹے Time:3 hours

ہدایات:

یہ پرچۂ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہیں۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں، جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ پُر کرنا / مختصر جواب والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہیں۔ (10x1 = 10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں آٹھ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال:1

(i) ''چھند چھنداں'' کس کی تصنیف ہے؟

(a) خوب محمد چشتی (b) شیخ احمد گجراتی (c) قاضی محمود بحری (d) میاں مصطفیٰ

(ii) دکنی اردو کا دوسرا نام کیا تھا؟

(a) اردو (b) اردوئے قدیم (c) اردوئے معلیٰ (d) ریختہ

(iii) دکنی زبان کا پہلا قصیدہ گو شاعر کون ہے؟

(a) قلی قطب شاہ (b) نصرتی (c) مشتاق (d) غواصی

(iv) اردو کی پہلی مثنوی کون سی ہے؟

(a) علی نامہ (b) قطب مشتری (c) پھول بن (d) کدم راؤ پدم راؤ

(v) عادل شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

(a) یوسف عادل شاہ (b) ابراہیم عادل شاہ (c) اسمٰعیل عادل شاہ (d) محمد عادل شاہ

(vii) وجدی کرنولی کا پورا نام کیا تھا؟

(a) شاہ قاسم علی (b) حکیم شیخ ہدایت اللہ (c) عارف الدین خاں (d) سراج الدین خاں

(vii) دکنی شاعر 'فیضؔ' کا اصل نام کیا تھا؟

(a) جلال الدین (b) حیدرعلی طباطبائی (c) محمد فیاض الدین (d) میر شمس الدین

(viii) مثنوی ''گلشن عشق'' کا سنہ تصنیف کیا ہے؟

(a) 1600 (b) 1630 (c) 1657 (d) 1660

(ix) کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ میں کتنے قصائد شامل ہیں؟

(a) سات (b) پانچ (c) تین (d) ایک

(x) کلمتہ الحقائق کا مصنف کون ہے؟

(a) ملاوجہی (b) میراں جی خدانما (c) امین الدین اعلیٰ (d) برہان الدین جام

حصہ دوم

2۔ دکنی زبان کی لسانی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ دکنی رباعی کے موضوعات پر مضمون قلم بند کیجیے۔

4۔ غواصی کے ادبی کارنامے بیان کیجیے۔

5۔ سراج اورنگ آبادی پر نوٹ لکھیے۔

6۔ عہد آصفیہ کی صحافتی خدمات بیان کیجیے۔

7۔ مثنوی ''گلشن عشق'' کا خلاصہ بیان کیجیے۔

8۔ ولی کی صوفیانہ شاعری پر اظہار خیال کیجیے۔

9۔ سراج کی شاعری میں پیکر تراشی سے بحث کیجیے۔

حصہ سوم

10۔ اردو زبان کی ترویج میں صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

11۔ بہمنی دور کے علمی اور ادبی کارناموں پر روشنی دالیے۔

12۔ مغل دور میں اردو ادب کا جائزہ لیجیے۔

13۔ قطب شاہی دور میں دکنی نثر کے آغاز وارتقا پر روشنی دالیے۔

14۔ کلمتہ الحقائق کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ بیان کیجیے۔